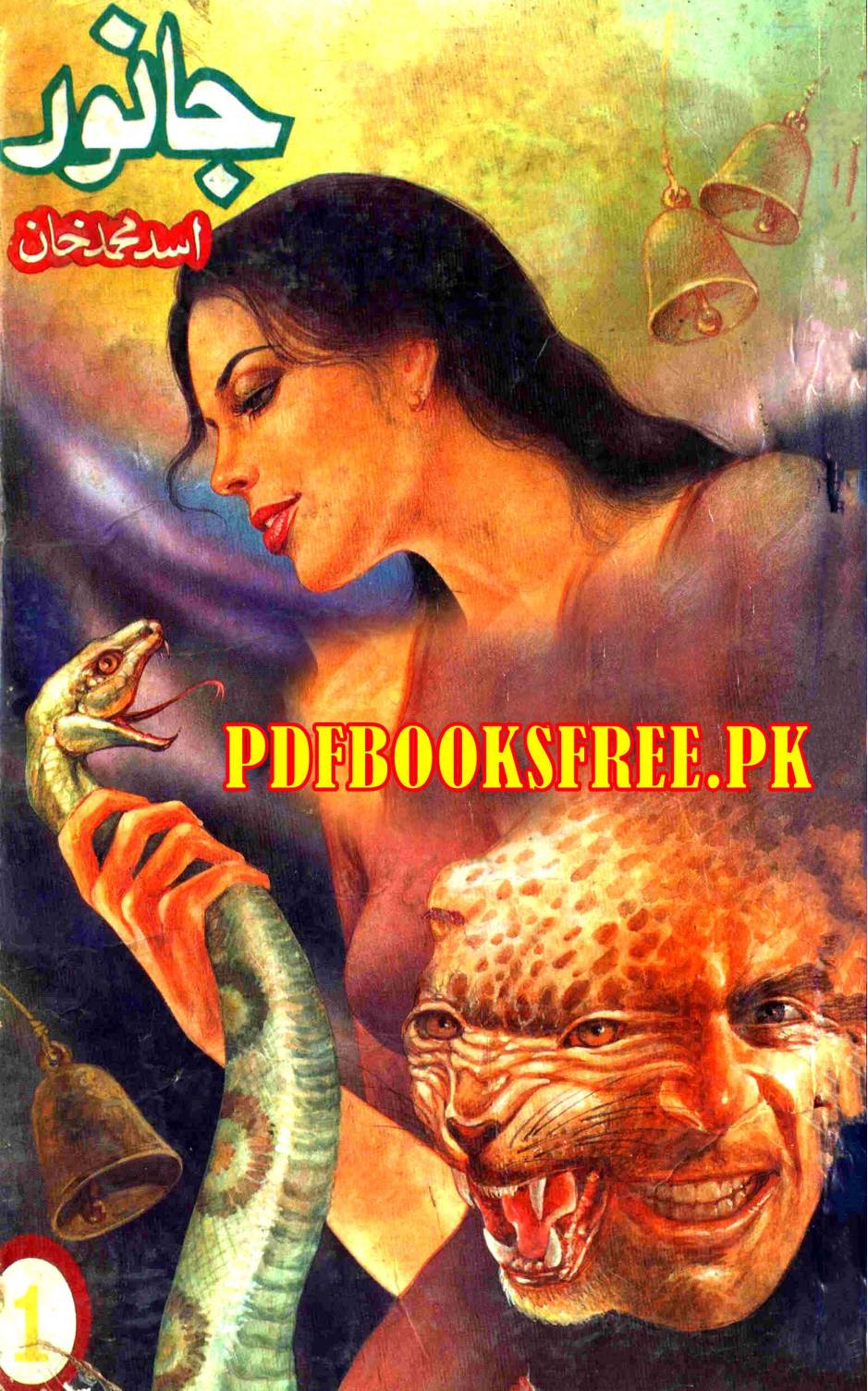


جانور

اسد محمد خان

PDFBOOKSFREE.PK



میرے ساتھ عجیب واقعات ہوئے ہیں، برابر ہو رہے ہیں، اسی لیے میں اپنی روداد سناتا چاہتا ہوں۔ کسی کو سنا لو تو تسلی سی ہو جاتی ہے۔ نہیں تو ابجھن رہتی ہے۔

میرا نام شیر علی ہے۔ ہم لوگ صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں۔ میرے والد صد خان بنگش انگریزوں کے زمانے سے محکمہ جنگلات میں ملازم تھے۔ کچھ دن ان کی تعیناتی ادھر ہمارے آبائی علاقے مالاکنڈ میں بھی رہی مگر وہ ان کی نوجوانی کے دن تھے۔ ملازمت کے شروع میں نئی نئی جگہیں دیکھنے کا شوق ہو گا اس لیے وہ اپنے تبادلے کراتے رہے۔ وہ یو پی، سی پی، بہار، آسام، بنگال سب جگہ رہ چکے تھے۔ پارٹیشن سے چند ماہ پہلے جب شادی ہوئی تو اس وقت ان کی تعیناتی مشرقی بنگال یعنی پاکستان میں تھی۔ پارٹیشن سے ان کی سروس میں کوئی فرق نہ پڑا۔ نئے انتظام کے تحت ترقی ہو گئی اس لیے وہ مشرقی پاکستان ہی میں رہ پڑے۔

والد صاحب کا ہیڈ کوارٹر مشرقی بنگال کے سب سے گھنے جنگلاتی علاقے سندھ بن میں تھا۔ میری پیدائش وہیں کی ہے ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ انگریزی، اردو، پشتو، پنجابی اور بنگا تو خیر آتی ہی تھی۔ لڑکپن ہی سے مجھے بری زبان میں بھی خاصی شدید ہو گئی۔

پڑھائی لکھائی سے جو وقت بچتا وہ میں ریج پوسٹ کے اہل کاروں، مقامی شکاریوں اور مسافروں کے ساتھ گزارتا تھا۔ والد صاحب کے دوستوں، جاننے والوں میں انہی کی طرح کے مہم جو سیلانی لوگ شامل تھے۔ جب بھی موقع ملتا میں والد صاحب کی اجازت سے بڑوں کی محفل میں بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بڑوں میں بیٹھنے سے مجھے جو فائدہ یا نقصان ہو اس کا تو اب اندازہ نہیں، ہاں اتنا ضرور ہوا کہ مجھے جنگلوں اور جنگل والوں کو سمجھنے کا موقع مل گیا۔

کے معلوم تھا کہ یہ معلومات بلکہ علم سناری زندگی میرے کام آتا رہے گا۔

کسے معلوم تھا کہ بھرپور شہری زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ وقت پڑنے پر مجھے جنگلی جانور کی طرح کبھی شہر، کبھی دیوانے میں رہنا ہو گا۔

کسے معلوم تھا کہ جب تک زندہ ہوں یہی سلسلہ رہے گا۔ بچپن، لڑکپن اعتبار کا زمانہ ہوتا ہے۔ آدمی آسانی سے سنی سنائی پر یقین کر لیتا ہے مگر میرے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ میری تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس میں وہم، ڈر اور خوف کی گنجائش نہیں تھی۔ تو ہم پرستی پھر کس بات کی؟ آدھی رات کو بھی اگر کوئی مجھے رینگ پوسٹ کیا ونڈ کے باہر جنگل میں جانے کو کہتا تو میں ایک نارنج اور ایک لکڑی سنبھال کر نکل پڑتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جنگلی جانوروں سے اور کیڑے کاٹنے سے کس طرح بچا جاتا ہے اور میں خوب جانتا تھا کہ بھوت پریت اور دوسری سب بلاؤں کا کوئی وجود نہیں، پھر ڈر کس بات کا؟

بنگلہ تو جادو کے لیے مشہور ہے۔ بہت سے بنگالی دوست والد صاحب کی یہ بات سن کر چپ ہو جاتے۔ کہتے ”جو بھی ہو بنگلش صاحب! ہم نے تو جیسا سنا تھا تمہیں سنا دیا۔ اب یہ ہمت کی بات ہے کہ بنگال میں بیٹھے ہو اور جادو سے انکار کرتے ہو۔“ میں بھی اپنے باپ کی طرح انکار کرتا تھا لیکن آگے چل کر میرے ساتھ جو ہوا اور جب تک زندہ ہوں، ہوتا رہے گا اس کے بعد میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں؟

مگر کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے۔ مجھے پہلے یہ بتانا ہو گا کہ کیا کچھ ہوا اور کس طرح ہوا؟

ستمبر 65ء کی جنگ سے پہلے ہی پاکستان اور انڈیا کے تعلقات میں سخت بگاڑ پیدا ہو گیا تھا جسے عام طور پر مشرقی پاکستان کے سرکاری ملازمین محسوس کر رہے تھے۔ والد صاحب کا دل اس نوکری سے اچاٹ ہونے لگا۔ انہوں نے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی۔ ریٹائرمنٹ کی منظوری آتے آتے اور کارروائی پوری ہوتے ہوئے 69ء کا سال آگیا۔ والد صاحب اور والدہ کو اپنے آبائی علاقے میں پہنچنے، اپنے گاؤں لوٹنے کی خوشی تھی۔ میں بنگال میں پیدا ہوا تھا۔ وہیں آنکھ کھولی تھی۔ اب جو روانگی کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو میں ایک عجیب طرح کی اداسی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کوئی اپنے گھر اور گھر والوں سے بچھڑنے والا ہو۔

سو لہا سہ: برس ن میری عمر تھی مگر بڑا بیٹا تھا والد صاحب نے مجھے دو

ملازموں کے ساتھ اپنے ایسٹ پاکستان کے معاملات سمیٹنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود باقی گھر والوں کو لے کر صوبہ سرحد روانہ ہو گئے۔ سوچا ہو گا کہ یہ بنگال میں اور کچھ رہ لے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ اداسی کم ہو جائے گی۔

سردس کے دوران والد صاحب نے کاسیہ بازار میں ایک چھوٹا سا خوش منظر مکان خرید کر اسے پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس بنا دیا تھا۔ اس علاقے میں ٹورسٹ بہت آتے تھے۔ یہ آمدنی کا اچھا ذریعہ تھا مگر نوکری سے فارغ ہونے اور گزشتہ منتقل کر لینے کے بعد گیسٹ ہاؤس، فرنیچر اور پرانی جیب کو، جو سودا سلف لاد کر لانے لے جانے میں کام آتی تھی پاس رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ تینوں چیزوں کا سودا ایک ہی خریدار سے ہو گیا۔ خریدار سے بیشتر رقم وصول ہو گئی تھی۔ بس کوئی ڈیڑھ لاکھ روپے باقی تھے جن کی ادائیگی تین مہینے میں ہونی تھی۔ میری اور ملازموں کی یہ ذمہ داری تھی کہ بقیہ رقم وصول کر کے گیسٹ ہاؤس کا چارج ہم نئے مالک کو دے دیں اور پی آئی اے کی پہلی فلائٹ پکڑ کر مغربی پاکستان پہنچ جائیں۔

گھر والوں کے جانے کے بعد کچھ دن تو بڑوں کی نگرانی سے آزاد ہو کر میں نے اپنی خود مختاری کے مزے لوٹے۔ چار چھ روز جیب اڑائے اڑائے پھرا۔ خوب سیر پائے کیے پھر والد صاحب کے بتائے ہوئے چھوٹے چھوٹے کاموں کی فہرست یاد آگئی تو اس میں لگ گیا۔

کام اتنے زیادہ نہیں تھے۔ والد صاحب کے دونوں کارندے میر باز اور خدا بخش رائیں میرے ساتھ دن دن بھر گھومتے تھے اور راتوں میں کھانے کے بعد محفل جماتے تھے۔ ہم لوگ چیٹکیں بھر بھر کے چائے بنواتے اور گیسٹ ہاؤس کے بنگالی ملازموں کے ساتھ بیٹھ کر قصے کہانیاں سنتے یا ویسے ہی گپ مارتے۔ میر باز کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی ہو گئی اور خدا بخش رائیں کی چوالیس پینتالیس سال مگر وہ بھی لڑکوں میں لڑکا بن رہا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ ہم سے دگنی گنگی عمر کا آدمی ہے۔ والد صاحب نے خدا بخش کو بدوق کا لائسنس بنوایا تھا اور بارہ بور کی ایک دو تالی شات گن خرید دی تھی جو خدا بخش سے زیادہ میرے قبضے میں رہتی تھی۔ اب جب کہ ہمیں فرصت بھی تھی ہم نے دکان سے اپنے لیے گوشت منگوانا چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے تیسرے دن شکار کو نکل جاتے تھے۔

انہی دنوں کاسیہ بازار میں برمی قبائلیوں کا کوئی میلہ شروع ہو گیا، ہم تینوں کے مزے آگئے۔ دس روز کا میلہ تھا۔ یہ دن ہم نے خوب کھیل تماشوں میں گزارے۔

اب جو وہ جھونپڑی سے باہر آیا تو تین چار ہاتھ لبا لکڑی کا ایک کندا گھینٹا لایا بولا۔ ”بیٹھ جاؤ دونوں۔ میں چائے بنا رہا ہوں پی کر جانا۔“

چائے کیا تھی پانی میں گڑ پتی ڈال کر خوب پکایا گیا تھا اوپر سے تھوڑا نمک ڈال دیا تھا۔ مٹی کے پیالوں میں ہمیں چائے دے کر بوڑھا اندر بچوں کے پاس جا بیٹھا اور شاید چاول کی روٹیاں اس چائے میں بھگو بھگو کر کھانے لگا۔ میں اور میرا باز چائے پی کر بوڑھے سے سلام دعا کر کے واپس آگئے۔

غربت اور بے سروسامانی تو میں نے اپنے آس پاس بہت دیکھی تھی مگر اتنے رکھ رکھاؤ کے ساتھ اسے بسر کرتے ہوئے پہلی بار کسی کو دیکھا تھا۔ میں بہت متاثر ہوا۔

میں دو تین دن بعد بچے ہوئے پھل اور سبزیاں پہنچاتا رہا۔ ایک دو بار میں نے اسے چاول دال نمک بھی دیا۔ بوڑھے سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ وہ لوگ مداری تھے، میلے ٹیلے گھوم کر گزر اوقات کرتے تھے۔

چوتھے پانچویں دن بوڑھا پوچھنے لگا۔ ”تم یہ پھل سبزی روز روز کیوں لاتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”تمہارے بچے کھا لیتے ہیں۔ دوسرے تیسرے دن یہ سبزی پھل ہمارے مہمانوں کے کام کے نہیں رہتے۔ کچھ ہمارے نوکروں کے اور ہمارے کام آ جاتے ہیں، کچھ تمہیں دے دیتے ہیں۔ اس میں کیا حرج ہے؟“

کہنے لگا۔ ”نہیں حرج کوئی نہیں۔ بس مجھے پریشانی دکھ یہ ہے کہ بدلے میں ہم لوگ تمہیں کچھ دے نہیں سکتے۔“

میں اس کی بات پر ہنسنے لگا تو بولا۔ ”کیا کریں، ہم ایسے ہی ہیں۔ بھوک سہہ لی جاتی ہے۔ پر یہ دکھ پریشانی کہ ہم تمہارے کام نہیں آ سکتے، تم سے برابر کچھ نہ کچھ لیے جاتے ہیں۔ دیتے کچھ نہیں۔ یہ دکھ بہت بھاری ہے کیا کریں۔“

میں نے کہا۔ ”تم لوگ یہاں میلے میں کھیل تماشا کرنے آئے تھے، اگر باسی سبزی پھلوں کے بدلے میں یا تاج دال نمک کے بدلے میں ہمیں کبھی کھیل دکھا دیا کرو تو تمہاری بھی تسلی ہو جائے گی۔ ہم بھی خوش ہو لیں گے۔“

بوڑھے نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں کھیل دکھایا کریں گے۔ اچھا کل آ

جانا۔“

اگلے دن مغرب کے بعد ہم لوگ گیٹ ہاؤس کے بنگالی نوکروں کے ساتھ

اگلے آٹھ دس دن تک میلے والے اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ گئے۔ تھوڑی چہل پہل جو باقی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ گیٹ ہاؤس کے آس پاس پھر وہی سناٹا چھا گیا جس کی تلاش میں دولت مند لوگ اپنے اپنے شہروں سے کاکسیر بازار کے ڈاک بنگلوں اور گیٹ ہاؤسوں کا رخ کرتے تھے۔

میر باز کے ساتھ گھومتے ہوئے ایک روز شام کے وقت میں نے دیکھا کہ گیٹ ہاؤس کے پچھواڑے جہاں بری قبائلیوں نے بانس چٹائیاں اور ٹاٹ کے پردے کھینچ کر اپنا عارضی کیمپ سا بنایا تھا ایک جھونپڑی اب بھی کھڑی ہے اور آباد ہے۔ ایک بہت بوڑھا آدمی چولہے کے پاس بیٹھا آگ جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بارہ تیرہ برس کی بھک مری سی ایک لڑکی برتن دھو رہی تھی اور سات آٹھ برس کا ننگ دھڑنگ لڑکا جھونپڑی میں بیٹھاریں ریں کرتا بے دلی سے رو رہا تھا۔

یہ لوگ مزدور، دست کار، دکان دار کچھ بھی نہیں لگتے تھے۔ نہ ہی ان کی جھونپڑی میں کوئی زیادہ سامان نظر آتا تھا۔ شاید گا بجا کے، مانگ تانگ کے گزارہ کرتے ہوں گے۔ ہم دونوں کچھ دیر جھونپڑی کے سامنے کھڑے رہے پھر لوٹ آئے۔

اندھیرا ہو چلا تھا میں نے گیٹ ہاؤس کے مہمانوں، گاہکوں سے بچے ہوئے کچھ پھل، آدھی پوری ذیل روٹیاں، تھوڑی سی مٹھائی کاغذ کے تھیلے میں ڈالی اور مارچ سنبھال کر میر باز کے ساتھ ان بے آسرا لوگوں کے پاس جا پہنچا۔

چولہے پر ہانڈی چڑھا دی گئی تھی۔ جھونپڑی میں دیا جل رہا تھا اور چھوٹے لڑکے نے رونا بند کر دیا تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر بوڑھا چولہے کے پاس سے اٹھا آگے آیا۔ میں نے تھیلا بڑھا دیا اور اس کی اپنی زبان میں کہا۔ ”لو، یہ ہم تمہارے لیے لائے ہیں۔“

مجھ سے اپنی زبان سن کر بوڑھا حیران ہوا، مسکرا کر پوچھنے لگا۔ ”کیا ہے؟“

”مٹھائی، پھل ہیں بچوں کو دے دینا، ذیل روٹی بھی ہے۔“

بوڑھے نے ہاتھ اٹھا کر دعا دی۔ ”خوش رہو، ہمارا اتنا خیال کیا، اچھے رہو مگر کسی سے لے نہیں سکتے کچھ بھی۔ اپنا خود پکاتے کھاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”نہ تم نے مانگا ہے، نہ ہم بھیک دے رہے ہیں۔ ایک طرح سے تم ہمارے پڑوسی ہو۔ چھوٹے بچے کے لیے یہ پھل لے لو۔“

کہنے لگا۔ ”اچھا لاؤ پھل دے دو۔“

میں نے تھیلے سے سب پھل نکال کر اسے دے دیے۔

کر اس نے جلدی سے اور بات چھیڑ دی۔ بولا۔ ”تم سب کل دوپہر بعد آ جانا۔ ہمارا بیچہ آنے والا ہے۔ کل تمہیں، تمہارے آدمیوں کو ریچھ کا تماشا دکھائیں گے مگر رات مت کر دینا، شام سے پہلے آ جانا۔“ میں کہنا چاہتا تھا کہ رہنے دو اس کی کیا ضرورت ہے مگر بوڑھا بڑے شوق سے بلا رہا تھا۔ سوچتا ہو گا ریچھ کا تماشا اچھا ہو گیا تو شاید ہم لوگ پچھلے دن کی بے کیفی بھول جائیں گے۔

میں نے گیٹ ہاؤس والوں سے ریچھ کے تماشے کا کہہ دیا۔ مہمانوں کو دوپہر کا کھانا کھلا کر خود کھا کر سب جمع ہو گئے اور بوڑھے کی جھونپڑی کے پاس آ بیٹھے۔

جھونپڑی کے دروازے سے آج دہرے ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ اندر باہر سناٹا تھا لگتا تھا مداری اور اس کے پوتا پوتی کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ہم شاید جلدی آ گئے تھے لیکن خیر، اپنے شوق میں آئے تھے۔ خاموش بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ ہمیشہ بک بک کرنے والے نوکروں پر ہر طرف پھیلے سناٹے کا اثر ہوا تھا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ پانچ سات منٹ بالکل سناٹا رہا تو خدا بخش رائیں بجا ہی لینے لگا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اسے سونے کی عادت تھی۔ میں سوچ رہا تھا اب یہ اٹھ کر چل دے گا تو دوسرے بھی اس کے پیچھے ہو لیں گے مگر خدا بخش نے بیٹھے بیٹھے ایک بار انگڑائی لی تھی کہ اندر جھونپڑی میں ہلکے بہت ہلکے سے ڈگڈگی کی بجھنے لگی۔ میں سمجھا شاید یہ میرا وہ ہے۔ کان بچتے ہیں مگر رفتہ رفتہ ڈگڈگی کی آواز تیز ہو رہی تھی۔ خدا بخش کی جمایاں اور انگڑائیاں رک گئیں۔

کچھ ہو رہا تھا۔ تماشا شروع ہونے والا تھا۔

منٹ دو منٹ میں ڈگڈگی کی ہلکی آواز رفتہ رفتہ بڑھ کر اتنی گونجنے لگی کہ گیٹ ہاؤس کا پچھواڑا، نیلے درخت سب اس کی آواز سے جیسے جھنجھناٹھے۔ جھونپڑی کا پردہ لرز رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ آواز کی لہروں سے لرزتے لرزتے یہ پھٹ پڑے گا اور تار تار ہو کر بکھر جائے گا۔

اچانک ہی جھونپڑی کا پردہ چابک کے کڑکے کی طرح چٹخا اور باہر آن گرا۔ جھونپڑی کے دروازے جتنا اونچا ایک سر تا سر سیاہ ریچھ اچھل کر باہر آیا اور اپنی چھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر ڈگڈگی کی تال پر جھومنے لگا۔

ہمارے جھونے سے مجھے نے۔ ”ہا آ آ آ“ کی آواز نکالی۔ یہ حیرت اور مرعوبیت کی آواز تھی۔ اتنا شاندار قد آور ریچھ ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا ہو گا۔ خدا بخش رائیں نے بھی نہیں، حالانکہ اس کی عمر جنگلوں میں گزری تھی۔

بوڑھے کی جھونپڑی کے پاس آ بیٹھے۔ الاؤ کی روشنی میں بوڑھے اور اس کی پوتی نے ہمیں بچے جھورے والا، گولے نگٹنے کا اور اسٹیل کے چھلے الجھانے، سلجھانے کا کھیل دکھایا۔ عام سے تماشے تھے مگر میں نے، میرا بازو اور خدا بخش رائیں نے ہر ہر آنکھ پر خوب تالیاں بجا لیں۔ بنگالی بیٹھے جمایاں لیتے رہے ظاہر ہے ان کے لیے بھی نیا کچھ نہیں تھا۔ ہم تو خیر بوڑھے کا دل رکھنے کو تالیاں بجا رہے تھے۔ بنگالیوں نے ہزار بار کے دیکھے ہوئے ان بے رنگ تماشے کا اور بوڑھے کی پرانی دھرائی نفلوں کا سرگوشیوں میں مذاق اڑایا۔ کچھ دیر تماشا دکھا کر بوڑھا تھک کر بیٹھ گیا۔ لڑکی ڈھولک پر بنگلا زبان کے مدار یوں والے گیت سنانے لگی۔ اس کی آواز میں دم ہی نہیں تھا جو ہمارے ساتھیوں کو کچھ پسند آتا۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھے نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ مجھ سے آہستہ سے بری میں کہا۔ ”کسی کو اچھا نہیں لگ رہا۔ بس اب رہنے دو، آپ لوگ جاؤ۔“ ہم آگے گیٹ ہاؤس آتے ہوئے ہمارے نوکروں نے خوب ٹھٹھے لگائے اور اونچی آواز میں بوڑھے پر فقرے کسے۔

دوسرے دن میں پھل، سبزیاں لے کر گیا تو اپنے آدمیوں کی طرف سے میں نے بوڑھے مداری سے معافی مانگی۔ اس سے کہا کہ مہمانوں، مالکوں کے منہ چڑھے نوکر ہیں انہیں بڑے بوڑھوں کی عزت کرنا نہیں آتی۔ مداری ہنسنے لگا۔ بولا۔ ”وہ لڑکے ٹھیک ہیں، بوڑھے ہی کو کچھ نہیں آتا۔“

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔ ”میرا بیٹا، ان بچوں کا باپ بہت اچھا مداری تھا۔ کچھ نہ کچھ نیا بنانے کی فکر میں رہتا تھا۔ کل رات وہ ہوتا تو تمہارے نوکروں کا جی خوش کر دیتا۔“

میں نے پوچھا۔ ”بیٹا تمہارا کہاں ہے؟“

بولا۔ ”مر گیا۔“

میں نے افسوس میں سر ہلایا تو دھیرے سے ہنسا۔ کہنے لگا۔ ”تم اچھے ماں باپ کے بیٹے ہو۔ مٹی میں ملے آدمیوں سے پیار کرتے ہو۔“

میں کیا کہتا، آہستہ سے بولا۔ ”ہاں ہمارے والد اور والدہ بہت اچھے ہیں۔“

بوڑھا اب آواز سے ہنسنے لگا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔ انگلیوں سے آنکھیں صاف کر کے بولا۔ ”میرا لڑکا بھی ایسا ہی بولتا تھا۔ کہتا تھا میرا باپ اچھا ہے۔ ماں کو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے مہینے کا چھوڑ کر مر گئی تھی۔“

وہ اپنی زندگی، اپنے غموں کے بارے میں زیادہ ہی بول گیا تھا تو شاید شرمندہ ہو

تھا، چکر پورا کر چکا تو لڑکی کو آواز کا اشارہ دے کر وہ خود بیٹھ گیا۔ لڑکی ریچھ کی پیٹھ سے پیٹھ ملا کر بیٹھی اس کے بیٹھتے ہی لڑکا دوڑتا ہوا آیا، آہستہ سے اپنی بہن کے گھٹنوں پر پیر رکھتا، اس کے شانوں پر سے نچے چھوٹا کہ جیسے میڑھیوں پر چڑھ رہا ہو، وہ ریچھ کے کندھوں پر جا کھڑا ہوا۔ دونوں پیر ریچھ پر جمائے، ہاتھوں سے اس کے سر کے بال تھامے وہ جا کھڑا تھا۔ ریچھ اٹھا اور اپنی کچھلی ناگوں پر تقریباً اچھلتے ہوئے اس نے ایک، پھر دوسرا، پھر تیسرا چکر لگایا۔ زمین سے اتنی اونچائی پر چھوٹا لڑکا اچھلتے ہوئے ریچھ پر پیر جمائے کھڑا رہا۔ ذرا بھی جو وہ ڈرا ہوا یا جھجکا ہو۔

لڑکا، لڑکی، ریچھ تینوں ایسے کرتب دکھا رہے تھے جو کہیں کسی نے نہ دکھائے ہوں گے۔ کبھی کسی نے نہ دیکھے ہوں گے۔

بہت دیر تک وہ تینوں کھیل دکھاتے بلکہ آپس میں کھیلتے رہے، کیا کوئی آدمی نٹ کا تماشا دکھاتا جو وہ ریچھ ان دونوں کے ساتھ مل کر دکھا رہا تھا۔ وقت گزرتا معلوم نہ ہوا بوڑھا مداری آخر تک آیا ہی نہیں۔ دونوں بہن بھائی اور ریچھ نے یہ حیرت ناک تماشا پورا کیا، ایک منٹ کے لیے بھی مداری کی کمی محسوس نہ ہوئی۔

جینا کہ دستور ہے ہر تماشا دیکھنے والے نے خوش ہو کر کچھ نہ کچھ دیا، مگر یہ سکے، نوٹ لینے کے لیے کھیل دکھانے والے رکے نہیں۔ تماشا ختم کرتے ہی مداری کی پوتی، پوتا اور ریچھ جھوپڑی میں چلے گئے۔ اندر جاتے ہوئے لڑکی نے زمین پر پڑا ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر پھر سے ٹانگ دیا تھا۔

ہم نے چولہے کے پاس پڑے مسالا پیسے والے پتھر پر سب سکے اور نوٹ رکھ دیے اور مست مگن جیسے خواب کے عالم میں چلتے ہوئے واپس گیسٹ ہاؤس آگئے۔

رات بہت دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ مداری کے پاس جب ایسا سدھایا ہوا ریچھ تھا اور بچے اتنے باہر تھے تو اس نے پہلے دن گولوں چھلوں والا اتنا مہسپا کھیل کیوں دکھایا؟ ریچھ نہیں آیا تھا تو ایک دن رک جاتا۔

جیسے تیسے کام نمٹا کر میں سویرے ہی مداری کی جھوپڑی پر پہنچ گیا۔ وہ دھوپ میں گدڑی بچائے، چادر اوڑھے پڑا تھا۔ میری آواز پر اس نے چادر سے منہ باہر نکالا تو لگا جیسے وہ بیمار ہے۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ میں نے کہا، ”کل تم کہاں تھے؟ واہ واہ ایسا بڑھیا کھیل دکھایا ہے تمہارے ریچھ نے اور لڑکا لڑکی نے ہمیں ذرا بھی اگر معلوم ہوتا ہم تو اس پاس کے ڈاک بنگلوں، ریسٹ ہاؤس کے نوکروں بلکہ مہمانوں تک کو خبر کر دیتے۔“

ریچھ کی رسی اور ڈگڈگی لڑکی کے ہاتھ میں تھیں۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈگڈگی کی تیز تال پر ناچتا ہوا سات آٹھ برس کا اس کا بھائی جھوپڑی سے باہر آ رہا تھا۔ دیو کی طرح دو ناگوں پر جھومتا ہوا ایک ریچھ تھا اور وہ دونوں پوتا پوتی تھے اور بس ان کے ساتھ ان کا دادا مداری نہیں تھا۔

ہم میں سے ہر ایک نے گردن بڑھا کر، بعض نے جگہ بدل کر جھوپڑی میں جھانک کر دیکھا۔ ٹاٹ، گدڑیوں، ایک ڈھولک، مٹی اور المونیم کے چھ آٹھ برتنوں اور مٹ میلے رنگ کی ٹین کی پیٹی کے سوا جھوپڑی خالی تھی۔

میں نے حیرت سے اپنے ساتھیوں کو اور انہوں نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ اتنے بڑے ریچھ کو یہ بارہ تیرہ برس کی لڑکی نچا رہی تھی۔ تو کیا یہ دو بچو نگڑے تماشا دکھائیں گے؟

لڑکی نے جنونیوں کی طرح ڈگڈگی بجاتے ہوئے مختصر سی اس بھیڑ کے گھرے میں چکر لگایا پھر وہ بیچوں بیچ کھلے میں سر اٹھا کر کھڑی ہو گئی اور ریچھ کی رسی سر پر سے گزارتے ہوئے اپنے سے جو گئے بلکہ چھ گئے ذیل ڈول کے اس جانور کو چکر کھلانے لگی۔ اس کی ڈگڈگی جیسے ہوئے تال پر بچے جارہی تھی۔ سورتی شکل کی اس دلی پتلی لڑکی میں اس وقت کچھ ایسی خود اعتمادی، ایسا بیچ دکھائی دے رہا تھا کہ ہم جو ریچھ کا ذیل ڈول، اس کا وحشی انداز دیکھ کر ہی مرعوب ہو گئے تھے اب اس عجوبہ لڑکی کو ننگے جارہے تھے۔

جس طرح اچانک پردہ باہر پھینکتا ہوا ریچھ کھلے میں آیا تھا اسی طرح ایک دم اس کا کھیل شروع ہو گیا۔ ریچھ ناچ نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا کوئی ماہر بازی گر اپنا کرتب دکھا رہا ہے۔

لڑکی نے ڈگڈگی کی تال بدلی اور آہستہ سے کچھ کہا جو نہ بری میں تھا نہ بگلا میں۔ نہ ریچھ سے کہا گیا تھا نہ چھوٹے لڑکے سے، مگر جو دونوں کے لیے کوئی اشارہ تھا۔ لڑکا قلم بازیاں لگا کر ریچھ کے سامنے آیا اور ریچھ نے اسے نرمی کے ساتھ مگر پھرتی سے اچھال دیا اور اپنا دیو کا پنجہ بڑھا کر کپڑے کی گڑیا کی طرح اسے ہتھیلی پر لے لیا اور پھر ایک ہتھیلی سے دوسری پر وہ اسے اچھالتا سنبھالتا رہا۔ مجال تھی جو دیکھنے والے پلک بھی جھپکا سکتے۔ ایک آدھ منٹ اس زندہ گیند سے کھیلنے کے بعد ریچھ نے ایک بار گونج دار آواز نکالی اور لڑکی نے تال بدل دی۔ ریچھ نے نرمی سے لڑکے کو اپنے سامنے اتار دیا تھا۔ ریچھ اب تال کے ساتھ ساتھ قدم رکھتا پھر کی طرح گھومتا ہوا چکر لگا رہا

پر پردہ نہیں پڑا تھا۔ مداری کے پوتا پوتی اندر بیٹھے نظر آرہے تھے۔ ریچھ اندر باہر کہیں نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”ریچھ کہاں ہے؟“

مداری نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں سمجھا اس نے سنا نہیں۔ اپنا سوال دہرایا تو وہ بولا۔ ”یہیں ہے ادھر ہی۔“

”یہاں ادھر۔“ سے اس کا کیا مطلب تھا؟ میں نہیں سمجھا۔ خیر میں نے سوچا یہ نہیں بتانا چاہتا۔ نہ سہی۔ کچھ دیر بیٹھ کر میں چلا آیا۔

دن میں چٹا گنگ سے ٹور سنٹوں کی ایک بڑی پارٹی ہمارے گیٹ ہاؤس میں آکر اتری۔ ”ہمارا“ گیٹ ہاؤس میں نے غلط کہا۔ اب تو وہ امانت تھا۔

شام کو نیا مالک بھی اپنے رشتے داروں کے ساتھ آیا۔ وہ لوگ دو گاڑیوں میں آئے تھے۔ دو تین گھنٹے رہے۔ سب طرف گھومتے پھرے۔ ہم نے ان کی اچھی خاطر مدارت کی۔ نئے مالک نے پچاس ہزار کی رقم اور میرے والد صاحب کے بینک اکاؤنٹ میں ڈال دی تھی۔ وہ بینک رسید کی فوٹو کاپی میرے حوالے کرنے آیا تھا۔

اچھا آدمی تھا۔ اس نے ہنسی مذاق کے دو ایک فقرے بھی کہے۔ کہنے لگا۔ ”اب گیٹ ہاؤس کے تالے کی چابی میرے ہاتھ آنے میں صرف ایک لاکھ ٹاکا کی دوری رہ گئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”انکل! گیٹ ہاؤس آپ کا ہے۔ میں اور یہ نوکر آپ کی امانت کی نگرانی کے لیے بیٹھے ہیں۔ آپ آئیے۔ مالک کی سیٹ پر بیٹھیے۔ آپ کی چیز ہے۔“

نیا مالک ہنسنے لگا بولا۔ ”مذاق کر رہا ہوں بیٹا تمہارے باپ جنگلش صاحب ہمارے مہربان ہیں۔ تم اچھے لڑکے ہو۔ کیری آن۔ بہت اچھی طرح چلا رہے ہو گیٹ ہاؤس۔ میں بھی آؤں گا لیکن پہلے یہ سب تم سے سیکھنا پڑے گا۔“

ہمارا اٹاف رات میں دیر تک مصروف رہا تھا مجھے بھی جاگنا پڑا تھا۔ تھک کر سو رہا۔ رات میں کسی وقت آنکھ کھلی۔ کہیں کوئی غیر معمولی بات ہوئی تھی۔

پہلے تو کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا ہے پھر غور کیا تو لگا کہ شاید کہیں لڑائی ہو رہی ہے۔ گیٹ ہاؤس کے کچھوڑے سے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میر باز‘ برآمدے میں سو رہا تھا وہ مجھ سے پہلے جاگ گیا تھا۔ اس نے مجھے آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔ ”شیر خانا شیر بھائی! شو خانا! شو! ادھر کوئی گڑبڑ ہے۔“

میں نے بستر سے اٹھ کر تیزی سے شال لپیٹی اور جوتے پہن کر باہر بھاگا پھر رکا

وہ بولا۔ ”خبر؟ کس بات کی خبر؟“

”یہی کہ آج او دنیا کا سب سے اچھا تماشا ہو رہا ہے۔“

مداری دھیرے سے مسکرایا۔ ”اچھا؟ تمہیں پسند آیا کھیل؟“

”پسند کیا مطلب۔“ میں نے جوش سے کہا۔ ”میرے آدمی تو پاگل ہو گئے اور

میں نے.....؟ میں نے ایسا تماشا کبھی آج تک نہیں دیکھا۔“

وہ دھیرے سے بولا۔ ”چلو اچھا ہو پسند آگیا۔“

”واہ واہ..... کیا سکھایا ہے تم نے ریچھ کو اور بچے کو لگتا تھا یہ وہ بچے ہی نہیں

ہیں۔“

بوڑھے نے دونوں ہاتھ اٹھا کر تعریف قبول کی پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا بولا۔

”ہاں۔ یہ لو۔“ اور صدری کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے نوٹ اور ریزگاری نکالی اور میری طرف بڑھادی۔

”یہ کیا؟“

”یہ تم لوگ ادھر چھوڑ گئے تھے۔“

”واہ! یہ تو ہم سب نے خوش ہو کر دیے ہیں۔ کھیل دکھانے والوں کو دیے ہیں

واپس کیوں کرتے ہو؟“

مداری نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں ہم نہیں لے سکتے۔“

”کیوں نہیں لے سکتے۔“

”بس بتا جو رہے ہیں نہیں لے سکتے۔“ اس نے سامنے زمین پر سب نوٹ اور

ریزگاری رکھ دی۔

میں وہ ریزگاری کیسے لے لیتا۔ ہم تو دے چکے تھے۔ واپس کیوں لیتے، پھر کس

کو کتنا واپس کرتے۔ اب تو یاد بھی نہیں ہو گا کہ کس نے کیا دیا ہے۔ میں نے ایک دوبار

اصرار کیا پھر کہا۔ ”اچھا ریچھ یہ خرچ کر دینا یہ پیسے اس کے لیے شہد لے لینا۔“

بوڑھا حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”ایک ہی بات ہے۔ ریچھ کو بھی نہیں دے

سکتے۔“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”یہ تم کسی کو خیرات کر دینا۔“

”خیرات؟“

”چلو ہماری طرف سے دے دینا۔“

میں نے پیسے اٹھا کر الگ جیب میں ڈال لیے۔ اس وقت جھونپڑی کے دروازے

بہت آواز ہوئی تھی مگر سب چہرے چھت سے باہر نکل گئے تھے۔ کسی کے لگے نہیں تھے۔ پستول والے نے ہتھیار سمیت ہاتھ اٹھا دیے۔ لڑکی پر جھکا ہوا آدمی جو بھی کر رہا تھا اسے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی بھر چیختی لگی تھی۔

میں نے دیکھا دونوں آدمی مقامی تھے۔ دیے کی کمزور روشنی میں بھی دونوں کو پہچان گیا۔ پستول والا نوجوان گیٹ ہاؤس کے نئے مالک کے ساتھ دن میں آیا تھا۔ وہ اس کا رشتے دار تھا۔ نئے مالک نے اپنا بھتیجا کہہ کر اس کا تعارف کرایا تھا اور بتایا تھا کہ وہ مقامی سیاسی جماعت کا چھوٹا موٹا عہدے دار یا کچھ ہے۔ دوسرا جو لڑکی کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا اس کا ذرا نیور تھا۔

میں نے بھتیجے سے ڈیٹ کر پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“
بھتیجا بھی مجھے پہچان گیا تھا۔ ڈھٹائی سے بولا۔ ”کچھ نہیں تمہیں کیا؟ یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔“

ادھر جمو نیڑی کے دروازے پر میرا باز پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس کی آواز سنی۔
”شیر علی خان! میں آگیا ہوں۔ پرواہ نہیں۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر بھتیجے سے پستول لینا چاہا۔ اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور بنگا میں گالی دی۔ بندوق کی نال سے میں نے اس کے پیٹ پر کچو کا دیا اور طیش میں کہا۔
”ہتھیار دے دے نہیں تو پیٹ پھاڑ دوں گا۔“ بھتیجے نے پستول میرے حوالے کر دیا۔

عقب سے بہت پریشانی میں میز باز کی آواز آئی۔ ”ارے باپ رے“ مڑ کر دیکھا تو میز باز جو واقعی دلیر لڑکا تھا، گھبراہٹ میں الٹے پیروں جمو نیڑی میں اندر آچکا تھا۔ اگر باہر جانے کا راستہ کھلا ہوتا تو میرا باز اتنی دہشت میں تھا کہ جمو نیڑی سے باہر نکل جاتا مگر سامنے کالے گھنگور بادل کی طرح امداد ہوا ایک سایہ چلا آ رہا تھا۔

خدا کی پناہ! یہ کیا ہے؟ کوئی بلا؟ شیطان؟ مگر نہیں۔ جمو نیڑی کے دروازے میں اپنے سینے سے کھٹی کھٹی سی گونج دار آوازیں نکالتا ہوا اندری کار بیچھ کھڑا تھا۔

لڑکی نے پہلی بار حلق سے خوشی کی آواز نکالی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ریچھ جس کا سر جمو نیڑی کی چھت کو چھو رہا تھا اپنے بھاری بھر کم پنچ پھیلا کر میرا باز کی طرف بڑھا۔ میں نے بندوق سیدھی کر لی۔ لڑکی نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ناں! ناناں۔“ اور ریچھ میرا باز کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔

اس کے آگے میں کھڑا تھا۔ ریچھ نے اپنی چھوٹی چھوٹی روشن آنکھوں سے

واپس کمرے میں آیا۔ خدا معلوم کیا ہو رہا ہے۔ خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں۔ میں نے کونے میں ٹکی شات گن اٹھائی۔ کارتوسوں کی بیٹی کندھے پر ڈالی اور میرا باز کو آنے کا کہتا ہوا گیٹ ہاؤس کے پچھواڑے کی طرف چلا۔ جس طرف مداری کی جمو نیڑی تھی۔ رونے چیختے کی آوازیں ادھر ہی سے آرہی تھیں۔ مداری کا پوتا اور پوتی شور کر رہے تھے۔ قریب پہنچا تو سنا لڑکی بری زبان میں بچاؤ بچاؤ چلا رہی تھی۔ جمو نیڑی تک پہنچنے میں مجھے مشکل ہو رہی تھی۔ اتنا اندھیرا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ غلطی ہو گئی۔ مجھے مارچ لے کر آنا چاہیے تھا۔ حیرت ہے ہم لوگوں نے گیٹ ہاؤس کے پچھواڑے ایک ٹیوب لائٹ لگوا دی تھی جس سے دور تک علاقہ روشن ہو جاتا تھا۔ وہ لائٹ یا تو اس وقت بند تھی یا خراب ہو گئی تھی۔

جمو نیڑی کے دیے کی کمزور روشنی میں سب سے پہلے مجھے لڑکے کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ جمو نیڑی کے کونے میں کھڑا ہاتھ پھینک پھینک کر روئے جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو لمبے، ترنگے سائے کسی کو دبوچ کر اٹھاتے ہوئے جمو نیڑی سے نکلے اور گمروندے کی جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ جسے وہ اٹھا کر لے جا رہے تھے اسے رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ وہ خود کو آزاد کرنے کی کوشش میں مچلے جا رہا تھا۔ اس کے حلق سے کھٹی کھٹی سی آواز نکل رہی تھی۔ شاید انہوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس رکھا تھا۔

جمو نیڑی سے اب لڑکی کے چیختے کی آواز آئی، وہ بری زبان میں پکار رہی تھی۔
”بچاؤ میرے دادا کو لے گئے۔ بچاؤ۔“ اور لڑکی کی آواز یک دم بند ہو گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے اس کا گلا دبا دیا ہو۔

جمو نیڑی میں گھسنے سے پہلے میں نے بندوق کی دونوں نالوں میں کارتوس ڈال لیے اور سیفٹی اتار دی۔ ”خبردار! کانفرہ مارتا ہوا میں جمو نیڑی میں داخل ہو گیا۔
اندرا ایک آدمی تو لڑکی پر جھکا ہوا تھا، دوسرا اس کے برابر ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔

پستول والے نے میری لاکر کے جواب میں ہتھیار سیدھا کیا۔ میری تو اب تک کی عمر ہی جنگلوں میں اور ہتھیاروں سے کھیلنے گزری تھی۔ اسے موقع نہ دیا۔ میں نے بنگا میں کہا۔ ”ہتھیار پھینک دو!“ اور ڈرانے کو ایک نال میں بھرا چھرا کارتوس جمو نیڑی کی چھت کی طرف چلا دیا۔

اتنے قریب سے شات گن کا فائر کسی کو بھی خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

بہت تیزی دکھائی تھی۔

میں نے پردے کے پاس جا کر آواز دی۔ ”سنو! ادھر آؤ۔“ ایک ہی آواز پر لڑکی نکل آئی اور دروازہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ابھی تک پریشان تھی اس کے کپڑے بے ترتیب اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے کہا۔ ”گھبراؤ مت۔ ابھی تمہارے دادا کو لاتے ہیں۔“

لڑکی ہلکاتے ہوئے بولی۔ ”ایں۔“ وہ اسی طرح دروازے کے سامنے پردہ تھامے کھڑی تھی۔ میں نے پھر تسلی دی اور کہا کہ میں اس کے دادا کو لے کر آ رہا ہوں وہ پریشان نہ ہو۔“

لڑکی نے انکار میں سر ہلایا۔ ”مت جاؤ۔“ پھر رک کر بولی۔ ”دادا اندر ہے۔“ اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ ”اندر؟ مگر میں نے تو دیکھا تھا بد معاش اسے گروندوں کی جھاڑیوں کی طرف لے گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا پوچھتا جھونپڑی کے اندر سے بوڑھے کے کھانسنے کی آواز آئی۔ اس نے کمزور آواز میں مجھے پکارا تھا۔ ”باوا!“

میں لڑکی کو ہٹاتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ اندر بوڑھا مداری موجود تھا۔ ریچھ نہیں تھا۔

”وہ تو تمہیں جھاڑیوں میں ڈال آئے تھے؟“ حیرت سے زیادہ میں نے یہ سوال غصے میں کیا تھا۔

وہ بولا۔ ”ہاں۔“

”یہاں کس پل میں آگئے تم؟ ہم نے تمہیں ادھر آتے نہیں دیکھا اور ریچھ کہاں ہے؟“

بوڑھا چادر لپیٹے ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر لیٹا دھاریوں والے چیتھڑے سے اپنا ہاتھ خوب رگڑ رگڑ کر صاف کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے دائیں ہاتھ پر خون لگا تھا مگر وہ زخمی نہیں تھا۔ دھاریوں والے اس چیتھڑے کو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے یہ کپڑا ریچھ کے منہ میں ٹھنسا دیکھا تھا۔ کپڑا تو تھار ریچھ نہیں تھا۔ اس کی بجائے کہیں سے بوڑھا مداری آگیا تھا۔

اور بوڑھا بہت نڈھال بہت تھکا ہوا تھا۔ میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے پھر پوچھا۔ ”تم جھونپڑی میں کیسے؟ کس وقت آئے؟ ہم تو سامنے

مجھے دیکھا سر ہلایا۔ یوں لگا جیسے وہ انکار میں سر ہلارہا ہو پھر اس نے میری طرف سے توجہ ہٹائی۔ اب وہ حملہ آوروں کی طرف پنچے کھولے بڑھ رہا تھا۔

لڑکی نے جیسے ریچھ کو بڑھا دیا۔ ”ہا ہا ہا۔“ ریچھ جس نے اپنے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونس رکھا تھا، گونجتا ہوا بد معاش بھتیجے اور اس کے ڈرائیور کی طرف چلا۔ وہ دونوں ریچھ کو دیکھے جارہے تھے۔ میں یا میری بدوق اب ان کے لیے موجود نہ تھی۔ اچانک ڈرائیور نے اپنی کمر میں ہاتھ ڈالا پستول نکال لیا۔ لڑکی نے پریشانی میں چیخ ماری۔ ”ناں، نائن،“ وہ ریچھ ٹھہر گیا۔ ڈرائیور نے پستول فائر کے لیے تیار کیا ہی تھا کہ میں نے کڑک کر کہا۔ ”ٹھہر جا! ورنہ گولی مار دوں گا۔“ اور میں نے ڈرائیور پر بدوق سیدھی کر لی۔ فائر کے لیے گھوڑا چڑھالیا اگر وہ ریچھ پر فائر کرے گا تو میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے گولی مار دوں گا۔ شٹ گن کی اس دوسری نال میں گولی کا کارتوس بھرا تھا۔ گھوڑا چڑھانے کی کڑک، ڈرائیور نے بھی سن لی ہو گی۔ ڈر گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ جھکتے ہوئے اپنا پستول زمین پر رکھ دیا۔

مگر وہ اٹھ بھی نہ پایا تھا کہ ریچھ نے اپنا صندوق جیسا بازو گھما کر اس پر پنجا چلا دیا۔

میرا خیال ہے پنجا چھلاتا ہوا لگا ہو گا پھر بھی دیے کی کمزور روشنی میں، میں نے دیکھا کہ کھلے پنچے کے وار نے ڈرائیور کے شانے اور بازو کو کھول کے رکھ دیا تھا۔ سمجھو پکا تربوز ٹوٹ گیا تھا۔ دو تین کلبازوں سے بہ یک وقت وار کیا گیا ہے۔ ڈرائیور لڑھکتا ہوا جھونپڑی کے باہر جاگرا تھا۔

چیخ مار کر بھتیجا بھی بھاگا۔ جھونپڑی کے باہر کھڑے محیم شمیم بد معاش نے زخمی ڈرائیور کو اٹھالیا اور وہ بھتیجے کے پیچھے ایک طرف اندھیرے میں دوڑتے ہوئے چلے گئے۔ میر باز اور میں بد معاشوں کا پیچھا کرتے جھونپڑی سے باہر نکلے آئے۔ بس ایک خدا بخش رائیں نیند کا پکا تھا، وہ ابھی تک سو رہا ہو گا۔

میں جھونپڑی کی طرف مڑا، ریچھ نے خیر سے حملہ آوروں کو تو دوڑا دیا تھا، ہمیں بوڑھے مداری کی خیر خبر لینی تھی جسے بھتیجے کے کارندے جھاڑیوں میں باندھ کر پھینک آئے تھے۔

جتنی دیر میں ہم بھاگتے ہوئے بد معاشوں کی طرف سے نظریں ہٹا کر مداری کی جھونپڑی پر توجہ کرتے اتنی دیر میں وہاں ٹاٹ کا پردہ لگا دیا گیا تھا۔ حیرت ہوئی لڑکی نے

میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔ ”اب نہیں آئے گا۔ تمہارے رچھہ نے کافی زخمی کر دیا ہے۔“ مگر یہ رچھہ کیا ہے؟ میں نے سر جھٹک دیا۔ ذرا سختی سے مداری سے پوچھا۔ ”ہاں! یہ بتاؤ یہ رچھہ کا کیا ہے؟“

”رچھہ کا۔“ بوڑھے نے سر اٹھایا میری صورت دیکھی مگر وہ مجھ سے آنکھ نہیں ملارہا تھا۔

”ہاں رچھہ کا۔ جب تم ہوتے ہو تو رچھہ نہیں ہوتا۔ وہ آتا ہے تو تم نظر نہیں آتے۔ یہ کیا قصہ ہے۔ اور اس ڈرامیور کو رچھہ نے پنجامارا تھایا تم نے مارا تھا؟ تمہارے ہاتھ پر خون کیسے لگا؟“ میں نے تاثر توڑ سوال کرنا شروع کر دیے اور اچانک اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ مداری نے تکلیف کی آواز نکالی مگر میں جانتا تھا وہ مکر کر رہا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑے سے صاف ہو چکا تھا۔ کہیں کوئی چوٹ کوئی گھاؤ کچھ نہیں تھا۔

اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور دھیرے سے بولا۔ ”بتادوں گا خان صاحب! بتادوں گا۔ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ارے ہم لوگ مداری ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں معلوم ہے مداری ہو۔ تو اس سے کیا؟“

کہنے لگا۔ ”ایسی کچھ باتیں ہم نے سیکھی ہوتی ہیں۔“

”کیسی باتیں؟“

”یہی شعبہ۔ تماشا۔“

میں نے جھنجھلا کر سر جھٹکا۔ ”یہ شعبہ تماشا نہیں تھا۔ پہلی بار جب رچھہ سامنے آیا تھا تو ہم بالکل نہیں سمجھ پائے تھے کہ کیا قصہ ہے؟“

”قصہ؟“ اس نے نرمی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ اب برف ہو گیا تھا۔

”ہاں۔“ میں نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا مگر نہ کھینچ سکا۔ ”ہاں ہم میں سے کوئی سمجھ نہیں پایا کہ کیا قصہ ہے ہمیں کیا ہو گیا۔ وہ ہنس۔“ ارے ہو کیا گیا تھا بابو! بس رچھہ کا تماشا تھا۔ رچھہ تم لوگوں کو کھیل دکھاتا ہے۔ سنو خان صاحب! ادھر میری طرف دیکھو۔ بات سنو میری۔ ابھی ابھی تم نے اپنی جان جو کھم میں ڈال کر ہماری جان بچائی ہے اگر تم بددوق نہیں داغے تو وہ سورگولی چلا دیتا۔ کوئی مارا جاتا۔ ہم لوگ پہلے ہی تمہارے احسان کے بوجھ میں دبے تھے۔ تم نے آج ہماری جان بچالی۔ مالک تمہیں جیتا رکھے، خوش رکھے، پھلتے پھولتے رہو تم شیر علی! سلامت رہو۔“ مداری، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے برابر بولے جارہا تھا۔

کھڑے تھے۔ ہم نے تمہیں آتے نہیں دیکھا۔“

بوڑھے مداری نے کمزور آواز میں کہا۔ ”بابو! اپنے آدمیوں کو واپس بھیج دو۔ سب کو بھیج دو۔“

”میں کسی کو نہیں بھیجوں گا۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب؟ کون لوگ تھے وہ؟ اور تم کون؟ کون ہو تم؟“

وہ بولا۔ ”بتادوں گا۔ سب بتادوں گا۔ ادھر پنچایت کی ضرورت نہیں ہے۔ تم دوسروں کو بتادو۔ بات ایسی ہے۔“

بوڑھے کے لہجے میں بے چارگی تھی۔ میرا غصہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے باہر جا کر اپنے آدمیوں کو سمجھا دیا اور واپس بھیج دیا۔ میرا باز البتہ میری بددوق اور بد معاشوں سے چھینے ہوئے پستول سنبالے جھونپڑی سے کچھ دور بیٹھا رہا۔

میں واپس آیا تو دیکھا لڑکی نے بوڑھے کی بچھات کے قریب میرے بیٹھنے کو لکڑی کا ایک کندا ڈال دیا ہے۔

”ہاں کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اب بتاؤ۔“

بوڑھا کہنے لگا۔ ”بابو! بات کچھ لمبی نہیں ہے۔ یہ ڈرامیور بھی برما سے آیا ہے ہمارے علاقے کا ہے۔ مشکل کے دنوں میں کبھی میرے بیٹے نے اس سے دو ہزار کا ادھار لیا تھا۔ ادھار لوٹانے کا موقع نہ ملا، بیٹا گزر گیا۔ یہ ادھر بنگال میں اٹلے سیدھے دھندوں سے کماتا رہا۔ ہم اس سے ادھار لے لے کے کھاتے رہے۔ میں بڑھا آدمی کو کوئی کام ہی نہیں ملتا تھا۔ ادھار کے پیسے زیادہ ہو گئے تو اس کے گھر والے بولے ڈرامیور کو اپنی پوتی بیاہ دے۔ ادھار کا بوجھ بھی اتنے گا لڑکی بھی بس جائے گی۔ میں نے کہا پہلے دیکھوں گا کیسا آدمی ہے؟ لڑکی کو بیچنا تو نہیں ہے۔“

ٹھیک بات تھی۔ میں نے سر ہلا کر بوڑھے سے اتفاق کیا۔

وہ بولا۔ ”تو بابو! میں نے اس کا پتا کر لیا، معلوم ہوا یہ نشے باز ہے اور بھی سب برے دھندے کرتا ہے۔ ادھر یہ گھر کے چکر لگانے لگا۔ میں نے سختی سے روکا تو پھر بک بک کرنے لگا کہ میری رقم واپس کرو نہیں تو لڑکی سے میرا بیاہ کر دو۔ آگے بھی تمہارے خرچے اٹھاؤں گا۔ بس اسی سب جھگڑے کی وجہ سے یہ ادھر نکل آیا۔ آج یہ بد معاشوں کو اور اپنے سیٹھ کو لے کے لڑکی چھینے آیا تھا۔ پہلے بھی ہم تینوں بنے جب چانگام میں تھے اس نے ایسے ہی ایک بار حملہ کیا تھا۔ خبر نہیں کیسے ہماری کھوج نکال لیتا ہے سور؟“

ایک پولیس انسپکٹر اور تین چار ماتحت بیٹھے میر باز سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں اور وہ خاموش بیٹھا ٹھکرا رہا تھا۔ نئے مالک کا بد معاش بھتیجا اور اس کے ساتھی کچھ دور کرسیاں کھینچے بیٹھے تھے۔

میں کاسیز بازار کے نامی گرامی، وکیل مزل صاحب کو فون کرتا ہوا پولیس والوں کے پاس آیا تھا۔ وکیل مزل صاحب نے پولیس کا سن کر فون پر پہلی بات یہ کہی تھی کہ میں پولیس کے کسی سوال کا کوئی جواب نہ دوں۔ بس یہی کہتا رہوں کہ وکیل صاحب کے آنے پر جو پوچھیں گے بتا دوں گا۔ اس لیے میں پولیس والوں کو سلام کر کے جا بیٹھا تھا۔ ان کے نوکتے نوکتے بھی میں نے میر باز سے پشتو میں دو باتیں پوچھ لی تھیں جس سے میری تسلی ہو گئی تھی۔

پہلی بات یہ کہ میر باز نے پولیس کو کچھ بتایا تو نہیں؟ دوسری یہ کہ خدا بخش رائیں کہاں ہے؟

میر باز نے پولیس والوں کے ہر سوال کے جواب میں کہا تھا کہ صاحب میں سو رہا تھا۔ آپ نے آکر چکایا ہے تو جاگا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم دوسری بات میر باز نے مجھے یہ بتائی کہ خدا بخش رائیں پولیس کے آنے سے بہت پہلے اپنی لائسنس والی بندوق اور بد معاشوں سے چھینے ہوئے پستول لے کر جا چکا ہے اس وقت خدا معلوم کہاں ہے؟

ظاہر ہے دونوں باتیں اطمینان بخش تھیں۔ میں نے کلک سے پولیس والوں کے لیے چائے کافی کچھ بنانے کا کہہ دیا۔ پولیس والے گیٹ ہاؤس کے نوکروں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے مگر ہمارے گونگے کلک کے سوا سبھی نوکر سبزی، گوشت، جنس وغیرہ خریدنے نکل گئے تھے۔ مطلب یہ کہ گھیرا پڑتے وقت میر باز پولیس والوں سے جھک جھک کرنے لگا تھا اور کلک کو اس نے اشارہ کر دیا تھا۔ جو ابھی تک گونگا نہیں ہوا تھا، چنانچہ کلک نے بظنی دروازے سے سب کو چلتا کیا تھا۔

پولیس انسپکٹر دھمکیاں دے رہا تھا۔ غرار ہا تھا مگر مجبوری تھی۔ اسے وکیل مزل نے فون کر دیا تھا کہ وہ آدھے گھنٹے میں گیٹ ہاؤس پہنچ جائیں گے پھر جیسی چاہے پولیس تفتیش کر لے۔

جی ہاں مجبوری تھی۔ کیوں کہ مزل وکیل بہت مضبوط اور بہت مہنگے وکیل تھے۔

وکیل مزل آئے تو انہوں نے انسپکٹر سے پوچھا کہ کس کے خلاف کیا چارج

مجھے اس وقت بھی معلوم تھا کہ وہ نالانے کے لیے یہ سب باتیں کر رہا ہے مگر کیا کرتا اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی روشنی اور اس کی آواز میں جیسے نیند لانے والی کوئی کیفیت تھی جو مجھے نہ سلاتی تھی نہ بیدار رکھتی تھی۔ اس سے آنکھ بھی نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اسے نوک نہیں سکتا تھا، برابر اس کی طرف دیکھے جانے اس کی بات سنتے رہنے پر مجبور تھا۔

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔ ”اچھا۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔ سو جاؤ تم بھی سو جاؤ میں جا رہا ہوں۔“

اور میں اٹھ کر سیدھا گیٹ ہاؤس چلا آیا۔

گیٹ ہاؤس کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ لوگ جاگ رہے تھے۔ دو تین مہمان بھی اٹھ بیٹھے تھے۔ خدا بخش رائیں جاگ اٹھا تھا۔ میں نے خدا بخش اور میر باز سے کہا۔ ”سب سے کہو لا سنیں بھجادیں اور سو جائیں۔ سب ٹھیک ہے۔“

خدا بخش بولا۔ ”وہ تو ہم کہہ دیں گے پر قصہ کیا تھا؟“

میں نے کہا۔ ”کچھ نہیں ان کا آپس کا معاملہ تھا۔ رشتے دار ہیں۔ شادی بیاہ کا کوئی جھگڑا تھا۔“

خدا بخش بہت زبردست آدمی تھا۔ اس نے اٹھتے ہی شاٹ گن اور پستولوں کا چارج سنبھال لیا تھا۔ میر باز اس سے کہہ چکا تھا کہ میں نے شاٹ گن سے ایک فائر کیا ہے۔

میں سب کو جانے کا کہہ کر بستر پر جالینا اور خود ایسی گہری نیند سویا کہ صبح ساڑھے دس گیارہ بجے جب پولیس نے گیٹ ہاؤس کا گھیرا ڈالا اور ہر طرف شور شرابا کیا تو میری آنکھ کھلی۔

میں نے کھڑکی سے دیکھا گیٹ ہاؤس کے نئے مالک کی کار لے کر اس کا بھتیجا اپنے دو تین گرگوں کے ساتھ پولیس والوں کے پیچھے آیا تھا۔

والد صاحب کے یہاں، مشرقی پاکستان میں ہوتے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ہمارے گیٹ ہاؤس پر پولیس آئی ہو حالانکہ اونچ، نیچ، چوری چکاری دو چار مرتبہ ہو بھی چکی تھی۔ یہاں پہلی بار پولیس آئی تھی۔ مجھے بس یہ فکر تھی کہ والد جب سنیں گے تو کیا کہیں گے۔

خیر، میں منہ ہاتھ دھو کر، کپڑے بدل کر دو ایک فون کر کے باہر آیا، تو دیکھا کہ

الرحمن بلبلاتا ہوا اور پولیس والے کھیاتے ہوئے چلے گئے۔

یہ سب تو خیر ٹھیک تھا۔ مشرقی پاکستان سے میرے جاتے جاتے ایک دشمن کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ یہ ٹھیک نہیں تھا۔

وکیل صاحب نے مجھ سے پورا قصہ سنا، کچھ ہدایات دیں پھر وہ چلے گئے۔ میں نے انہیں ریچھ اور مداری والی الجھن نہیں بتائی۔ بات ایسی تھی کہ کسی کو بھی یقین نہ آتا۔ بھلا ایسا کہیں ہوا ہے کہ جھوپڑی سے چھ فار پیچھ غائب ہو جائے، اس کی جگہ ایک بڑھا آمو جو ہو۔ مداری کا خون آلود پنجا بھی صرف میری الجھن تھی جس میں وکیل صاحب کو یا کسی کو شریک نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وکیل صاحب کے جانے کے بعد میں گیٹ ہاؤس کے پچھواڑے گیا۔ مداری کی جھوپڑی گری پڑی تھی۔ اس کی کچھ چٹائیوں بانسوں کو بھی آگ لگا دی گئی تھی۔ یہ کام رات ہی میں ہو گیا تھا۔ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ یہ کس کا کام ہے سہیجے بزل الرحمن کا یا خود بوڑھے مداری کا؟

بس ایک بات میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر پھنسا ہوا نہیں ہے تو مداری مجھے بھی غچہ دے گیا ہے۔

شام کو گیٹ ہاؤس کا نیا مالک مجھ سے ملنے اور افسوس کرنے آگیا۔ وہ اپنے سہیجے بزل الرحمن کی حرکتوں سے نالاں اور مجھ سے شرمندہ تھا۔ کہنے لگا۔ ”تم سے تو بیٹا اس نے جو کیا، سو کیا۔ میرے ساتھ دیکھو کب کی دشمنی نکالی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیسے؟“

بولا۔ ”ابھی گیٹ ہاؤس کو میں اس کا سگا چچا اشارت کرنے والا ہوں اور شروع میں ہی اس گدھے نے اس جگہ کی بدنامی کرا دی۔ پولیس لے کے آگیا یہاں۔ میں جانتا ہوں رات میں گولی دولی بھی اسی نے چلائی ہو گی۔“

میں سوکھا سامنہ بنائے افسوس میں سر ہلاتا رہا۔

کہنے لگا۔ ”تمہارے والد نے ایک عزت بنائی تھی اس جگہ کی، جس کے لیے میں نے ڈھیر سے پیسے دیے ہیں اور اب دیکھو باز لرنے ساری عزت خاک میں ملا دی۔ اب کون آئے گا یہاں؟“ وہ بزل الرحمن کو باز لرنے کہہ رہا تھا جو اس کے نام کے ساتھ صحیح سلوک تھا۔

”توبہ توبہ۔“ میں نے ہمدردی کی اور دبے لفظوں میں مشورہ دیا کہ ”اوگ۔“

ہے اور انسپٹر صاحب سرچ اور گرفتاری کے کون کون سے وارنٹ لائے ہیں؟

وارنٹ وغیرہ تو خیر اس وقت نہیں ہیں۔ انسپٹر نے بتایا کہ گیٹ ہاؤس کے نئے مالک کے سیاست داں سہیجے نے جس کا نام معلوم ہوا کہ بزل الرحمن ہے، میرے خلاف اپنے ڈرائیور موگو کو زخمی کرنے اور خود اس پر شاٹ گن سے فائر کرنے کی رپورٹ لکھائی ہے۔ ایک اور رپورٹ اس کے ڈرائیور نے جو فی الحال اسپتال میں ہے، یہ درج کرائی ہے کہ میں نے، یعنی شیر علی نے نہ صرف کلباڑی مار کر اسے زخمی کر دیا ہے بلکہ اپنے نوکر میر باز کی مدد سے اس کی بیوی سوئی کو اغوا بھی کر لیا ہے۔

میں نے سوچا۔ لڑکی کے اغوا کی رپورٹ لکھانے کا مطلب یہ ہے کہ مداری اور اس کے پوتا پوتی اس وقت یہاں نہیں ہیں۔ جا چکے ہیں یا ہو سکتا ہے وہ لوگ اس بزل الرحمن کے چنگل میں ہوں۔ گیٹ ہاؤس کی تلاشی لینے کا مقصد مجھے پریشان کرنا یا شاید شاٹ گن برآمد کرنا تھا۔

وکیل منزل، ایسے ہی توانائی گرامی وکیل نہیں ہو گئے تھے۔ وہ اپنے دفتر ہی سے میرا پیدائش کا سرٹیفکیٹ لے کر چلے تھے جس کے مطابق میں قانونی اعتبار سے نابالغ تھا اور وکیل صاحب خود ایک اور سرٹیفکیٹ کی رو سے مشرقی پاکستان میں میرے گارجین یعنی سرپرست تھے۔ انہوں نے احتیاطاً کورٹ سے میر باز کی اور میری ضمانت قبل از گرفتاری بھی کرائی تھی۔

منزل صاحب نے انسپٹر کو اپنے چھوٹے کی طرح سمجھایا۔ ”کہنے لگے کہ ان چھوٹے موٹے نقلی سیاسی ورکروں کے جھانے میں آکر تم کیوں اپنا سروس ریکارڈ خراب کر رہے ہو۔ ایک نابالغ لڑکے پر کسی کی بیوی اغوا کرنے اور گولی اور کلباڑی چلانے کا مقدمہ قائم بھی کر دیا تو پیروی کس طرح کر سکو گے؟ ڈرائیور موگو عرف موجد عرف مجید عرف منگل، پرانا وارداتی اور اسمگلر ہے۔ یہ بات تمہیں دودن کی چھان بین سے ہی معلوم ہو جائے گی۔ اب جاؤ، معلوم کرو کہ یہ کس چکر میں زخمی ہوا ہے اور شادی کے چھوٹے سرٹیفکیٹوں کا تو سبھی کو پتا ہے کہ کاکسیر بازار میں کہاں تیار ہوتے ہیں۔ موگو جیسوں کی بیویاں وغیرہ نہیں ہوتیں۔ اس لیے جاؤ، میرا اور اپنا وقت خراب مت کرو۔ ڈرائیور موگو اسپتال سے فارغ ہو کر آجائے تو اسے الٹا لٹکا کر پوچھ لینا کہ کلباڑی کی چوٹیں کہاں کھائی تھیں۔ وہ بتا دے گا۔“

ایسے چاروں کھونٹ تیار وکیل کی موجودگی میں بس یہی ہوتا تھا۔ سہیجے بزل

انہیں زیادہ کچھ بتانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو جاتے۔
 آدھی رات کے بعد جنگل کی طرف سے چھپتا چھپتا خدا بخش رائیں آیا۔ وہ شہر
 کے موابیوں، وارداتیوں سے باز لر کے چھپنے ہوئے پستولوں کے لیے کارتوس میگزین
 خرید لایا تھا۔ اس نے بہت قیمتی معلومات بھی حاصل کی تھیں۔

سب سے اہم خبر یہ تھی کہ باز لر غائب ہے اور یہاں کی سب کارروائی اس نے
 سبٹ کے ایک غنڈے، جو بور دادا کے سپرد کی ہوئی ہے۔ اسی نے ہمارے محاصرے پر
 چھ آدمی لگائے ہیں۔ آدمیوں کو کسی طرح کے جھگڑے بلوے کا آرڈر نہیں ہے۔ وہ
 صرف جو بور دادا کو خبریں پہنچائیں گے اور ہمیں دہشت زدہ رکھیں گے۔ اسی لیے وہ چھپتے
 نہیں چکر لگاتے نظر بھی آرہے ہیں۔

میں نے فکر مند ہو کر پوچھا۔ ”بزل الرحمن کہاں ہے؟“
 خدا بخش کہنے لگا۔ ”بازلر کو تو باؤ! کا کسیر بازار میں ہر طرف پوچھ لیا۔ وہ نہیں
 ہے شہر سے نکلا ہوا ہے۔“

”مداری اور اس کے پوتا پوتی کی کوئی خبر؟“
 ”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”خبر یہ ہے اور بری خبر ہے کہ وہ لوگ باز لر کے ہتھے چڑھ
 گئے۔ اس نے مداری کو بچوں سے الگ کر دیا ہے بلکہ شاید تینوں کو الگ الگ کر دیا ہے۔
 لڑکی اور مداری کا تو پتا بھی نہیں چلا۔ میں نے لوگوں کو لگا دیا ہے۔ ہاں لڑکے کا معلوم ہو
 گیا ہے۔ وہ یہیں شہر میں ہے۔“

”اچھا؟ کہاں ہے؟“
 ”نیو سانا گا چھی میں۔“

میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا تھا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟“
 خدا بخش ذرا سا مسکرایا۔ اس نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلا بھر بولا۔ ”وہ
 تاجدھر وہ گانے بجانے والے اور کنجریاں شخریاں رہتی ہیں۔ کا کسیر بازار میں بھی اس کو
 سونا گا چھی کہتے ہیں۔ نیو سونا گا چھی۔“

”ہوؤں!“ میں سوچ میں پڑ گیا۔ سچ بات ہے، مجھے مداریوں کے اس کھانے
 سے اب کیا تعلق۔ جب تک وہ یہاں پڑوس میں تھے ہم ان کے لیے کچھ کر دیتے تھے۔
 خدائی فوج دار تو نہیں ہیں ہم۔ وہ کہیں بھی رہیں، کچھ بھی کریں، اب جو بھی اس بے
 چارے لڑکے کے نصیب میں ہوگا، جو بھی لڑکی کی تقدیر میں ہوگا غریب بھگت لیں گے۔

”بازلر“ کو گیٹ ہاؤس سے دور رکھیں گے تو بے شک کاروبار کر لیں گے۔

رات میں چپکے سے خدا بخش رائیں لوٹ آیا۔ یہ تمام وقت اس نے جنگل
 گھومنے میں اور شکار میں گزارا تھا۔ وہ اپنی شاٹ گن کسی ٹھکانے کی جگہ رکھ آیا تھا اور شکار
 کا گوشت اور کھال گیٹ ہاؤس والوں کے لیے لیتا آیا تھا۔

دن کے واقعات سن کر خدا بخش کہنے لگا۔ ”شیر علی باؤ! میں آپ کا خادم ان
 بزل الرحمن جیسوں کو خوب سمجھتا ہوں، علاج بھی کرنا جانتا ہوں۔ باؤ! تم ادھر گیٹ
 ہاؤس میں جم کے بیٹھو۔ جب تک میں نہیں آ جاؤں نکلنا مت۔ دو، تین گھنٹے ادھر گزار
 کے میں جا رہا ہوں۔ کل کسی ویلے رات میں آؤں گا۔“

میں نے پوچھا ”کیا کرنے جا رہے ہو؟“
 کہنے لگا۔ ”ادھر بھی ہر ٹائپ کے آدمی سے سلام دعا ہے میری، میں پتا کر کے
 آتا ہوں کہ وہ آگے کیا سکیم بنا رہا ہے۔ سمجھے آپ۔ یہ ضروری ہے۔“
 میں نے کہا۔ ”کیا کوئی اور نہیں جاسکتا؟ ابھی آئے ہو تم ہی کیوں جا رہے

ہو؟“
 خدا بخش بولا۔ ”مجھے اس باز لر نے، اس کے بندوں نے کبھی دیکھا نہیں ہے۔
 میر باز کو یاد دوسرے آدمیوں کو وہ لوگ پہچان لیں گے۔ سمجھے آپ؟“
 ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا جب دشمنیاں چل پڑی ہیں تو آگے کا کوئی بندوبست
 کرنا ہی ہوگا۔“

وکیل صاحب اپنی قانونی کارروائیاں کر کے چلے گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ
 پولیس سے کسی بھلائی کی امید مت رکھنا۔ وہ خوار ہو کے گئے ہیں گیٹ ہاؤس والوں کی
 مدد کو آگے نہیں آئیں گے۔

میں اگلے دن گیٹ ہاؤس ہی میں مصروف رہا۔ نکلا نہیں۔ میر باز نے بتایا کہ
 نئے نئے لوگ پیدل بھی اسکوٹروں، سائیکلوں پر بھی گیٹ ہاؤس کے آس پاس چکر لگاتے
 نظر آتے ہیں۔ میں نے میر باز سے کہہ دیا کہ خود سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے
 ہاں اگر وہ لوگ جھگڑا، توڑ پھوڑ کچھ شروع کریں گے تو پھر دیکھ لیں گے۔

ہمت اور جرات اپنی جگہ مگر ہمارے پاس معمولی لائٹھی، خنجر کے سوا باقاعدہ
 کوئی ہتھیار، پستول، بندوق کچھ نہیں تھا۔ اور سمجھو ہم تین ہی لڑنے والے تھے۔ خدا بخش
 کو ملا کے۔ گیٹ ہاؤس کے بیرے، بلٹر، سک لڑنے جھگڑنے والے لوگ نہیں تھے۔

خدا بخش رائیں اور میر باز کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ کک کو ہم نے ہدایت دے دی تھی کہ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہم گیٹ ہاؤس نہ واپس پہنچیں تو وہ یہ پرچا وکیل صاحب کو پہنچا دے۔

باز لر اور اس کے گر گے سے چھینے ہوئے دو پستولوں کی وجہ سے ہمارا آپس میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ خدا بخش کہنے لگا۔ ”ایک پستول تو جناب! میں رکھوں گا اور دوسرا“ میرا خیال ہے، میر باز عمر میں بڑا ہے وہ رکھ لیوے تو اچھا ہے۔“

”اور میں؟ میں ایسا ہی نہتا چلوں گا؟“ میں نے چڑ کر سوال کیا۔

”دیکھیں نا جی، اصل میں تو مجھے اور میر باز کو جانا تھا۔ وہ جگہ اس لائق نہیں ہے کہ جی آپ جیسے شریف نوجوان ادھر جائیں۔“

میں نے کہا۔ ”خدا بخش! یہ شریف نوجوان والی لائن مجھے مت دو۔ میر باز بھی شریف نوجوان ہے تو وہ کیوں جا رہا ہے ایسی جگہ؟“

خیر کچھ دیر جھک جھک کے بعد پستول مجھے مل گیا مگر خدا بخش نے اللہ رسول کے واسطے دے کر مجھے پابند کیا کہ میں کسی بندے پر گولی نہیں چلاؤں گا۔ ڈرانے یا زیادہ سے زیادہ ہوائی فائر کرنے میں کام آئے گا یہ پستول۔

گھنٹے دو گھنٹے سو لینے کے بعد جس حد تک ممکنہ احتیاط سے یعنی لائن جلائے بغیر اور خاموشی سے تیاریاں کر کے ہم گیٹ ہاؤس سے رخصت ہو کر پچھواڑے کے جنگل میں غائب ہو سکتے تھے، ہم غائب ہو گئے۔

ابھی اندھیرا ہی تھا جو ریٹ ہاؤسوں، ڈاک بنگلوں کے علاقوں سے نکل کر ہم شہر جانے والی بڑی سڑک پر آ گئے۔ اتنی صبح دودھ، سبزیاں لے جانے والے اور شہر میں اپنی نوکریوں پر پہنچنے والوں سے بسیں بھرتی جا رہی تھیں۔ ہم تینوں موسم کے حساب سے چادریں اور کبیل لپیٹے، مضافات کے لوگوں کا سوانگ بھرے ایک دوسرے سے بے تعلق بس میں بیٹھ گئے۔

دن نکل رہا تھا جب کاسمیز بازار کے مرکزی علاقے میں جہاں سبزی، گوشت، مچھلی، دودھ کی مارکیٹیں کھلتی جا رہی تھیں، ہم پہنچ گئے۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بس سے اتر کر الگ الگ سمتوں میں چل پڑے تھے۔ چھوٹی بڑی سڑکوں اور گلیوں سے ہو کر ہم موجد دار ہو ٹل پہنچ گئے جو کم خرچ میں صاف ستھرا ناشتا کرا دیتا تھا۔ الگ الگ میزوں پر بیٹھ کر ہم تینوں نے ناشتا کیا۔ پیسے

خدا بخش نے پوچھا۔ ”کیا سوچنے لگے باؤ؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ اگر لڑکا ادھر۔ کیا نام بتایا۔ گانے بجانے والوں کے محلے میں ہے تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ وکیل صاحب کے ذریعے پولیس کو خبر کرا دیں۔ وہ آپ ہی چھڑا لائیں گے۔“

خدا بخش نے کھٹکار کر گلا صاف کیا۔ کہنے لگا۔ ”باؤ! ہم پر حملہ ضرور کرے گا باز لر۔ بے آج نہیں تو کل ضرور کرے گا۔ ہمیں اپنا بچاؤ کرنا ہے۔ سب سے اچھا بچاؤ باؤ شیر علی! یہ ہے کہ ہم ایک کر دیں۔ اس لڑکے کو حاصل کر کے ہم اپنے پاس رکھیں۔“

”کیوں بھلا؟“

”او جناب! تاکہ آگے دباؤ ڈالنا ہو دے، سودے بازی کرنی پڑے تو ہماری پوجی شن مضبوط ہووے۔“

بات سمجھ میں آرہی تھی مگر کوڈ پڑنے سے پہلے احتیاط ضروری تھی۔ میں نے کہا۔ ”ہاں ہاں۔ اگر آسانی سے لڑکے کو لاسکیں تو ہم اسے یہاں گیٹ ہاؤس میں رکھ لیں گے۔ جب تک اس کے لوگ نہیں ملتے۔ کیوں نا؟“

خدا بخش بولا۔ ”یہی سوچ رہا ہوں۔ پر اسے ادھر سے نکالنا کھانا کام ہے۔“

”اللہ مالک ہے۔“ میں نے ہمت بڑھائی۔ چلو کب چلنا ہے۔“

”باؤ صاحب، جناب! جانا تو صرف میں نے اور میر باز نے ہے۔“

میں بھنا اٹھا۔ ”تمہارا مطلب ہے میں یہاں عورت کی طرح چھپا بیٹھا رہوں۔ خدا بخش رائیں! سنو۔ یہ میر باز کا یا تمہارا جھگڑا نہیں ہے۔ جھگڑا یہ میرا ہے اگر میں نہیں جا رہا تو کوئی نہیں جا رہا۔ ہم سب اس تمام قصے سے دور رہیں گے۔“

خدا بخش سوچ میں پڑ گیا۔ ”پر باؤ! اپنے بنگلہ صاحب کو خبر لگ گئی تو؟“

”کیسے خبر لگے گی۔ بنگلہ صاحب ہزاروں میل دور ہیں۔ ہم دو تین گھنٹے میں سب کچھ کر کے ادھر آ کے آرام سے بیٹھ جائیں گے۔“

خدا بخش میرے والد کے پرانے اسٹاف میں تھا۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا تھا جس سے اس کے اصل پاس کا کوئی نقصان ہو یا وہ خفا ہوں مگر خدا بخش سمجھ گیا تھا کہ اگر اسے یہ نوکری کرنی ہے تو فی الحال بھی اور آگے بھی میں اس کا پاس رہوں گا۔ وہ مجھے بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کے مشورے سے ہم نے چلنے سے پہلے کک کے پاس ایک پرچار کھوا دیا جس میں بعد سلام وکیل کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ میں یعنی شیر علی بنگلہ

کان خبر نہیں ہوتی کہ کون آیا اور کیا لایا۔
خدا بخش ظاہر یہ کر رہا تھا کہ صرف وہی بری زبان جانتا ہے۔ اس نے بیکری کے نوکر سے پوچھا۔ ”کیسی سلائی؟“ نوکر ہنس کر بولا۔ ”سب طرح کی۔ بالٹی میں اور پڑیا میں لپٹی بھی اور چادر میں لپٹی بھی۔“

وہ دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنس پڑے۔ مجھے یہ اچکا بری اور بھی گندا لگا مگر میں نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے ان کی بات میں سمجھ نہیں سکتا۔

پچھلے دروازے سے ہم اس ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ان تنگ و تاریک گندی میزھیوں سے چڑھ کر ہم تیسری منزل پر ہوٹل کے ایک ایسے کمرے میں پہنچے جہاں اندھیرا تو تھا ہی غسل خانوں، پیشاب خانوں کی سخت ناگوار بو بھی تھی۔ کچھ دیر بعد وجہ سمجھ میں آگئی۔ یہ کمرہ یا کوٹھری ہوٹل کے مشترکہ ہاتھ رومز کے نگران جمادار کی کوٹھری تھی۔ جمادار یا شاید وہ جمادارنی تھی جو نوٹے اسپرنگوں والی چارپائی پر دراز تھی۔ بری نے بہت مشکل سے اسے بیدار کیا۔ اس نے چارپائی سے اٹھ کر کوٹھری کی لائٹ جلائی پیلا سا بلب روشن ہو گیا۔ روشنی میں پتا چلا کہ ہاتھ رومز نگران نہ جمادار ہے نہ جمادارنی ہے۔ کھسرا یعنی زرخا ہے اور دیہاتی عورتوں کے کپڑے پہنے ہے۔

زنحے نے ہاتھ جلاتے، تالی پھنکارتے ہوئے پہلے تو بری پھر اس کی زبان میں غصہ کیا کہ اس نے سوتے سے اٹھا دیا۔ کہنے لگا۔ ”بھلا یہ کوئی وقت ہے کسی کو اٹھانے کا؟“ پھر جب بری نے دھیرے سے کچھ کہا۔ کوئی نام لیا تو زنحے نے غصہ ختم کر کے خوشامد میں تالی پھنکارنا شروع کر دی۔ بنگلا میں بولا۔ ”ایسے بھدر، بڑے لوگوں کو کوٹھریا میں کیوں لے آیا۔ چل بالکونی میں لے جا کر بیٹھا میں آتی ہوں۔“

خدا بخش نے کہا۔ ”ہم بیٹھنے نہیں آئے ہیں جہاں لے جانا ہے لے چل۔“
بیکری کا نوکر ہمیں غسل خانوں کے پاس کھڑا چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ یہاں کے بعد زنحے کو ہماری رہبری کرنا تھی۔

ہوٹل سے ہمیں لے کر نکلا تو وہ سڑک پر بالکل خاموش اور تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ اچانک وہ مڑا اور پیچ دار گلیوں کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس نے اپنی رفتار کم کر لی تھی۔ ہم چاروں ایک چھوٹے گروہ کی صورت میں تنگ گلیوں سے گزرے تو اکادکاراہ گیر ہمیں دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ یہ زنحے کی وجہ سے تھا۔ مجھے ابھن ہونے لگی۔

دیے اور ایک ہی وقت میں ہوٹل سے نکل کر ٹہلتے ہوئے بنگلی گلی میں ایک دوسرے سے آن لے۔

اب ہم ایک ٹیم تھے اور ہماری منزل شہر کا وہ بدنام علاقہ تھا جہاں گانے بجانے والے اور خدا بخش کے کہنے کے مطابق کنجریاں شہنریاں رہتی تھیں۔

نیو سونا گا چھی جیسے علاقے میں کسی چھاپہ مار کارروائی کے لیے داخل ہونے کا یہ بہترین وقت تھا۔ شام سے رات گئے تک اس محلے میں گانا بجانا اور تماش بینی ہوتی تھی۔ دو تین بجے رات کو یہ بازار ٹھنڈا ہوتا ہو گا۔ اس وقت دن چڑھے بھی سمجھو اس محلے کے لیے آدھی رات تھی۔ چائے خانے اور ہوٹل جو سارے شہر میں منہ اندھیرے ہی کھل جاتے تھے یہاں بند پڑے تھے۔ راہ گیر بھی کم ہی تھے۔ انتہائی ضروری چیزوں کے اسٹال یا انڈے ڈبل روٹی کی کوئی کوئی دکان کھلی ہوئی تھی یا پھر سرکاری کارخانے یعنی پولیس چوکی وغیرہ کھلے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ گلیوں میں سناٹا تھا۔

خدا بخش نے ہمیں ایک بیکری کے پچھلے دروازے پر جا کھڑا کیا اور خود اندر چلا گیا۔ بیکری کے پچھلے دروازے پر بھی کچھ لوگ کھڑے تھے۔ کام والے بھی آ جا رہے تھے۔ خدا بخش پہلے بتا چکا تھا کہ یہ بیکری سائڈ میں ایم چرس وغیرہ فروخت کرتی ہے۔ پچھلے دروازے پر کھڑے ہوئے لوگوں میں وہ نشے باز شامل تھے جو سویرے ہی سویرے نشہ ٹونے پر نئے ڈوز کے لیے بے تاب ہو کر نکل پڑے تھے۔ بیکری کے نوکروں اور نشے بازوں نے جو اپنے چکروں میں پڑے تھے۔ مجھے اور میر باز کو وہاں منڈلاتے دیکھا بھی ہو گا تو غور نہیں کیا۔ ہم جیسے چادروں میں لپٹے اور بھی مشکوک سے لوگ گلی میں اور سڑک پر اپنے صبح کے ڈوز کا انتظار کر رہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں خدا بخش ایک ادھیڑ عمر کے بری نوکر کے ساتھ باہر آیا۔ بری بیکری کے نوکروں کی طرح تہہ پر استیوں والی بنیان پہنے تھا اوپر سے پرانا ڈبل بریسید کوٹ پہنا ہوا تھا۔ مجھے پہلی نظر میں یہ بری کچھ اچکا سا لگا میر خدا بخش اس سے گھٹ گھٹ کر باتیں کر رہا تھا تو میں نے اس کی شکل ناپسند ہونے کے باوجود اسے گوارا کر لیا۔ ہم تینوں بری کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ یہ ہمیں سونا گا چھی کے سستے ہوٹلوں چائے خانوں کی لائن میں لے گیا۔ ایک ہوٹل کے پچھلے دروازے پر رک کر اس نے جیب سے چابی نکالی اور خدا بخش کو ہنستے ہوئے بتانے لگا کہ جب ہوٹل کے کسی ”پاسنجر“ کے لیے چوری چھپے ”سلائی“ لاتا ہے تو یہی قفل کھول کر ہوٹل میں داخل ہوتا ہے۔ کسی کو کانور

بازر کے آدمیوں نے خاموشی سے اپنے مالک کے پستول ہمارے ہاتھوں سے لے لیے۔ ہم تینوں کی تلاشی لی، سب پیسے ہتھیا لیے، میر باز کے نیپے میں اڑسا ہوا خنجر نکال لیا اور خاموشی سے ہم تینوں کو ٹرک میں بٹھادیا۔ وہ لوگ منظم انداز میں ایک ایک کر کے ٹرک میں آ بیٹھے۔ ایک کے سوا سب نے اپنی رائفلیں ٹاٹ کے ٹکڑوں میں پیٹ کر سیٹوں کے نیچے رکھ دیں پھر سب اچانک ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ہاتھ ہاتھ بھر کے بھاری پاپوں سے انہوں نے ہمیں مارنا بلکہ کوٹنا شروع کر دیا۔ انہوں نے زیادہ حملے سروں پر کیے۔ چھ آٹھ منٹ بھی نہ لگے ہوں گے جو میں بے ہوش ہو گیا۔ کسی قسم کی تکلیف یا چوٹ کا احساس نہ رہا۔

آخری آواز جو میں نے سنی میر باز یا خدا بخش رائیں کی کراہیں تھیں۔ کسی نے بنگلا میں کوئی حکم دیا تھا اور ٹرک تھر تھر کر اشارت ہو گیا تھا۔

میں کتنی دیر بے ہوش رہا اس کا تو اندازہ نہیں۔ جب ہوش آیا تو یکساں رفتار سے گاڑی کا انجن چلنے اور مردوں کے سر ملا کر گانے کی آواز آرہی تھی، میری آنکھ پر پٹی بندھی تھی۔ میں سر اور گردن کی تکلیف کی وجہ سے گھوم نہیں سکتا تھا۔ ایک ہی رخ سے پڑا رہا اور اپنے اغوا کرنے والوں سے بنگلا زبان کے گیت سنتا رہا۔ زیادہ تر کھیتوں کھلیاؤں میں لگائے جانے والے گیت تھے۔

خدا معلوم ڈھائی، تین گھنٹے یا چار گھنٹے یہ گاڑی چلتی رہی۔ بدن کی تکلیف، بھوک اور پیاس سے میں بے حال ہو رہا تھا۔ فطری ضرورت بھی ستارہ ہی تھی مگر انہوں نے منہ پر کسی قسم کا نیپ چپکا دیا تھا۔ بس ”اوں اوں غوں غوں“ کی آوازیں نکال سکتا تھا جن پر وہ توجہ نہیں کر رہے تھے۔ آخر کو ٹرک روک دیا گیا۔ دو، دو تین تین آدمیوں نے کھینچتے ہوئے اور لاتیں لٹھونے مارتے، گالیاں دیتے ہوئے ہمیں ٹرک سے اتار کر کھیتوں جھاڑیوں میں روکے رکھا۔ مٹی کے برتنوں میں پانی پینے کو دیا اور ابلی ہوئی شکر قندی اور کچے سنگھاڑے کھانے کو دیے اس تمام عرصے میں کہ ہم کھیتوں میں خلا بھریں تھے نہ تو انہوں نے ہماری آنکھوں سے پٹیاں کھولی تھیں نہ ایک کو دوسرے سے بات کرنے دی تھی۔ آدھے پون گھنٹے بعد انہوں نے ہمیں پھر کھینچتے اور گالی گلوچ کرتے ہوئے ٹرک پر چڑھا دیا۔ ٹرک چل پڑا تو انہوں نے ہمارے بارے میں آپس میں باتیں اور مذاق کرنا شروع کر دیا، باتوں میں زیادہ تر دھمکیاں دی جا رہی تھیں کہ ہم نے باز را صاحب کو بہت خفا کر دیا ہے کہ اب وہ شاید ہی ہمیں معاف کرے گا۔ تینوں کو شوٹ کرادے گا۔ سب

اچانک وہ ایک جگہ رک گیا۔ سرگوشی میں کہنے لگا۔ ”میں دور سے وہ گودام بتا دیتی ہوں جس میں انہوں نے لڑکے کو بند رکھا ہے۔ گودام میں گھسنا آسان نہیں ہے۔ میں پھر کہے دیتی ہوں ہوشیاری سے جانا، مگر پہلے مجھے نکل جانے دو۔ کسی نے تم لوگوں کے ساتھ مجھے دیکھ لیا تو بعد میں میرا۔“ اس نے اپنے حلق پر دو انگلیاں چلا کر قتل کا اشارہ کیا۔

خدا بخش نے جیب سے پچاس روپے نکال کر زئے کو دیے۔ وہ خوش ہو کر دعائیں دیتا ہوا جانے لگا پھر رک کر بولا۔ ”پانچ منٹ روک مجھے نکل جانے دو۔ ابھی ایک دم مت گھس پڑنا۔“

خدا بخش نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم جاؤ۔ ویسے بھی دیر لگے گی ہمیں۔“ اور ہم لوگ سنسان گلی میں ایک طرف کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔

زنخامز کر پلک جھپکتے میں گلیوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ خدا بخش نے ادھر ادھر دیکھ کر مجھے اشارہ کیا اور خود بھی اپنا پستول فار کے لیے تیار کر لیا۔ میجر نے جو گودام بتایا تھا اس کے دور رخ، دو گلیوں میں کھلتے تھے۔ یقیناً دونوں طرف دروازے ہوں گے۔ جس رخ پر ہم کھڑے تھے اس طرف بڑے پھانک میں تالا پڑا تھا۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے دوسرا رخ دیکھ لینا ضروری تھا۔

تینوں خاموشی اور احتیاط سے تیز تیز چلتے ہوئے گلی میں گھومے تاکہ گودام کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیں مگر ہم ایک ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ یہ ٹرک ایک دم کونے پر بہت غلط طریقے سے پارک کیا گیا تھا۔ ہم تینوں نے ذرا گھوم کر ٹرک سے آگے گلی میں نکل جانا چاہا پھر ہم حیرت میں رکے اور جہاں کے تہاں کھڑے رہے گئے۔

پچھے آدمی اپنی رائفلیں چھتیاے ہم تینوں کو نشانے پر لیے سکون سے ٹرک کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ ساتویں آدمی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا اور یہ آدمی بزل الر حن باز را خود تھا۔

باز را نے اپنی بنگالی اردو میں کہا۔ ”آجاؤ آجاؤ پٹھان بھائی! اس دنے کوئی گوز بوڑ نہیں کرنا۔ یہ گیٹ ہاؤس کا ایریا نہیں ہے، روٹڈی بزار ہے۔ ادھر ہم کو مار کے فیک دے گا کوئی نہیں پوسے گا۔ گولی مولی برابر چولتی ہے ادھر۔ کوئی نہیں پوستا۔ ہاں۔“

خدا بخش کے اور میرے ہاتھ میں بے شک بھرے ہوئے پستول تھے لیکن ہماری ناکوں سے دو دو ڈھائی ڈھائی فٹ دور تیار رائفلوں کی نالیں تھیں۔

نے گیٹ ہاؤس سے چلتے وقت کک کے سپرد جو پرچا کیا تھا۔ چوبیس گھنٹے پورے ہونے پر وہ اسے وکیل صاحب کے حوالے کر دے گا۔ وکیل نیو سونا گاچی کے اس پہلے رابطے یعنی بکری کے برمی ملازم سے معلوم کریں گے پھر اس کھسرے جمدار کو پکڑیں گے۔ ممکن ہے کل دوپہر تک یا زیادہ سے زیادہ شام تک اس بد معاش باز لر کو دھر لیا جائے گا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں تو میں اور میرے دونوں وفادار ساتھی گیٹ ہاؤس میں ہوں گے۔

یہی سب پر امید باتیں سوچتا ہوا میں پھر سو گیا۔ اب جو آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ باہر کسی گاڑی کے بار بار سلف اٹھانے کی آواز آرہی تھی۔ انجن اشارت نہیں ہو پاتا تھا بیڑی کزور تھی۔

میں یہ غیر متعلق بات سوچ رہا تھا کہ بڑی آواز سے کمرے کا دروازہ کھلا اور تیزی سے باز لر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کاغذ تھا دوسرے میں اخبار۔ ایک نوکر کرسی اٹھائے باز لر کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ نوکر کے شانے پر بیٹ پڑی تھی جس کے ہولسر میں پستول تھا۔ اس نے میرے گدے کے سامنے کرسی بچھا دی۔ باز لر بیٹھ گیا۔ گارڈ کرسی کے پیچھے جا کر کھڑا ہوا۔

باز لر نے بیٹھتے ہی پرچا میری طرف بڑھا دیا۔ ”لے اس کو پڑھ لے۔“ وہ نہ معلوم کیوں مجھ سے اپنی فضول اردو میں بات کر رہا تھا جب کہ اسے معلوم تھا کہ میں بہت اچھی بنگا بولتا ہوں۔

میں نے پرچا ہاتھ میں لیا اور سناٹے میں بیٹھا رہ گیا۔

یہ میرا وہ رقعہ تھا جو میں وکیل صاحب کے نام کک کے پاس ان ہدایات کے ساتھ چھوڑ آیا تھا کہ چوبیس گھنٹے تک ہم نہ آئیں تو رقعہ وکیل کو پہنچا دینا۔

باز لر بولا۔ ”یہ سوزتا ہوں گی بانگلا اچھا پوڑھ سکتا ہے۔ ابھی یہ بھی پوڑھو۔“ اور اس نے دوسرے ہاتھ میں تھا ہوا بنگلا کا اخبار میرے سامنے گدے پر ڈال دیا۔

اخبار کی ایک چھوٹی سی خبر کو باز لر نے سرخ روشنائی کا حاشیہ لگا کر نمایاں کیا ہوا تھا۔ میں نے پڑھا۔ یہ خبر تھی کہ مقامی مسلم لیگی رہنما مزمل حسین ایڈووکیٹ کے آفس پر حریف سیاسی جماعت کے پر جوش کارکنوں نے ہلا بول دیا اور دفتر میں توڑ پھوڑ مچائی۔ ایڈووکیٹ مزمل کو اس ہنگامے میں سر پر چوٹیں آئی ہیں۔ انہیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

خبر پڑھ کر میں باز لر کی طرف دیکھنے لگا۔ کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ باز لر مجھے دیکھ کر

سے زیادہ بکواس وہ میرے بارے میں کر رہے تھے کہ اسے دیکھ پٹھان بھائی کو عمر ہی کیا ہے اس کی زمین سے اگا ہے ابھی اور بد معاشی کرنے ”روڈی پاڑے“ میں آگیا ہے۔

اور دو گھنٹے یہ ہمارا قیدیوں والا ٹرک چلتا رہا پھر شاید ہماری منزل آگئی۔ ہم کسی کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے تھے۔ ٹرک روک دیا گیا تھا۔ ہمیں اتارا گیا۔ بند شیشیں پٹیاں کھول دی گئیں۔ خدا بخش کی حالت سب سے ابتر تھی اسے انہوں نے بہت مارا پٹا تھا۔ سر پھاڑ دیا تھا۔ میرا باز بھی زخمی ہوا تھا۔ جہاں ہم اترے تھے اونچی دیواروں والے اس احاطے میں ایک طرف کسی قسم کا کارخانہ قائم تھا۔ کئی چھوٹے بڑے اسٹور ہاؤس اور ایک انتظامی بلڈنگ نظر آرہی تھی۔

ہمیں انتظامی بلڈنگ کے کمروں میں الگ الگ بند کر دیا گیا۔ لگتا تھا ہمارے پہنچنے سے پہلے کمروں کو ہمارے لیے تیار کیا گیا تھا۔ کرسیاں، میزیں، دیواروں پر لگے کسی قسم کے چارٹ یا نقشے، تصویریں وغیرہ سب ہٹا دیا گیا تھا۔ بس دیواروں اور فرش پر ان کے نشان نظر آرہے تھے۔ بیچوں بیچ فرش پر ایک گدا پڑا تھا۔ کونے میں ایک مٹکا اور مٹی کا پیالا رکھا تھا۔

یہ تھا میرا قید خانہ۔ میں نے سوچا خدا بخش اور میرا باز کو بھی اسی طرح رکھا گیا ہو گا۔ یا ہو سکتا ہے بے چارے ملازم ہیں انہیں اور تکلیف میں رکھا ہو۔

بے آرام، لمبے سفر کی تھکن اور چوٹوں سے میں بے حال تھا۔ کچھ دیر تکلیف سے کروٹیں بدلتا رہا پھر سو گیا۔ خدا معلوم تین چار کہ جیسے گھنٹے بعد آنکھ کھلی۔ کمرے میں اندھیرا تھا مگر سلاخوں لگی کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر کچھ اجالا سا آرہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیا۔ پانی پی کر آیا۔ بھوک کا احساس بڑھ گیا تھا۔ میں پھر گدے پر آ بیٹا۔

والد صاحب نے ہمیں اپنے بچوں کو آرام میں رکھا تھا مگر آرام و آسائش میں ہمیں نرم نہیں بننے دیا تھا۔ سختیاں جھیلنے کی عادت بھی ڈالی تھی۔ میں پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بھوک سے بدن کی دکھن سے جتنی دیر بچت ہو سکے اچھا ہے۔ نیند اچھی پناہ ہوتی ہے۔

مگر نیند نہ آئی۔ اسی سیاسی کارکن بزل الرحمن کی مجرمانہ حرکتیں ایک ترتیب سے یاد آنے لگیں۔ بوڑھا مداری یاد آیا اور وہ ریچھ۔ ریچھ جس کا آنا اور جانا میں سمجھ نہیں پایا تھا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ ہر قیمت پر سمجھنا چاہتا تھا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ مداری اور اس کے پوتا پوتی سے پھر ملوں گا اور یہ مسئلہ حل کروں گا۔ چند گھنٹوں کی بات ہے ہم لوگوں

مسکراتا ہوا کہنے لگا۔ ”پیپر لکھتا ہے اس کا حالت خطرے سے باہر ہے۔ صحتی بات نے کم سے کم خوراک پر زیادہ دیر زندہ رہنے کے کچھ گرتائے تھے مگر یہاں تو کچھ بھی اس کا جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے ایڈووکیٹ موجدل حسین مرے گنا نہیں۔ دس نہیں تھا جس کو بنیاد بنا کر زندگی کو طول دینے کا کوئی گرا استعمال کیا جاتا۔ مجھے تو کچھ کھائے سال ایسا ہی جندہ رہے گا۔ نہ کچھ بول سکے گا نہ لکھ پڑھ سکے گا۔ بس کھانا کھائے گا، سر بھی چوہیں گھسنے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ کیا باز لرز کرنا چاہتا ہے مجھے؟ جب بھوک اور گاہے گاہے جندہ رہے گا۔ اس کا سر میں چوٹ لگا ہے۔ ربڑ کے ڈونڈے سے بہت چوڑی تھپائی سے میں نرم پڑ جاؤں گا تو وہ چوٹ لگائے گا اور اپنا مقصد حاصل کر لے گا۔ کیا یہ ہے سیاسی حریف لوگ نے چیخ چیخ چیخ۔ ابھی تمہارا معاملہ بھی فٹش ہے۔ ایک دم کھو تم چاہتا ہے بزل الر حمن؟ مگر مقصد کیا ہے اس کا؟ اس سوال کا جواب مجھے ابھی نہیں ملے گا۔ ابھی انتظار ادھر سو آرام سے ناشتا کھاؤ، کھانا کھاؤ اور بس خلاص ایک دم کھو تم۔“

یہ کہہ کر باز لر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے باڈی گارڈ نے اخبار رقعہ اور کرسی سر کرنا ہو گا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گیا۔ باہر سے کنڈا چڑھانے اور تالا ڈالنے کی آئی۔ ان دونوں کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر گاڑی نے سلف اٹھایا ایک بار کرنے کے بعد انجن اشارت ہو گیا اور گاڑی چلی گئی۔ فٹش! ختم! ایک دم ختم! میں جسے معمولی جھگڑا سمجھ رہا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑی بات بن چکا ہے۔ میں بے آسرا بوڑھے مداری کی مدد کی اور ایسے خطرناک آدمی کی دشمنی مول لے لی۔ میرے دیکھتے دیکھتے چوڑی کا ایک اور ٹکڑا آکر گرا۔ ادھر کوئی ہے شاید میرے ساتھیوں منزل نے مجھے بچانے کے لیے پولیس کو اور اس سیاسی کارکن نہیں بد معاش بزل الر حمن کو قانونی گرفت سے بے اثر کر دیا اور دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے ذلیل کیا۔ یہ ادھر سے کسی نے دیوار پر ہاتھ مارا۔

باز لر کو کھا گئی۔ وہ خود کو بڑا لیڈر سمجھتا ہے، ایک خاص انداز سے طاقت ور تو وہ ہے کیوں کہ اس نے کامیابی سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اغوا کیا ہے اور منزل ایڈووکیٹ کو بے کار کر دیا ہے۔ شاید ہمیشہ کے لیے مگر کیا اتنی چھوٹی بات کے لیے باز لر نے پوری طاقت استعمال کی ہو گی۔ صرف توہین کا بدلہ لینے کو یہ سب کیا ہو گا؟

اور یہاں میں نے سوچتے سوچتے انکار میں سر جھٹکا۔ بات کوئی بہت بڑی۔ مجھے سکون سے اس قید خانے میں بیٹھ کر انکشاف کی اگلی حیرت ناک قسط کا انتظار چاہیے اور یہ اگلی قسط بھی خود بزل الر حمن لے کر آئے گا۔ اسے ہر چیز کو ڈراے ساتھ پیش کرنا آتا ہے۔

میرے کرنے کوئی الحال کچھ نہیں تھا۔ میں پھر ہاتھ پیر پھیلا کر لیٹ گیا۔ ہو؟

صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام ہو گئی۔ کوئی نہیں آیا۔ بہت بھوک ستائی اٹھ کر پانی پی لیتا مگر خالی پیٹ پانی بھی اب معدے کو تکلیف پہنچانے لگا تھا کہ مجھے پیاس پر قابو پانا بھی سکھایا تھا۔ والد صاحب نے کہتے تھے جنگل ہماری زندگی ہے مگر بھول جائیں۔ زخمی یا بے کار ہو جائیں تو یہ جنگل ہماری موت بھی بن سکتا ہے۔

”میں ہوں ان کا کھانا پکاتی ہوں۔“

کھانے کا نام سن کر جیسے میں نہال ہو گیا۔ ”میں بھوکا ہوں۔“

”مجھے کھم ہے۔“

”نا۔ یہ تو نہیں مالم۔ بس یہ سنا تھا تم سے کوئی کام ہے ان لوگ کو۔“

”وہ لوگ، تم سے بات کرتے ہیں؟“

”ہاں، پر کم کم۔“

”ان سے پوچھنا مجھے کیوں لائے ہیں؟“

”نہیں بتائیں گے۔ مجھے ماریں گے۔“

”تمہیں مارتے ہیں؟“

”چپ! کوئی آ رہا ہے۔“

دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا ہو گا۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ بہ مشکل سناؤ دی۔

کسی نے بہت دیر سے کچھ کہا تھا۔ کوئی مرد تھا۔ لڑکی نے بلند آواز میں پوچھا۔
”کیوں؟“ جس پر آنے والے نے ”شش“ کہہ کر اسے چپ کرایا، پھر ایسی آوازیں آئیں
جیسے ہاتھ پائی ہو رہی ہو۔ شاید اسے کھینچ کر کہیں لے جایا جا رہا تھا پھر دروازہ بند ہو گیا اس
کے بعد سنا۔

اتنی دیر تک روشن دان کی طرف منہ اٹھائے لڑکی سے باتیں کرتے میں تھک
گیا تھا۔ بھوک نے واقعی کمزور کر دیا تھا۔ میں آکر لیٹ گیا۔

سوچنے لگا لڑکی نے وعدہ کیا ہے۔ وہ صبح ضرور میرے لیے کھانے کو کچھ لائے
گی۔ ہو سکتا ہے قید کرنے والے رات ہونے سے پہلے مجھے کھانے کو کچھ دے دیں۔ صبح تو
بہت دیر میں ہو گی۔ اگلا روز بہت دور ہے۔ میں لیٹا رہا، سوتا، جاگتا اور کھانوں کے خواب
دیکھتا رہا۔

کتنی بار سویا، جاگ اٹھا۔ صبح ہو چکی تھی جب کوئی چیز گرم اور نرم سی مجھ پر آکر
گری۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے سمجھا کوئی چھوٹا جانور گرا ہے پھر دوسری طرف سے
کمرے کی دیوار تھپتھپائی گئی۔ لڑکی کی آواز آئی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ”مل گیا؟“ اوہ! میں نے
ہلکے اجالے میں سامنے پڑی چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ابلا ہوا آلو تھا۔ ابھی تک گرم تھا۔
میں نے آلو کو چھیننے کا بھی تکلف نہ کیا۔ شروع ہو گیا۔ منہ چلاتے ہوئے میں نے بے
ڈھنگے پن سے جواب دیا۔ ”ہاں مل گیا۔ مہربانی تمہاری۔“

لڑکی کی آواز آئی۔ ”اچھا یہ اور لو۔“ اس نے کھانے کو پھر کچھ پھینکا ہو گا جو
واپس ادھر ہی جاگرا۔

لڑکی خوش دلی سے ہنسی۔ ”ٹھہر جاؤ پھر پھینکتی ہوں۔“ اس نے پھر پھینکا یہ

”کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟“ میں نے جیسے التجا کی۔

”بہت مشکل ہے۔“ وہ بولی۔ ”مجھے بھی تالے میں رکھتے ہیں وہ۔ جب کھانا

ہوتا ہے یا میری جرورت ہوتی ہے تو لے جاتے ہیں۔“

”اوہ!“ میں اور کیا کہتا۔

”وہ بولی۔“ کچھ کھائے تمہیں ایک دن ایک رات گھر گئی ہو گی؟“

”ہاں۔“

”دیکھو وعدہ تو نہیں کرتی۔ صبر تمہارے لیے کچھ لاؤں گی کو س کروں گی۔“
”صبح؟ یعنی کل؟“

”ہاں۔“

”یہ کیا جگہ ہے؟“

”کار کھانا ہے کوئی۔“

”نہیں شہر کون سا گاؤں بتاؤ کون سا ہے؟“

”باگھیر پوڑی۔“

”کون سا ضلع لگتا ہے؟ قریب کا شہر کون سا ہے؟“

بولی۔ ”یہ نہیں مالم۔“

میں نے پوچھا۔ ”تمہیں کہاں سے لائے ہیں؟“

”چائو گرام سے۔“ خوب، تو وہ چائو گرام کی رہنے والی تھی۔

”کیوں پکڑا ہے تمہیں؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ الگ ہی ایک بات شروع کر دی بولی۔ ”تم تین
لائے تھے وہ تین میں سے تم کون ہو؟ بڑی عمر کے مرد؟ اچھے کپڑے والے یا چوکے
جیسے؟“ اس نے ہمیں ٹرک سے اترتے دیکھ لیا تھا۔

میں ہنس پڑا۔ ”اسے بتایا کہ چوکیدار جیسا جو ہے وہ چوکیدار ہی ہے اور بڑی
والا مرد، میرے باپ کا ڈرائیور ہے۔ ابھی چھٹی پر ہے۔“ میں تین میں سے وہ ہوں
تم اچھے کپڑے والا کہہ رہی ہو۔“

وہ بھی ہنسنے لگی۔ ”تو تم صاحب ہو؟ بند کرنے والوں کو اصل کام تمہی

ہے؟“

میں چو کنا ہو گیا۔ ”کام؟ تمہیں پتا ہے مجھے کیوں لائے ہیں؟“

نہل کر گردے پر جا بیٹھا پھر لیٹ گیا اور سو گیا۔
 مجھ دیر میں دروازہ کھلنے کی آواز سے اٹھا تھا۔ دو آدمی کمرے میں آئے تھے۔ ایک تو
 ہی ہتھیار بند بد معاش تھا جو بازو کے ساتھ اس کی کرسی اٹھائے پہلے آچکا تھا۔ دوسرا
 ہی مسلح تھا۔ وہ ناشتے دان لے کر آ رہا تھا۔
 بغیر کچھ کہے انہوں نے ناشتے دان میرے سامنے رکھ دیا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔
 اری باری دونوں کی صورتیں دیکھتا گیا۔ نئے آدمی نے کچی اردو میں کہا۔ ”کمی کاڈا سے۔“
 میں نے مسکرا کر دیکھا بنگلہ میں اس کا شکر یہ ادا کیا اور ناشتے دان کھینچ لیا۔
 مجھے بنگالی بولتے سن کر نیا آدمی مسکرایا بولا۔ ”تو تم تو بہت اچھی بنگلا بولتے ہو۔“
 پرانے آدمی نے منہ بنایا اسے ڈانٹ دیا۔ کہا۔ ”چپ کرو۔ قیدی سے بات
 رنے کا آڈر نہیں ہے۔“
 میں ہنس پڑا۔ نیا آدمی اپنے ساتھی کے دھونس جمانے پر اسے گھور کر دیکھنے لگا
 تھا۔

مجھے مزا آ رہا تھا میں نے پرانے آدمی کا لفظ دہرایا۔ ”آڈر؟ واہ بیٹا!“
 پرانے نے ہتھیار میری طرف سیدھا کر لیا۔ ”چپ بیٹھ کر کھالے نہیں تو
 نیرے دانت توڑ دوں گا۔“
 میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور ناشتے دان کھولنے لگا۔ ناشتے
 ان میں چاول، دال اور سبزی تھی۔ میں نے تھوڑا کھانا بچا دیا۔
 پرانے والے گرگے نے حیرت سے دیکھا۔ اسے یہ توقع ہو گی کہ میں اور کھانا
 انگوں گا۔

ناشتے دان اس کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں مسکرا کر
 دیکھا اور کہا۔ ”لے باقی تو کھالے۔“
 پرانے نے گالی بکی اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے ناشتے دان اٹھا لیا۔
 دونوں چلے گئے۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔

پتا نہیں دال یا سبزی باسی تھی جو تھوڑی دیر میں مجھے چکر آنے لگے۔ میں نے
 سوچا۔ ”لڑکی کے آلو اور بن کھالیا تھا وہی ٹھیک تھا۔ مجھے ان بد معاشوں کا لایا ہوا کچرا نہیں
 لھانا چاہیے تھا۔“ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

میں نے پانی پیا۔ لڑکھڑاتا ہوا بستر تک پہنچا اور بے سدھ ہو کر گر گیا۔ سر

فروٹ بن تھا، باسی تھا مگر گیہوں، دودھ، چینی، کشمش۔ ان سب نعمتوں کو ملا کر بنایا گیا تھا۔
 لڑکی نے ایک اور ابلا ہوا آلو پھینکا۔ میں نے اسے چھیل کر کھالیا۔ پانی پیا۔ اس نے افسردہ
 آواز میں کہا۔ ”اور کچھ نہیں ہے۔ پیٹ تو نہیں بھرا ہو گا تمہارا؟“
 ”پرواہ نہیں۔“ میں نے پانی پی لیا تھا تو پیٹ بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ ”مہربانی
 تمہاری۔ ارے ہاں تم نے نام تو بتایا نہیں اپنا۔“
 ”روپالی۔“

”خوبصورت نام ہے اتی شوندر، بہت سندر۔“
 ”بس نام ہی سندر ہے۔“

میں نے چبکتی آواز میں کہا۔ ”یہ تو تم کہہ رہی ہو۔ میں تمہیں دیکھوں گا تو
 بتاؤں گا۔“

”کھوب صورت تم ہو۔ میں نے دیکھا ہے تم کو۔ گورے، سفید، لمبے اونچے۔“
 میں نے کہا۔ ”گورا، پیلا، نیلا، لمبو، چھوٹو یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ اصل
 خوبصورتی کچھ اور ہوتی ہے۔ تم بہت اچھی ہو گی مجھے معلوم ہے۔ جو لڑکی بھوکے کا پیٹ
 بھرے بہت حسین ہوتی ہے۔“
 وہ ہنسنے لگی۔ ٹھہر ٹھہر کر ہنستی رہی پھر آہستہ سے کہ میں بہ مشکل سن سکا کہنے
 لگی۔

”میں آؤں گی۔ تمہارے پاس اس کمرے میں آؤں گی۔“
 ”کیسے؟“ میں نے پوچھا۔ یہ خیال کہ جس نامعلوم لڑکی کی میں آواز سنتا ہوں
 اس وقت سن رہا ہوں وہ کسی طرح یہاں، میرے پاس آسکتی ہے، آئے گی۔ یہ خیال مجھے
 مست اور سرشار کر گیا۔

وہ آہستہ سے بولی۔ ”اب جا رہی ہوں بہت کام پڑا ہے۔“
 ”اچھا جاؤ۔ تم بہت اچھی ہو۔“

وہ جواب میں ہنس دی اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔
 پیٹ بھر گیا تو مجھے اپنی فکر نہ رہی۔ میں خدا بخش اور میر باز کے بارے میں
 سوچتا رہا۔ خدا معلوم کس حال میں رکھا ہو گا انہیں میر باز بھوک کا کچا ہے۔ وہ تو بہت
 پریشان ہو گا۔

میں کمرے میں ٹہلتا رہا۔ مشرقی پاکستان میں گزارا ہوا اپنا اچھا وقت یاد آ رہا تھا۔

گھومے جارہا تھا ایسا لگتا تھا، جیسے دھیرے دھیرے گدا فرش پر ڈوبتا جا رہا ہے۔ میں نے اُکراٹھنا چاہا۔ اٹھ نہ سکا لیٹ گیا۔

کب آنکھ کھلی، نہیں معلوم۔ آنکھ پوری طرح کھلی بھی نہیں تھی پھر بھی چھت نظر آئی کپڑے کی چھت اس پر شوخ رنگوں کے پھول جیسے ہوئے تھے۔ جنہاں تھیں۔ چھت مجھے اچھی لگی۔ جی چاہا کہ ہنسوں، ہنستا ہوں۔

پھر دیواروں پر نظر پڑی۔ طرح طرح کے کیلنڈر، تصویریں، جاپانی عورتوں کی تصویریں دنگل پہنے ہوئے، چھتری لیے ہوئے عورتیں، شیشے جڑے فریم میں ہیٹ لگے ہوئے انگریز، جن کی میسیں، پروں والی ٹوپیاں پہنے، شکار کرتے ہوئے گورے، چلاتے حبشی، ایک حبشی پر حملہ کرتا ہوا بر شیر مکالے حبشی کا بہتا ہوا سرخ خون۔ میں پریشان ہو کر تصویروں سے نظر ہٹائی پھر دیکھا تو بڑی بے شرمی کی ایک تصویر نظر آئی عورت کچھ نہیں پہنے ہوئے۔ کالی سینڈلیں اور گلے میں موتیوں کی مالا، بس اور عورت کی تصویر دانتوں سے پھول پکڑے ہوئے اور بس سینڈلیں بھی نہیں یہ کیا ہے؟

ریڈیو سیٹ پر، دیواروں پر، یہی تصویریں۔ کونے میں گراموفون باجا کر پھول کی شکل کا بڑا سا بھونپو۔ سامنے کتا بیٹھا ہوا۔

میں نے کروٹ بدل لی۔ بستر پر پھول، پھولوں کی تیز خوشبو سے چھینک آگئی کوئی پاس بیٹھا تھا۔ جس نے میرے ہاتھ میں ایک پھول پکڑا دیا۔ شیشے کا لمبا پھول چھت کے کپڑے کی چڑیوں پر میری نظر پڑی، بہت ہنسی آئی میں نے پھول چڑیوں کی طرف بڑھا دیا۔ تیز روشنی ہوئی پھول میں شبنم ہو گئی جو مجھ پر اور برابر میں اس لڑکی پر گری مگر شبنم میں بہت تیز بو تھی پھر زبردست روشنی کا ایک اور جھماکا ہوا اس سے بھی شبنم کی بو دور نہ ہوئی کوئی ہنس رہا تھا۔ شاید وہی لڑکی ہو گی۔

اس کے بعد اور کتنی دیر سوتا رہا نہیں معلوم۔ کروٹ بدلی تو لگا جیسے کہیں سر پر دماغ میں ہتھوڑے برس رہے ہیں۔

ایک لمبے سفید کوٹ والا آگے آیا۔ اس نے آلہ لگا کے دیکھا، آنکھیں چیر دیکھیں۔ کہنے لگا۔ ”آپریشن ہو گا۔“

”کس بات کا؟“ میں نے پوچھا، مگر میری زبان موٹی ہو رہی تھی۔ خود اپنی عجیب لگی۔

”زہر پھیل گیا ہے اور کس بات کا؟ باسی سالن کھلایا تھا تم نے آپریشن ہو گا۔“ مجھے اس وقت کوئی فکر نہیں تھی۔ ”ٹھیک ہے کر لو آپ رے شن۔“

”اس کاغذ پر دستخط کرو۔“ کوٹ والا بولا۔

میں نے موٹی زبان میں پوچھا۔ ”قاغذ قس..... کس بات کا؟“

”تمہاری اجازت سے آپریشن کریں گے۔ اسپتال ذمے داری نہیں لیتا اگر کچھ ہو گیا تو۔“

میری سمجھ میں یہ بات آگئی۔ ”اسپتال کہاں ہے؟“

سفید کوٹ والے نے دیواروں کی طرف، چھت اور فرش کی طرف ہاتھ پھیلا دیا۔ ”یہ ہے نا۔“

یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی، مگر سر بہت درد کرتا تھا۔ ”کر لو آپریشن، مگر میرے والد صاحب کہاں ہیں؟“

”باہر برآمدے میں۔“

”انہیں بلاؤ، پھر کرنا آپ رے شن۔“ ہاں یہ بات میں نے ٹھیک کہی۔

سفید کوٹ والا خفا ہو گیا۔ ”دستخط نہیں کرو گے تو ہم آپریشن نہیں کریں گے۔ مرنے جاؤ گے۔“

”اچھا۔“

”اٹھو۔“ کوٹ والے نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ ”اٹھو، یہاں دستخط کرو۔ جلدی، نہیں تو وہ لوگ برآمدے سے چلے جائیں گے۔“

”کون؟ میرے والد صاحب؟“

”ہاں۔“ کوٹ والے نے میرے ہاتھ میں قلم دے دیا اور سامنے بہت سے کاغذ رکھ دیے وہ کہتا۔ ”یہاں“ اور میں دستخط کر دیتا۔ ایک بار کہنے لگا۔ ”ہاتھ سنبھال کے۔ کیا کرتے ہو ہاں خوب سنبھال کے۔“

”اور کتنے کاغذ ہیں؟“ مجھے فکر تھی کہ والد صاحب باہر سے کہیں چلے نہ جائیں۔

”تنے قاغذ“ کتنے کاغذ اور ہیں۔ ”یہ تو بہت ہو گئے۔“ ”یہاں، یہاں اور یہاں۔“

وہ بولا۔ ”ریکارڈ کے لیے بھی ہے۔ پولیس کو کاپی جاتی ہے نا بھائی۔“

”ہاں۔ وہ تمہیں سو موہار کو لے گئے تھے سویرے آج سنی وار ہے۔ مطلب ابھی تورات ہے۔ دن میں سنی وار تھا۔ سنبڑ ہو گئے تپانچ دن سے اوپر؟“

”میرا سر چکرا گیا۔ غضب خدا کا۔ روپائی مجھے کچھ یاد نہیں۔“

”سوچو، کچھ کھبر ہے کہاں لے گئے تھے؟ مگر تمہیں تو یہ بھی مالم نہیں کہ کہاں لے گئے تھے۔“ اس نے یہ بات بہت دکھ سے کہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہیں معلوم ہے؟ کیا کہہ رہے تھے وہ لوگ؟“

”نہیں۔“ وہ بولی۔ ”بس اتنا مالم ہے موٹر میں لے گئے تھے۔ چارپائی جیسی کوئی سگری بیچ پڑا لے کے۔“

”اچھا خبر ہے کب لائے؟“

کہنے لگی۔ ”ابھی رات میں لائے ہوں گے۔ میں نے موٹر کی آواز سنی تھی۔ کیسے ہو تم؟“

”میں؟“

”ہاں تم۔ اب کیسے ہو؟“

”ویسے تو ٹھیک ہوں۔ پر روپائی! سمجھ میں نہیں آتا عجیب باتیں ہوئی ہیں۔“

”کیسی؟“

”میں سمجھتا تھا خواب دیکھ رہا ہوں۔ خواب نہیں تھے وہ۔“

”مطلب؟“

”مطلب‘ وہ باتیں اصل میں ہوئی ہوں گی۔ انہوں نے نشے کی دواؤں‘ انجکشنوں پر رکھا ہو گا مجھے۔“

”ہاں اور کیا پر کیسی باتیں ہوئیں۔“

”اتنا یاد ہے بہت سے کاغذوں پر دستخط کرائے تھے۔“

”دسکھٹ؟ کیوں؟“

”کیا معلوم۔“

”خبر نہیں کس چکر میں ہیں بد معاش۔ ہاں تم بولتے تھے بھوک لگی ہے۔“

”ہاں؟“

”بہت بھوکا ہوں روپا۔ میں تمہیں روپا کہوں؟“

”روپا بھی اچھا ہے ٹھہرو کچھ کرتی ہوں۔ ادھر تالا نہیں ڈالا انہوں نے تم نہیں

”اچھا۔“

”بس لیٹ جاؤ اب۔“ کوٹ والے نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ سر میں اندر ایسے لگا جیسے بھیجا شیشے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے مگر میں لیٹ چکا تھا۔

سفید کوٹ والے نے جاتے جاتے بازو میں سوئی چھو دی میں چیخا۔ ”کیا کرتے ہو؟“

کہنے لگا۔ ”آپریشن کر رہا ہوں۔ چپ چاپ لیٹے رہو۔“

بستر نیچے، نیچے اور نیچے فرش میں گرتا جا رہا تھا۔ گرتا جا رہا تھا۔ پسینے میں تر‘ کمزوری میں لرزتا ہوا اٹھا تو اپنے اسی خالی کمرے میں آکر گدے پر پڑا تھا۔ مجھے قید کرنے والوں نے رحم کھا کر کبل اوڑھا دیا تھا جو میں نے لاتیں مار مار کے گدے سے نیچے ننگے فرش پر سر کا دیا تھا۔

آدھے گھنٹے یا اس سے زیادہ پڑا اٹھنے کی ہمت کرتا رہا۔ آخر کوشش کر کے اٹھا۔ پانی تک پہنچنا پہاڑ سر کرنے کے برابر تھا۔ یہ پہاڑ بھی سر کیا۔ پانی پی کر طبیعت کو قرار آیا۔

توبہ توبہ میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا کیسے برے، بھیانک بے عقلی کے خواب تھے خدا معاف کرے۔ بخار اتر گیا تو اب بھوک لگ رہی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ میرے جیلر تو سویرے ہی آئیں گے جہی کچھ کھانے کو دیں گے۔

ہاں! وہ لڑکی! روپائی کے پاس اگر کچھ کھانے کو ہوا تو شاید۔ میں نے ایک بار دیوار تھپتھپائی۔ سنا تھا میں نے اسے پکارا۔ پہلے گدے پر سے آواز لگائی پھر ہمت کر کے روشن دان کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ لڑکی کا نام لے کر آواز دی۔

ہلکے سے جواب آیا۔ ”ہاں۔“

”روپائی! کچھ کھانے کو ہو گا تیرے پاس؟“

اس نے جواب نہیں دیا، پوچھا۔ ”آگئے؟“

”میں کہاں گیا تھا، بخار میں تھا۔“

”اس وقت بکھار ہے تمہیں؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”تم پانچ دن پیچھے واپس آئے ہو۔“

”پانچ دن!“ میں پریشان ہو گیا۔

”چھوٹا؟ تم کتنے برس بڑی ہو مجھ سے؟“

وہ بولی۔ ”میں سترہ کی ہوں لیکن.....“

”لیکن کیا؟ مجھ سے چھوٹی ہو تم۔ انا مجھے چھوٹا کہتی ہو۔ واہ وا!“ ”ہاں نا۔

چھوٹے ہو۔ کچھ دیکھا ہی نہیں تم نے۔“

”دیکھنا کیا تھا۔ میں گیسٹ ہاؤس چلا رہا ہوں۔ میرے باپ تو اپنی نوکری کرتے

تھے۔ شروع سے ہی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ کہتی ہو کچھ نہیں دیکھا۔“

وہ جیسے اصرار کرتی ہوئی بولی۔ ”نہیں دیکھا۔ لڑکے ہو‘ بڑے آدمی کے بیٹے

ہو۔ ماں ہیں‘ نوکر ہیں اور پیسا۔ کچھ بھی ہنکرتا نہیں ہے۔“

”ماں‘ نوکر‘ پیسا اس سے کیا ہے؟“

”ہے! تبھی کہہ رہی ہوں۔ جو تم لڑکی ہوتے‘ باپ بھائی نہیں ہوتے‘ پیسا

نہیں ہوتا۔ چودہ برس کی عمر میں ماں مر گئی ہوتی تو چودہ برس کی عمر میں تم ایک دم بڑھ

باتے۔ ایک رات میں..... تم بڑے ہو جاتے۔“ وہ بہت جوش میں بولتی گئی۔

”ایک رات میں.....“ میں سمجھ گیا اور اس کے لیے دکھی ہو گیا۔ کہنا کیا تھا مگر

ابھی میں نے کہا۔ ”ہاں بے سہارا ہو‘ لڑکی ہو تو مشکل..... بہت مشکل۔“

”مسکل؟ بہت مسکل؟ تم نہیں سمجھتے۔ انہوں نے‘ یہ جو ہیں‘ انہوں نے مجھے

رے محلے میں اٹھایا‘ کوئی کچھ نہیں بولا۔ نو دس آدمی ہیں۔ اب سب کا کھانا پکائی‘ پکڑے

ہوتی ہوں۔ روز رات میں‘ دن میں جب مر جی ہو کھینچ کے لے جاتے ہیں اور یہ پہلی بار

نہیں ہے۔ تین سال سے ایسا ہی ہے۔ ان سے پہلے دوسرے لوگ ان سے پہلے

سرے ادھری بھی‘ شہر‘ گاؤں میں بھی سب سکتی ماں‘ طاقت ور ہیں۔ پکڑ لے جاتے

ما۔ جب تک جی کرتا ہے رکھتے ہیں۔ جی بھر جاتا ہے دوسرے کے ساتھ کر دیتے

ما۔“ وہ بکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

خدا لیا! یہ کیا ذکر چھیڑ دیا تھا میں نے؟ بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ کیسے چپ

وں؟ کیا تسلی دوں؟

مگر وہ خود ہی چپ ہو گئی۔

میں نے کہا۔ ”دکھ ہوا یہ سب سن کے۔“

”ارے سب چلتا ہے۔ تم دکھی مت ہو۔ سال پیچھے کسی کو سنا کے روئی ہوں۔

ٹھیک ہوں۔“

تھے اس لیے۔ اچھا رسوئی جاتی ہوں۔ کوئی سادھن کوئی طریقہ کرتی ہوں۔“ اور پھر خاموشی۔ وہ چلی گئی ہوگی۔

اس نے بہت دیر انتظار کر لیا۔ میں تو بستر پر آ کے پڑ گیا تھا۔ آخر وہ آئی۔ دیوار تھپتھپائی اس نے۔

”ہاں۔“ میں روشن دان کے نیچے پہنچ گیا۔

”لو۔“ اس نے ڈوری میں بندھا پکٹ اچھالا جو ادھر کمرے میں لٹک آیا۔ پکٹ

گرم تھا‘ وہ بیٹھا ڈال کے روٹی بنالائی تھی۔ اچار کا ایک ٹکڑا ساتھ تھا۔

میں نے کہا۔ ”واہ! یہ میرے مطلب کی چیز لائی ہو۔“

وہ بولی۔ ”دل بہلانے کو کہہ رہے ہو۔ جو ملا بنالائی۔ جتنا پکتا ہے سب کھا جاتے

ہیں کچھ نہیں چھوڑتے۔ مرے مردار!“

مگر سچ بات تھی مجھے تو اچار سے میٹھی روٹی کھانا اچھا لگ رہا تھا۔ کھا کر میں

روشن دان کے نیچے جا بیٹھا۔ دیوار سے ٹیک لگائی۔ ”روپا! مجھ سے باتیں کرو۔“

”باتیں؟ تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

میں نے اپنا نام بتا دیا۔ گیسٹ ہاؤس کا اور گھر والوں کا مغربی پاکستان جانے کا بھی

بتا دیا۔

وہ ہنس کر بولی۔ ”جو اگر وہ مکان..... تمہارا ہوٹل ابھی تمہارے پاس ہوتا تو

میں یہاں سے بھاگ جاتی۔ ادھر تمہارے پاس کھانا پکانے کی نوکری کر لیتی۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی تک میرے ہی پاس ہے ہوٹل..... مطلب پکڑے جانے

تک میرے ہی پاس تھا۔ چلو میرے ساتھ نکل بھاگو۔ میں تمہیں کچن کا

انچارج..... مطلب رسوئی کا پورا اگوا بنا دوں گا۔ کھانے پکوانا‘ حکم چلانا۔“

”حکم!“ وہ پھیکے پن سے ہنسی۔ ”کس پہ حکم چلاؤں؟“

میں نے کہا۔ ”سب پر۔“

وہ اب کے شاید کڑوے پن سے ہنسی تھی یا اس نے سسکی لی تھی۔

”ایسے کیوں ہنستی ہو؟“

”تمہاری عمر کتنی ہے؟“

”اٹھارہ کا ہوں۔“ میں نے زیادہ ہی عمر بتائی۔

”چھوٹے ہونا ابھی۔“

”وہ اس سالے سے مار پیٹ کر کے جو پوچھ لیں گے۔“
 ”نہیں بتائے گا۔ کوئی مرد ایسا بات نہیں بتا سکتا۔“
 ”کیا مطلب؟“

”میں نے بات وہ کہی کی دونوں لڑ پڑے۔ پر ایک نے دوسرے کو بتائی نہیں۔
 چپ کھاموسی کی بات ہے۔“
 ”میں نے بیزاری سے کہا۔“ خبر کیا کہہ رہی ہے۔“
 ”اسی لیے کہا تھا سیر کھان بابو! ابھی چھوٹے ہو۔“
 ”چل پھر وہی سب مت شروع کر۔ جاسو جا۔“
 ”کھفا ہو گیا؟“

”نہیں نہیں..... خفا ناراض کچھ نہیں ہوں۔ سوچتا ہوں تو پھر نہ روکنے لگے۔
 اس لیے یہ وہ سب باتیں چھوڑ۔ اب سو جا۔ میں بھی تھک گیا ہوں۔“
 وہ بڑبڑائی۔ ”دوائی کا چکر ہوئے گا۔ پتا نہیں کیسی کیسی دوائیں دی ہوں گی۔ جا“
 سو جا سیر کھان دوس! میں ہنس پڑا۔ ”دیکھا آخر تو نے دوست کہا نا۔ ابھی کہہ رہی تھی دوست کا پتا
 نہیں۔“

”وہ بھی ہنسی۔“ وہ تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ جو ٹھہ۔“
 صبح دن چڑھے جب خوب دھوپ نکل آئی، دو آدمی، دو نئے آدمی ناشتا لائے۔
 آج نہ معلوم کیوں انہوں نے ناشتے میں مجھے انڈے دیے تھے۔ موٹی گھی لگی روٹی تھی۔
 مگر بھر کے چائے بھی لائے تھے۔ میں نے ایک سے پوچھا۔ ”اس میں بے ہوشی کی دوا ملا
 کے لایا ہے، کیوں رے؟“
 وہ مسکرایا۔ ”نہیں رے؟“
 ”اچھا؟ تو اب کیا ہے؟“

دوسرے نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ”اب کچھ نہیں دس منٹ کا ٹائم ہے
 تمہارے پاس۔ کھانا ہے تو کھاؤ۔ نہیں تو ہم ٹائم سے واپس لے جائیں گے۔“
 میں نے پہلے والے سے جیسے رازداری سے کہا۔ ”یہ بڑا کڑک ہے بھائی۔“
 میں ناشتا کرتا رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے دور کھڑے رہے یوں جیسے ان کا
 آپس میں کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

”سنو روپا! میرا نہیں معلوم کیا ہوتا ہے آگے لیکن اگر زندہ رہا تو
 بھولوں گا نہیں۔“

”کون بات؟“
 ”یہ بات کہ روپالی بہت مصیبت میں ہے۔“
 ”تاں ناں۔ مصیبت تو سیر کھاں! اتنی دیر کی تھی جتنی دیر تمہیں سلا
 ٹھیک ہوں۔ پرواہ نہیں۔ کچی ہو گئی ہوں۔ ان حرامیوں سے بدلہ بھی چکا لیتی ہوں
 تو۔“

”بدلہ چکا لیتی ہو؟ کیسے؟“
 ”ادھر ابھی دو کو لڑوا دیا نا۔ ایک نے ایک کے چھری ماری۔ موٹر ادم
 لے کر آئی ادھر اس کو لے کے گئی۔ بچے گا نہیں۔ گردن کی نس کٹ گئی ہے۔“
 ”کس طرح لڑوا یا؟“
 ”بس لڑوا دیا۔“
 ”بتانا کیسے لڑوا یا۔ کیا کیا؟“
 ”نہیں بتاؤں گی۔“

”روپا! یہ کیا بات ہے! دوست نہیں ہیں ہم۔“
 ”دوس کا تو پتا نہیں پر بتاؤں گی نہیں۔ بے سرمی کی بات ہے تجھے تو
 نہیں بتاؤں گی۔“

”اچھا رہنے دے پھر۔“
 ”برا کیوں مانتا ہے بس کھتم کر۔“
 ”اچھا ختم۔ وہ جس نے چھری ماری تھی کہاں ہے؟“
 ”ادھر ہی۔ اسے بند کر دیا ہے۔ آگے کار ستادیکھ رہے ہیں۔“
 ”کس کا۔“

”وہ جو ان کا بڑا ہے وہ آگے مہیسلہ کرے گا۔“
 ”اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ روپالی کی وجہ سے جھگڑا ہوا ہے تو برا حال کر

تیرا۔“
 وہ ہنسی۔ ”اور کیا برا کریں گے حرامی۔ ویسے کسی کو نہیں مالم ہو گا کہ
 مطلب جھگڑا۔ کس وجہ سے ہوا۔“

سے کہے ہوئے ایک ہلکے ہلکے وعدے کی تو حیثیت ہی کچھ نہیں۔ مجھے تو گھر والوں سے ملنے کا گیسٹ ہاؤس پہنچنے کا بھی انتظار تھا اور امید تھی۔
ملوں گا سب سے اگر زندہ رہا تو گیسٹ ہاؤس بھی دیکھوں گا..... اگر زندہ رہا

تو۔

دو دن بعد شام کو باز لر آگیا۔
وہ آتے ہی کرسی پر ایسے بیٹھ گیا جیسے بہت تھکا ہوا ہو لیکن کامیاب و کامران آیا تھا۔ کہنے لگا۔ ”جان بچ گئی تمہاری۔“
”کس طرح؟“

”سب کام میری مرضی کے ہو گئے۔“

”اگر مرضی کے نہ ہوتے سب کام تب؟“

”تب تمہارا مرڈر کرنا پڑتا۔ سمجھتے ہو؟ قتل۔“

میں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ کابلی سے آدمی آنکھیں کھولے اس کی صورت ٹکا کیا۔

”مذاق سمجھ رہے ہو میری بات؟“ اس نے یہ جملہ دانت پیٹتے ہوئے کہا تھا۔

”مذاق کیوں سمجھوں گا۔ تمہارے میرے بیچ ایسا کوئی سلسلہ ہی نہیں ہے۔“

”ہو بھی نہیں سکتا۔“

”ہاں بچ کہہ رہے ہو۔“

”مرڈر تو تمہارا دس بار ہو چکا ہو تا مگر میں نے معافی دے دی۔ تم نے ابھی تک ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ نہ یہ سوال تھا نہ بیان بس ایک لفظ تھا۔

باز لر کا چہرہ غصے سے ست سا گیا۔ اس نے کرسی پر پہلو بدلا۔ وہ جس طرح ڈراما

تیار کر کے لایا تھا سب کچھ اس طرح نہیں ہو رہا تھا اس لیے مایوسی میں وہ چڑچڑانے لگا تھا۔

”تجھے ابھی خبر نہیں ہے کہ تو کتنے بڑے خطرے میں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تجھے تو یہ بھی خبر نہیں ہے کہ بیر کا پچھایا کدھر ہوتا ہے۔“

وہ منہ بگاڑ کر چیخا۔ ”حرام زادے میں تجھے۔“

میں نے اسے بات پوری نہ کرنے دی۔ پشتو میں اسے بڑی بھاری گالی دی پھر

اس کا بگڑا زبان میں ترجمہ کر دیا۔ باز لر تمللا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بیلٹ میں ہاتھ ڈال

میں نے اچانک پوچھا۔ ”باز لر آیا ہے؟“

کلائی کی گھڑی والے نے پوچھا۔ ”کون باز لر؟“

”بزل الرحمن۔“

وہ منہ سکیر کر بولا۔ ”ادھر باز لر، بزل الرحمن کوئی نہیں۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ٹھیک! اس سے کہہ دینا، باز لر سے کہ اب تو نہیں ہے۔“

فش۔ ختم!“

دو دن انہوں نے میرا بڑا خیال رکھا۔ ٹھیک ٹھاک کھانے پینے کو لاتے۔ رات

میں باہر ٹھلانے لے جاتے۔ کمرے میں روشنی بھی کرنے لگے۔ ایک چادر تکیہ دے دیا۔

دن میں کمرے میں ایک کرسی بھی ڈالنے لگے اور تو اور ایک مرتبہ آئے تو میرے لیے

صاف کیا ہوا اناس چھوڑ گئے۔

حیرت ہوئی مگر میں نے زیادہ کچھ پروا نہیں کی۔

ان دو دنوں میں روپالی سے بس ایک دفعہ میں کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ باقی کبھی وہ

نہ ہوتی، کبھی میں سو رہا ہوتا یا پھر باہر ہوتا۔

میں نے محسوس کیا روپالی میں غصہ اور کڑوا پن کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے مجھے

ایک گیت سنایا۔ دھیرے دھیرے لوری کی طرح گارہی تھی۔ سریلی تھی اس کی آواز۔ میں

نے تعریف کی تو بولی۔ ”ماں زندہ تھی جب گاتی تھی۔ پھر اب گایا ہے اتنے دن بعد۔“

یہ دو دن میرے لیے آسان تھے۔ شاید روپالی کے لیے بھی آسان ہوں گے۔

مگر وہ بتا رہی تھی کہ کام بہت ہے یہ لوگ کمروں کی صفائی کر رہے ہیں۔ مجھے جو ٹھلانے

لے گئے تھے اس کی وجہ بھی شاید یہی تھی۔ روپالی نے میرا کمرہ صاف کیا تھا۔ گدے کے

نیچے ایک پھول رکھ گئی تھی۔ وہ گیندے کا پیلا پھول۔ عجیب بات کہتی تھی۔ خیر میں

چھوٹی تھی تو ایسے پیلے پھول درگے پہ چڑھاتی تھی۔ میں نے کہا درگے کیا ہے؟ تو بولی۔

تم فدر گے نہیں سمجھتے؟ میں سمجھا درگامائی کا کہہ رہی ہے۔

کہنے لگی۔ ”نہیں درگے ہے درگے۔ آس تانہ فکیر کا۔“ اوہ۔ کوئی درگاہ ہوگی۔

میں نے کہا زندہ رہا تو تیرے ساتھ دیکھنے جاؤں گا کہ کس کا آستانہ، کیسی درگاہ ہے۔ لے

جاؤں گا تجھے وچن رہا میرا۔

زندہ رہا تو..... آدمی کی سبھی چیزیں زندگی سے مشروط ہیں۔ کیسی سبک فم

پائیدار چیز سے ہم اپنی ہر امنگ، ہر خوشی، اپنا ہر خواب الجھا لیتے ہیں۔ اس بے چاری لڑکی

چچا میرے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا مگر اب جو آگیا تھا تو بار بار ایک ہاتھ کی مٹھی دوسرے کی ہتھیلی میں مار مار کر اپنا غصہ خرچ کر رہا تھا۔
میں نے اس موٹے منافق کو پہلے سلام کیا۔ ”السلام علیکم انکل۔“ وہ مجھے گھور کے دیکھے جا رہا تھا۔
”انکل یہ باز لر بالکل بے وقوف ہے۔ پہلے گیٹ ہاؤس پر پولیس لے کے آیا۔ اب یہاں آپ کے ”مہمان“ پر گولی چلا رہا ہے۔ گدھا کہیں کا۔“

نیا مالک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ پورے ایک منٹ مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”دیکھو جی۔ بچوں کا کھیل نہیں ہو رہا۔ بہت سی چیزیں داؤ پر لگی ہیں۔ سب سے پہلے تو تمہاری جان ہی ہے۔ دیکھا تم نے؟ تجھے انچ قریب سے موت گزری ہے۔ اب تمہیں یہ سب بکواس اور یہ لونڈا اپن بند کر دینا چاہیے۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ غور سے سننا اور سمجھنا چاہیے۔ شیر علی۔ تم پڑھے لکھے لڑکے ہو۔ صوبہ سرحد سے ویسے ہی چادر لپیٹے نہیں نکل پڑے۔ عمر کم ہے مگر دنیا کی سمجھ ہے تمہیں۔ اب سنو۔ تم سے جو ہمیں کام لینا تھا وہ لیا جا چکا۔ ہم خاموشی سے تمہیں مار کے اور یہیں گارڈاب کے چلے جاتے یا لاش کو آگ لگا دیتے یہ زیادہ آسان اور محفوظ طریقہ تھا مگر بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ میں ذاتی طور پر کچھ انسان بھی ہوں۔“

”یقیناً انکل۔ کچھ نہیں کافی زیادہ انسان ہیں آپ‘ اگر آپ نہ آتے تو باز لر دوسرے کی گولی ٹپلا دیتا۔ مشکل تھا میرا بچنا۔“

اس نے رساں سے کہا۔ ”پہلی بات‘ مجھے انکل کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سچ بولتے رہو گے اور لہجہ طنز کا رکھو گے تو میں خفا نہیں ہوں گا۔ تمہارا راشن آدھا کر دوں گا۔ مہینہ بھر میں یہ چمک دک جو ہے تا سب۔“ اس نے ایک بے ہودہ بات کہی۔ ”سب۔۔۔ کے رستے سے نکل جائے گی۔“

یہ سیریس آدمی تھا۔ میں نے خود سے کہا شیر علی خان‘ دھیمبا بد معاش جذباتی بد معاش سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ زبان کو اب قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اس حقیقی خطرے کا احساس تھا جس میں پہلے ہی دن سے میں گرفتار تھا۔ واقعی مقدر اچھا تھا جو میں بچتا رہا ورنہ مجھے تو کبھی کا ختم ہو جانا چاہیے تھا۔

زمانہ شناس چچا نے میرے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے‘ وہ سمجھ گیا کہ خطرہ مجھے نظر آنے لگا ہے۔ اس کا لہجہ اور دھیمبا ہو گیا۔ توانائی ضائع کرنے کی اب ضرورت کیا

کر اپنا پستول نکال لیا۔ ”ابھی گولی مار کر ختم کر دوں گا۔“
میں ہنسنے لگا۔

باز لر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنسنا اس وقت بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں جانتا تھا نہ وہ فائر کرے گا نہ اتنی جلدی اپنے غصے کو ٹھنڈا ہونے دے گا۔ کچھ دیر یہ سین اسی طرح آگے گھسیٹے گا۔

مگر ابھی مجھے زندگی سے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں بے بسی کی ایک لہری آئی۔ میں اگر اسی وقت ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیتا تو وہ نہ ہوتا جو ہوا۔

باز لر کی آنکھوں میں بے بسی کی لہر جو آئی تو یہ اس آدمی کی حد تھی یعنی وہ پوائنٹ جہاں وہ ٹوٹ سکتا تھا۔ میں ایک چھوٹی عمر کا قابو کیا ہوا نوجوان اسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتا رہا اور طنز کرتا رہا۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ باز لر نے ہاتھ میں لیے ہوئے پستول کو ایک جنبش میں فائر کے لیے تیار کیا اور فائر کر دیا۔

ہتھیاروں کی اتنی سمجھ نہ ہوتی مجھے تو میں ختم ہو گیا ہوتا۔ اس کی پہلی جنبش سے میرے بدن نے غیر ارادی طور پر ایک طرف رول کرنے کی پوزیشن بنائی اور جس وقت فائر ہوا میں رول کر چکا تھا۔ ایک فٹ اوپر دیوار میں گولی لگی‘ پلستر اکھڑ گیا۔ خود باز لر کا منہ حیرت میں آدھا کھلا رہ گیا۔ اسے اپنے عمل یا میرے رد عمل دونوں میں سے کسی ایک پر حیرت تھی۔

دروازہ جیسے ٹوٹ کر اندر گرا اور بھاری بدن والا ایک آدمی بنگالی میں یہ کہا ہوا کہ ”کیا کرتا ہے۔“ کمرے میں گھس آیا۔

کمرے میں گھس آنے والا موٹا آدمی باز لر کا چچا تھا۔ وہی جس سے والد صاحب نے گیٹ ہاؤس کا سودا کیا تھا۔ جو گیٹ ہاؤس میں پولیس آنے کے دوسرے دن میرے پاس آیا تھا اور بڑی نیکی سے معذرت اور بھیجتے باز لر کی شکایت کر رہا تھا۔

چچا نے آتے ہی مجھے دیکھا۔ میں زندہ تھا۔ پھر اس نے بھیجتے کو گالی دی اور حکم دیا کہ وہ پستول لے اور دفع ہو جائے۔

باز لر چچا کے آنے سے کھینچا گیا تھا۔ اس نے پستول دوبارہ بیلٹ میں لگا لیا اور سر جھکا کر فرش پر جیسے چلے ہوئے کارٹوس کا خول تلاش کرنے لگا۔ وہ مجھ سے دور چلا گیا تھا۔

تھی؟

بولا۔ ”شیر علی اصل مشکل کام ہم نے کر لیا ہے یعنی تمہارے باپ صمد بخش کے سامنے ہم تصویری، تحریری اور زبانی شہادتیں ثبوت پیش کر کے انہیں قائل کر سکتے ہیں کہ ان کا بیٹا شیر علی نالائق نکل گیا۔ اس نے گیسٹ ہاؤس کی بقیہ رقم یعنی وہ ڈیڑھ لاکھ مجھ سے تھوڑے تھوڑے کر کے نقد وصول کر لیے۔ جی ہاں، رسیدیں ہیں میرے پاس۔ لڑکے۔ تمہارے باپ تم سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے ایک طرح دوستی سی ہے تم دونوں میں اور وہ مزاج پہچانتے ہیں تمہارا۔ سوچیں گے اور ظاہر ہے مجھ سے رائے لیں گے، پوچھیں گے کہ سلسل چوہدری صاحب۔۔۔ میرا اصل نام سلسل چوہدری ہے، تو وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ یار، سترہ برس کے ایک لڑکے کو ڈیڑھ لاکھ روپے کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟ کہاں خرچ کر دیے اس نے یہ پیسے؟ قدرتی بات ہے۔

میں کہوں گا۔ ”میں خود چکرارہا ہوں۔“ اس لیے تو بلایا ہے آپ کو اور میں حل سوچوں گا تو یہ دکھاؤں گا کہ جیسے بہت بھاگ دوڑ اور محنت کر رہا ہوں۔ اپنی رقم خرچ کر رہا ہوں۔ پھر دس بیس روز کی محنت کے بعد میں یہ تصویریں پیدا کروں گا اور تمہارے باپ صمد بخش کو دکھاؤں گا کہ ڈیڑھ لاکھ روپے صاحب زادے نے یہاں خرچ کیے ہیں۔ یہ کہہ کر چوہدری نے کرسی کے پاس پڑا براؤن لفافہ اٹھایا اور بہت سے تصویروں کے انٹارجنٹ گدے پر میرے سامنے ڈال دیے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر تصویریں اٹھالیں اور پھر میں جو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا گھبرا کر سیدھا ہو بیٹھا۔ ”غضب خدا کا۔ کیا ہے یہ؟“ او میں نے پشتوں میں جو گل افشائیاں کیں وہ اب دہرا نہیں سکتا۔ مونا سلسل چوہدری چہرہ سخت کیے خاموش بیٹھا رہا۔

میں نے تصویروں پر ہاتھ مار پر پوچھا۔ ”کیا ہے یہ؟“ کہنے لگا۔ ”جو تمہیں نظر آرہا ہے ایسی اور بھی تصویریں ہیں لڑکے۔ پھر گواہی دینے والے موجود ہیں جنہوں نے تم دونوں لڑکا لڑکی کو۔۔۔ ظاہر ہے پورے کپڑے پہنے۔۔۔ بازاروں، ہوٹلوں میں ساتھ دیکھا ہے۔ یہ کمرہ تمہیں کرائے پر دینے والا موجود ہے۔ رسیدیں کرایہ نامہ سب ہے۔“

کمرہ جس کا وہ ذکر کر رہا تھا میرا دیکھا ہوا تھا۔ میں نے خواب میں نہیں دیکھا تھا وہ کمرہ۔ میں خود اس کمرے میں موجود تھا۔ تصویریں بتا رہی تھیں میں اس بستر پر تھا، ہنسا

تہیجے لگاتا ہوا، میں اور لڑکی جسے میں اب پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

ہم دونوں کم سے کم لباس میں تھے۔ بعض تصویروں میں تو وہ کم سے کم لباس بھی نہیں تھا۔ کہیں میرے ہاتھ میں شیشے کا لمبا سا جام تھا، شراب سی چھلکاتا ہوا۔ ہم دونوں پر چھلکتا ہوا۔ میں اور وہ اجنبی لڑکی، عورت وہ جو بھی تھی ایک ایسے بستر پر موجود تھے جس پر پھول بکھیرے گئے تھے۔ یاد آیا۔۔۔ پھولوں کی تیز خوشبو سے چھینک آ گئی تھی۔

میں روہانسا ہو گیا۔ یہ پھولوں کا ڈھیر۔ میرے عالی ظرف خاندان کی عزت اور نیک نامی کی قبر پر پڑا تھا یہ ڈھیر۔

یہ کمرہ۔۔۔ ان تصویروں کی مدد سے، نشہ آور دواؤں سے دھندلائی ہوئی میری یادداشت کے پارے سے دھیرے دھیرے برآمد ہو رہا تھا۔

ہاں ٹھیک تو ہے۔۔۔ دیواروں پر گوروں اور میموں کی تصویروں کے ساتھ وہ تصویریں بھی تھیں جن میں کچھ نہ پہنے ہوئے عورتیں کہیں دانتوں میں پھول دبائے تھیں اور کہیں موتیوں کی مالا میں اور وہ سیاہ سینڈل والی عورت۔ کہیں مرد کے ساتھ بھی عورت تھی۔

یہ وہ کمرہ تھا جہاں دھندلی یادداشت میں ایک سفید لمبے سے کوٹ والا آدمی آیا تھا، مجھ سے دستخط لے رہا تھا۔ کہتا تھا ”ہم تیرا آپریشن کریں گے۔“ اور کہتا تھا۔ ”باہر برآمدے میں تیرے والد صاحب بیٹھے ہیں۔“

خدا یا۔ یہ کون سا شیطانی جال بچھایا گیا ہے؟

میں گلوگیر آواز میں پکار اٹھا۔ ”بابا۔ بابا۔ ہاتھ تھا منامیرا“ پھنس گیا ہوں بابا۔ ”ہاں ٹھیک ہے۔“ سلسل چوہدری تعریفی انداز میں بڑبڑایا، پھر بولا۔ ”اپنی عمر جتنا رہنا چاہیے آدمی کو۔ ضرورت سے زیادہ چالاک بننا یا دلیری دکھانا، جو اب تک تم دکھاتے رہے وہ بے وقوفی ہے۔ سترہ برس کے لڑکے ہو۔ کھاؤ، پیو، کھیلو ہمارے پاس رہو۔ تم سے کوئی کام نہیں لیں گے۔ یہ تصویریں دیکھ لیں۔۔۔ کہو گے تو اسی لڑکی کو یہاں بلا لیں گے، تمہارے لیے۔“

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا، دل میں صرف ایک لفظ کہا ”دلا“ اور اپنا سر جھکائے رکھا۔ اگر اس سے آنکھ مل جاتی تو وہ دیکھ لیتا کہ میں آنکھوں سے بھی لفظ اس تک پہنچا سکتا ہوں۔

سے لے کر ابھی اس کے چچا کے ظاہر ہونے تک جو بھی ہو چکا تھا اپنے ذہن میں دہرایا۔ کچھ نہ کچھ بہتر ہو جائے گا۔

حالات بے شک خراب ہیں مگر بہت زیادہ خراب نہیں ہیں۔ رات میں ادھر سلسیل چوہدری کے آدمی کھانا کھلا کے نکلے ہوں گے کہ روپالی نے دیوار تھپتھپا کے اشارہ دیا۔ میں تیزی سے روشن دان کے نیچے پہنچا۔ ”شش“ میں نے سرگوشی کی۔

”شور نہیں۔“ ابھی وہ لوگ برآمدے میں ہوں گے۔ ڈر تھا کہیں یہ آوازیں نہ

سن لیں۔

وہ بولی۔ ”پرسن مت ہو آج ان لوگوں سے کھڑے نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے؟“

روپالی ہنسی۔ ”داروپی ہے سب حرامیوں نے۔“

”اچھا؟ روز نہیں پیتے؟“

”روح کسے ملتی ہے وہ آیا تھا موٹا۔۔۔ وہ دے گیا ہے۔“ روپالی شاید منہ پر

ہاتھ رکھ کے ہنسی ہو گی۔ ”کھکھ کھی۔۔۔ ایک عورت بھی لایا ہے ادھر کے لیے۔“

”کیسی عورت؟“

”جیسی ہوتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

ہنس کر بولی۔ ”کھوب تیار عورت ہے۔۔۔ ہاتھ پیروں کی اچھی۔“

میں نے لاعلمی کی سادگی میں کہا۔ ”چل تیرا کام ہلکا ہو جائے گا۔“

وہ بولی۔ ”ہاں ابھی اس کی ڈبل روٹی لگ رہی ہے۔ سارے سو روپی پی کے ادھر

جار ہے ہیں۔“

اوہ۔ میں نے سوچا اس چوہدری کو میں نے اپنے دل میں جو کہا سمجھا وہی

ہے۔ نوکروں تک کے لیے شراب اور عورت لاتا ہے۔۔۔ دلال نہیں تو۔۔۔ یہ گیسٹ

ہاؤس نہیں چکا چلائے گا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”آج مجھے پتا چل گیا انہوں نے کیوں پکڑا ہے اور کس بات کے دستخط کرائے

ہیں۔“

مجھے سر جھکا کے بیٹھے دیکھ کر وہ بولا۔ ”تم سوچتے ہو گے کہ کیا ہم نے یہ سارا پاکھنڈ صرف ڈیڑھ لاکھ روپے کے لیے رچایا ہے؟ یعنی تمہارے فرار کی خبر سن کر تمہارا باپ یہاں آئے گا اور ہم اس سے کہیں گے کہ حساب صاف ہو گیا۔ بیٹا ڈیڑھ لاکھ لے چکا۔ گیسٹ ہاؤس اب ہمارے حوالے کر دو اور چلتے بنو۔ نہیں شیر علی۔ ڈیڑھ لاکھ کوئی رقم ہی نہیں ہوتی۔ اس کے لیے کوئی اتنا لمبا چکر نہیں ڈالتا۔ اصل میں ہم تمہارے باپ کو ادھر بلارہے ہیں۔ بہت کام ہے ان سے۔“

میں نے سادگی سے سوال کیا، ”اگر کام تھا تو جانے کیوں دیا۔ یہیں روک

لیتے۔“

وہ ہنسا۔ ”کام کا ایک حصہ یہ تھا کہ وہاں جائیں۔ دوسرا حصہ یہ ہے کہ وہاں

سے اب لوٹ کے آجائیں۔“

میں نے کہا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

بولا۔ ”تمہیں سمجھانا بھی نہیں ہے۔ جتنا بتا دیا اتنا کافی ہے۔ تمہارے باپ آ

جائیں گے تو ہم تمہیں خبر کر دیں گے اور جو جو ہوتا رہے گا بتاتے رہیں گے۔ تم یہاں

ٹھیک سے رہو۔ چارپائی ڈلوادیں گے پڑھنے کو کچھ پہنچ جایا کرے گا۔ اردو انگریزی کا

تو مشکل ہے بنگلہ ہی پڑھنے کو ملے گی، خیر یہ تمہارے لیے پراہم نہیں ہے۔۔۔ کھانے

میں کوئی خاص چیز مانگو گے یہ لوگ دیں گے۔ ان سے کوئی شکایت ہو تو اگلی بار جب میں

آؤں کہہ دینا۔ شکایت دور ہو جائے گی اور یہ بزل الرحمن یہ اب ادھر نہیں آئے گا۔

ٹھیک۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ سلسیل چوہدری نے گدے پر سے

تصویریں اٹھائیں، لفافے میں ڈالیں اور میری طرف دیکھے بغیر وہ بھی نکل گیا۔ باہر سے

بولٹ لگانے۔ تالا ڈالنے کی آواز آئی اور دور ہوتے قدموں کی چاپ سنائی دی پھر سنا ہوا

گیا۔

میرے بابا نے سکھایا تھا کہ ہر معاملے میں پر امید رہنا چاہیے اور اس کے ساتھ

ہی برے سے برے حالات کے لیے تیار بھی رہنا چاہیے پھر اگر ان حالات کا سامنا کرنا

پڑے کام سدھر جائیں تو شکر واجب ہے۔ وہ شروع ہی سے کہتے رہے تھے کہ بیٹے اگر اس

سادہ دیہاتی ترکیب سے دن گزارو گے تو دل طاقتور رہے گا جو بڑی بات ہے۔

دونوں چچا جیتے چلے گئے تو میں نے بوڑھے مداری کی جھونپڑی پر بازار کے حملے

کو

”چندل؟“

”ارے ہاں تا جسے صندل بولتے ہیں۔ اور چڑیا بھی سارنگ ہے اور

عورت۔ عورت جیسے تیرے کو؟“

”بالکل ہی کھوپڑی الٹی ہوئی ہے تیری۔“

آہستہ سے بولی۔ ”سیر کھان۔ کھوپڑی پھر ادی میری۔ سچ بولتی ہوں۔“

”کیا؟“ میں نے ذرا تیز آواز میں پوچھا۔

”بولی۔“ کچھ نہیں۔ سو جا۔“

میں نے کتنی بار آواز دی اس نے جواب نہیں دیا۔ بہت دیر بعد شاید گھنٹہ بھر بعد مجھے وہم سا ہوا کہ دیوار کے اس طرف کوئی سسکیاں لے رہا ہے۔

مگر وہم ہی تھا۔ میں نے سوچا سو گئی یا سونے کی کوشش کرتی ہو گی۔

وہ لوگ اسے لے کے سویرے ہی نکل گئے۔ میں دن بھر آہٹ لیتا رہا۔ دیوار کے ادھر کوئی نہیں تھا۔

سورج ڈوبے پر اس نے دیوار تھپتھپائی۔ میں نے پوچھا۔ ”ہاں؟ ہو آئی بازار؟“

بولی۔ ”ہو آئی۔“

پوچھا۔ ”اچھی لگی ہو گی آزادی؟“

”آزادی؟“

خیال ہی نہیں کیا تھا غلط لفظ کہہ گیا تھا۔ جلدی سے بولا۔ ”ہاں، باہر نکلنا۔“

کیسا لگا؟

”اچھا بھی لگا۔ رونا بھی آیا۔“

”کیوں؟ رونا کیوں؟“

”سبھی ہشتے بولتے، روتے گاتے، باتیں کرتے لوگ ادھر اپنی مرجی سے آئے

تھے، مرجی سے جا رہے تھے۔ پوری بھڑ میں ایک میں ہی سمجھو ہاتھ پیر بندھی چل رہی

تھی۔ میرے ساتھ ادھر ادھر ٹانگ سے ٹانگ بھڑائے سر پے سوار وہ چار حرام کے جنے

بات بات پر کمر میں ٹھونگ مارتے تھے۔ یہ کیا لے رہی ہے۔ ادھر کیا دیکھ رہی ہے۔ تو چپ

رہ ہم بات کریں گے۔ کتے نہیں تو۔ پر میں نے بھی سیر کھان۔ کچھ کر ہی لیا۔“

”کیا؟“

”کس بات کے؟“

”میرے بابا کو بلوانے کے لیے جعل سازی کی ہے۔“

”کیوں بلوائے گا؟“

”معلوم نہیں مگر موٹا کہہ رہا تھا انہیں ادھر سے صوبہ سرحد بھیجنا تھا اس لیے

انہیں جانے دیا پھر واپس بلانا ہے۔ میری خبر سن کر وہ آجائیں گے۔“

”کیا پتا کیا کر رہے ہیں کتے۔ ابے سیر کھان۔“

”ہوں۔“

”کل سیرے یہ لوگ میرے کو بجا ساتھ لے جان گے۔“

”بازار؟ تجھے بازار نہیں لے جاتے تھے؟“

”ناں۔ ابھی سب سودا ہتھم ہو گیا۔ میرے سے بولے کیا لانا ہے بتا؟ میں نے

کہا لو سنو، میں بولتی ہوں تم یاد کرو بجا تک یاد کرتے جانا ڈھائی سو پیسہ جیٹے ہیں، لے

آنا۔ ہا۔ ہا۔“ وہ تہقہ مار کے ہنسی۔ ”ان لوگ کو پڑھنا آتا، نہیں مجھے لکھنا آتا۔“

میں نے ایسے ہی پوچھا۔ ”روپا بازار جا رہی ہے، کیا لائے گی میرے لیے؟“

کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ”سارنگ۔“

”سارنگ کیا؟“

بولی۔ ”چیچ۔“

”کیا سب چیز؟“

”سنو۔ سارنگ بولتے ہیں جب کسی اپنے کو کچھ دینا ہو دے اور سمجھ نہیں

آوے کی کیا دے۔ جی کرے اس دنیا، سنسار کی، ملک کی، سبھی چیچ دے دیو۔ تبھی بولتے

ہیں کی تیرے لیے سارنگ لاؤں گا۔“

”اچھا۔ پر یہ سارنگ ہوتا کیا ہے؟ چیز کیا ہے؟“

بولی۔ ”نا۔ سب چیچ۔ کمل کا پھول سارنگ، مہاجل، کپڑا، موتی، سونا، چراگ، دیوایہ

سب سارنگ، بانج، ہنس، مور، گھوڑا سبھی سارنگ اور جیسا تو ہے نہیں باگھ سیر وہ بھی

سارنگ تال، سنکھ، پیپہا، ہرنی، کونسل۔ اے تمہارے کو کو پل لاؤں؟ کو او کو او، ہاں؟“

”پاگل ہے تو تو۔“

”انجھی سن نا، سارنگ بولتے ہیں رات، چاند کو، سورج کو، جمین کو، بھونرے کو اور

جی اسمان کو، کبوتر کو، بمل کو، راجے کو سر کے چھتر کو اور تیرے پاؤں کو لگانے کے چندل

ہوں۔ آجادی میں ملاں گے۔“

یہ سب تو ہوا مگر ایک بات میری سمجھ نہیں آئی۔ یا تو اتنے برس سے وہ سب کی زیادتیاں سہہ رہی تھیں۔ بکری کی طرح گردن ڈالے ہوئے یا اب ایک دم نکل بھاگنے کی تیاری کرنے لگی۔

خیر، عورتوں کا یہی ہے۔

میں نے سوچا، تیرا اگر نشانے پر بیٹھا ہے، دکان والے کے دل کو لگ گئی ہے تو قسائی برادری کا پٹھا ہے، کچھ کر گزرے گا۔

مگر تین راتوں تک میں آہٹیں لیتا رہا۔ کوئی نہ آیا۔ ان تین دنوں میں روپالی سے صرف دو بار بات ہوئی، وہ بھی سرسری سی۔ کچھ بتایا ہی نہیں۔ قسائی کا بس اتنا کہنے لگی۔ ”آئے گا، وہ کسی جوڑ جگاڑ میں لگائے ہو گا۔“

مجھے اب امید نہیں رہی تھی۔ یہاں ایک الجھن یہ بھی ہو گئی تھی کہ ایک رات انہوں نے اس دوسری عورت کو روپالی کے ساتھ رکھا۔ میرا بہت جی کرتا تھا مگر بات کرنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ دوسری رات انہوں نے روپالی کو کسی اور کمرے میں پہنچا دیا۔ ادھر دیوار کے پار وہ سب بد معاش نئی عورت کو گھیرے ہوئے تھے سب تاش کھیلے تھے، شراب پیتے تھے، سویرے تک اودھم کرتے رہے۔ حرام خور۔

چوتھے دن، کوئی تین ساڑھے تین بجے جب آس پاس سناٹا سا تھا، چوہداری کے کارخانے میں اس کے تین چار ہی گر گئے موجود تھے اور وہ بھی کھانا کھانے کے بعد کی آگس اور سہ پہر کے بوجھل وقت کی مار کھائے سایہ میں اینڈ رہے تھے۔ باگھیر بوڑی کے کارخانے میں جیسے بھونچال آگیا۔

پہلے تو ایسی آوازیں آئیں جیسے جانوروں کا ریوڑ بدک کر بھاگا ہو۔ پھر کارخانے کے بڑے پھانک پر دھماکا ہوا۔ بھاری گاڑی کے انجن کی آواز آئی، کوئی دیوانوں کی طرح ریس دے رہا تھا۔ پھر بہت سے آدمی گالیاں بکتے ہوئے فائر کرتے ہوئے کمپائڈ میں ہر طرف بھاگے بھاگے پھرنے لگے۔ دو تین فائر کمرے کے قریب سے ہوئے یہ چوہداری کے آدمیوں نے کیے ہوں گے۔ آٹومیک رائفل کے فائر تھے۔

ان پہلی آواز کو دو تین منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ میرے والے کمرے کے دروازے پر زبردست دھماکے ہونے لگے۔ لگتا تھا کنڈی تالے پر گھن مارا جا رہا ہے۔ گھن کے تین چار ہاتھ ہی چلے ہوں گے کہ کنڈی، تالا سب فرش پر جا گرا۔ کمرے

”آکھ منک کا۔“

میں ہنسا۔ ”آکھ منک کا کیسا؟“

بولی۔ ”ان لوگ کا فور میں ہے کہ کون ہے، وہ بکرے کا گوس پکانے کا بولا تھا۔ گوس کی دکان آئی۔ تینوں کتے جو بکر پر سوار پھر رہے تھے بولے، ہم گوس کی دکان میں نہیں جان گے۔ کھمرے جینی لوگ تھے، کون تھے۔ فور میں ساتھ نہیں تھا۔ کوئی جھاڑی ٹٹی تلاش کر کے بیٹھا ہوئے گا، انہی۔ میں تے سور کیا ٹیم کھراب نہیں کرو۔ چلو ساتھ یا میں آپنی جاتی ہوں اور میں کھٹاک سے جالی لگی دکان میں کھس گئی۔ کسائی دکان والا جوان لڑکا تھا۔ ایسا میلا پھیلا پر کھوب بگڑا۔ مونچھیں منہ میں کھسی جاتی تھیں، دانتوں سے نکرا رہی تھیں۔ میں نے کہا، ٹیم نہیں ہے جلدی کر۔ دھیرے سے بولا۔ تیرے کو توجی کرتا ہے سبھی کے اکھر میں چھٹی کروں۔

میں دل میں بولی روپالی۔ باہر کا آدمی مل رہا ہے، جی دار ہے۔ گھیر لے کوئی باہر کا ساتھ دے گا۔ سبھی باگھیر بوڑی سے نکلنے کا سادھن بنے گا۔

میں نے ہونٹ دبا کے، ”آکھ چلا کے،“ ہنس کے اسے کچھ بول دیا۔ کسائی کا پوت گھمن گھیری کھا گیا۔ بگڑا ہاتھ میں لڑنے لگا اس کے۔ میں نے بولا۔ ”مالک لوگ ہمیں تالے میں رکھتے ہیں۔“ کہنے لگا۔ ”تالے کی تو۔“ میں نے کہا۔ ”اچھا پیچھے پیچھے آبا گھیر بوڑی میں جسگے پچھان لے ہماری۔ لال رنگ کی جپ گاڑی میں لائے ہیں میرے کو، جانے ہی والے ہیں۔ پر چار بندے ہیں حرام کے جنے، گولی بندوک سے تیار تو جھگڑا نہیں کرنا۔ رات میں آکے لے جانا میرے کو۔“ بولا ”ٹھیک ہے تو منے کر رہی ہے، نہیں چار لاسیں ادھر بجا میں گرا دیتا ہوں۔ ایمان سے۔“ میں بولی۔ ”رستی رہنے دے۔ لال جپ کے پیچھے پیچھے چپکا چلتا آ۔ جسگے دیکھ لے۔ سرے سے دو گھڑی پہلے بالکل نئی ٹائم ہوئے گا۔ میرے کو کار کھانے میں رکھا ہے۔ دو تین بڑے بڑے بائیل دور سے فجر آتے ہیں۔ چار دیواری الاگ کے بائیلوں کے کریب آ جاتا۔ کوئی ہوئے گا نہیں۔ بائیلوں کے برابر دوئی کمرے ہیں۔ بس جس بھی کمرے تو کھٹکا کرے گا، میرے کو کھمر لگ جائے گی۔“

پھر مجھ سے روپا کہنے لگی۔ ”دیکھ لینا، وہ آئے گا جرور، تیار رہنا۔ چٹکی بجا کر بولوں گی، یوں کر کے نکل چلیں گے۔“

کیا طوفان لڑکی تھی۔ پھر کہیں کوئی کھٹکا ہوا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”جار ہی

کارخانے سے باہر نکل گیا۔

موسیٰ کی آوازیں، آدمیوں کے چلا چلا کر گالی بکنے اور تکلیف سے ڈکرانے، پکارنے کا شور۔ ان سب آوازوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا ہمارا ٹرک کارخانے کی کچی سڑک گزار کر باگھیر بوڑی مین روڈ پر آگیا تھا۔

قسائی دوست نے خوش مزاجی سے ہلکی پھلکی گالی بکی اور بولا۔ ”لے ری نکل آئے۔“ اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اب تک روپا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ روپا اب تک میرا ہاتھ پکڑے تھی۔ قسائی نے دیکھا اور جھکی ہوئی مونچھوں کے پیچھے سے دانت چمکا کر بولا۔ ”اب چھوڑنا باؤ صاحب کا ہاتھ۔ چل ٹھیک سے بیٹھ۔“

روپا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اٹھی اور ٹرک کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا اس کی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ ”آگئے رے“ آگئے آبادی میں آگئے۔“ اس نے مجھ سے کہا اور رو پڑی۔

پھر بڑی آنکھوں والی اس چھوٹی سی سانولی لڑکی نے جس کے گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور ہونٹ بھرے بھرے تھے، میری طرف ہاتھ بڑھائے۔ دونوں ہاتھوں سے میرے سر کو چھوا پھر اس نے بچے پھیلا کر اپنے چمکیلے گنجان بالوں پر اگلیاں چٹخائیں۔ اس نے بلائیں لی تھیں میری۔ اس پاگل نے، عجیب لڑکی تھی۔ میری دوست روپا، ’روپا‘ روپ۔

اس قسائی عاشق نے کھیا کر ہنستے ہوئے اسے ڈانٹ دیا۔ ”چل بس کر سیدھی بیٹھ۔“

روپا مڑی اور اپنے قسائی سے لپٹ گئی۔ ”اری ہٹ۔ سیدھی طریقوں بیٹھ تیری تو۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ رہا تھا مگر خوشی اس کی آواز سے چھلکی پڑتی تھی۔

اچھلتے کودتے، پلتے جلتے ٹرک میں دھچکے کھاتے ہوئے میں نے سوچا فوری مصیبت سے نکل آئے ہیں شکر واجب ہے۔

میں نے ٹرک کی دیوار سے نکلے نکلے ہی والد صاحب کی طرح پشتو میں شکر واجب گزاری کی دعا پڑھی کہ ”اگر تو کہیں ہے اور بچوں نے خبر دی ہے کہ تو ہے۔ تو میرا عاجزانہ شکر یہ قبول کر۔ میں جانتا ہوں کہ تو جو اتنے بہت سوں پر اتنا کرم کرتا ہے اور اس لیے کرتا ہے کہ کرم کرنا تیری عادت ہے اور تیرے سوا ابسا کریم کہیں کوئی اور نہیں تو تمہی کی چیز کی طرح شکر یہ کی بھی حاجت نہ ہوگی میں تو شکر اس لیے ادا کرتا ہوں کہ

کے دروازے کو زوردار آواز سے اندر کھولتے بلکہ پھینکتے ہوئے دو مرد اور ایک عورت۔۔۔ نہیں لڑکی کمرے میں گھس آئے۔ مردوں کے ہاتھوں میں دیسی ساخت کے بھدے پستول تھے۔ خود مرد بھی دیسی ساخت کے تھے۔ گنڈے، کھر درے، تہہ پوش لڑکی گھن اٹھائے ہوئے تھی اور بھگوارنگ کی ساڑھی پہنے تھی۔ کمرے میں آتے ہی اس نے ہاتھ سے گھن پھینک دیا۔ پھر بڑی بڑی آنکھوں والی یہ لڑکی جھپٹ کر میرے پاس آئی اور بولی۔ ”سیر کھان۔ چل۔“

یہ روپا کی آواز تھی۔ یہ روپا تھی۔ میری دوست روپا۔۔۔ روپ۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا، مجھے کھینچتے ہوئے گھومی اور کمرے کی دہلیز پار کر گئی۔

باہر سو ڈیڑھ سو گائیں، بیل، بکریاں کارخانے کے احاطے میں بھاگتی پھر رہی تھیں شور کر رہی تھیں۔ ان کے پیچھے چو خانے کے تہبند اور بڑی بڑی جیبوں والے شلو کے پہنے قسائی اور موسیٰ کے آڑھتیوں، بیوپاریوں جیسے لوگ ہاتھ میں لوہا چڑھی لاٹھیاں، بھرقل بندوقیں اور دیسی ساخت کے پستول لہراتے اور گالیاں بکتے بھاگے پھر رہے تھے۔

میں نے دیکھا نیکر جرسیوں والے دو تین آدمی، ادھر سے ادھر دوڑ کر گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے بھاگتے ہوئے اپنی آٹومیک رائفل سے ہماری طرف فائر کیا جو کسی کو نہیں لگا۔

لڑکی نے، جو میرا ہاتھ پکڑے تھی، اس روپا نے دوسرے ہاتھ سے ریشمی کرتے، تہبند والے لڑکے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ یہ روپا کا قسائی دوست ہو گا۔ ہمارا نجات دہندہ۔ ہم تینوں ایک دوسرے سے گلے لگے برآمدے میں آئے پھر جب آٹومیک رائفل کا ایک اور فائر ہوا، تینوں بوائیکلوں کی اوٹ میں چلے گئے۔ میں نے دیکھا کارخانے کا پھانک ٹوٹا پڑا تھا۔ اڑتی دھول اور دھوئیں کے بادل چیرتا اور موسیٰ کے سروں سینگوں کے جوم میں راستہ بناتا ایک پھٹا، ٹوٹا، بدہیت ٹرک زبردست شور اور دھواں پھینکتا، دیوانوں کی طرح ریس کرتا بوائیکلوں کی طرف آ رہا تھا۔ روپا کے دوست نے ٹرک کی طرف چلا کر کچھ کہا، ٹرک رک گیا۔ روپا کے دوست نے زور سے اس کا ہاتھ کھینچا۔ روپا نے میرا ہاتھ کھینچا اور ہم تینوں کھلے ڈالے پر چڑھ کر ٹرک میں بھیجی تازہ گھاس پر جا گرے۔

قسائی نے ٹرک ڈرائیور سے چلا کر کہا۔ ”چل بے۔“ اور کارخانے کے ٹوٹے پڑے دروازے پر ڈنگ لگا دھچکے کھاتا، پاگل اڑدے کی طرح غراتا، دھواں اڑاتا ٹرک

بولی۔ ”ادھر کے آدمیوں سے میں نے پوچھ لی تھی۔ تبھی اس کر کے نہیں بتائی کی تو پریشان ہے اور پھکر کر لے گا۔“

”اس میر باج کو مار لگائی تھی، پر وہ ٹکڑا جوان ہے۔ بہہ گیا۔ جی موٹا مالک آیا وہ اسے ایسے ساتھ باندھ کے لے گیا۔ بیمار تھا پر صبی تھا وہ میر باج۔“

خدا یا! میرے وفادار ساتھیوں پر کیا مصیبت آئی ہے۔ خدا بخش رانیں اور میر باز میرے والد کے رکھے ہوئے ملازم ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ دونوں کے بارے میں کہا ہے کہ یہ نوکر نہیں بھائی بند ہیں ہمارے۔ ہیرا ہیں دونوں۔

والد صاحب کا دعویٰ ہے کہ انہیں آدمیوں کی پہچان ہے۔ بے شک وطن جاتے ہوئے انہوں نے ہیرے جیسے کپے، خالص آدمیوں کو میرے ساتھ چھوڑا تھا مگر اب یہ کیا ہو گیا!

ٹرک مین روڈ چھوڑ کے اپنی بے ڈھنگی رفتار سے تین گھنٹے اسی طرح چلتا رہا۔ ذرا نیور بھی بکر قصاب برادری کا تھا اور بہت ہشیار بندہ تھا۔ اسے بار بار رک کر ٹرک کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنا پڑتا تھا۔ شروع میں تو یہ کام اس نے خود کیا پھر پانی ڈالنے کے لیے دو روپائی کے دوست کو پکارنے لگا، جس کا نام قادر تھا۔ وہ ٹرک روک کر آواز لگاتا تھا۔ ”چل وئی گا درے!“ اور قادر ٹرک پہ رکھی پانی کی ٹنکی سے ڈبا بھر کے پانی لے جاتا اور گاڑی میں ڈالتا تھا۔

قادر کے اترنے، پانی ڈالنے، واپس آنے یعنی اس کے ہم دونوں کے پاس سے ہٹنے کا وقفہ اتنا ہوتا تھا کہ روپائی ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ قبضے میں کر لیتی اور مجھ سے جلدی، جلدی باتیں کرنے لگتی۔ قادر کے آنے پر وہ میرا ہاتھ چھوڑ دیتی، دور سرک کے بیٹھ جاتی یا ٹرک کی دیوار سے ٹیک لگا کے اوگھنے لگتی۔

اپنے عاشق قادر قصائی سے چراتے ہوئے خلوت کے ان چھوٹے چھوٹے وقفوں میں روپائی نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں۔ حیرت ہوئی جب اس نے بتایا کہ کارخانے پر حملہ کرنے سے پہلے قادر دوبار آکر روپا سے مل چکا تھا۔ دونوں مرتبہ وہ رات کے پچھلے پہر میں آیا تھا اور روپائی کے پاس ایک، ایک ڈیڑھ، ڈیڑھ گھنٹے ٹھہرا تھا۔ اس نے چوہدری کے نوکر کو دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا تھا۔ میرے بارے میں سوال کیے تھے کہ تجھے روپائی کیوں یہاں سے نکلوانا چاہتی ہے؟ میں اس کا کون ہوں؟ اگر کوئی نہیں، تو اسے میری اتنی فکر کیوں ہے؟ قادر نے تیور بدل کے پوچھا تھا کہ کہیں

میری اپنی جان کو اس سے ٹھنڈک ملتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے میرا اپنا چھوٹا سادل پر حساب مسرت سے بھر جاتا ہے۔“

یہ دعا داتا دربار کے کسی فقیر نے میرے بابا کو سکھائی تھی اور انہوں نے مجھے یاد کرا دی تھی۔

دعا پڑھ کر میں نے روپائی سے اور اس کے قسائی دوست سے پوچھا۔ ”خدا بخش اور میر باز کہاں ہیں؟“

قسائی بولا۔ ”کون خدا بخش، میر باز؟“

میں نے روپائی سے پھر پوچھا۔ ”بولو تا تمہیں نہیں معلوم؟“

وہ بولی۔ ”ابھی تو نہیں مالم۔“

”کیا مطلب، ابھی تو نہیں معلوم؟“

اس نے باری باری قسائی کی اور میری طرف دیکھا۔ ”دیکھ سیر کھان! میں نے ادھر کار کھانے میں نہیں بتائی تھی۔ تو ویسے ہی پریشان ہو راتھا۔“

”کیا نہیں بتایا تھا؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

قسائی نے پہلو بدلا، روکھے پن سے مجھ سے کہنے لگا۔ ”او بھائی صاحب! آرا سے ذرا آرام سے۔“

روپا نے سر گھمایا، تیکھے پن سے اسے دیکھا۔ ”تو چپکا بیچارہ۔ تیرے کو جردن نہیں آرام ورام بولنے کی۔ سن او سیر کھان! ادھر جب وہ تجھے کھاٹ پر ڈال کر ٹرک میں لے گئے تھے اس ٹیم کو تیرے ڈریور، چوکی دار کو وہ لوگ نے ادھری بند رکھا تھا۔ ڈریور نے جھگڑا کیا۔ اسے کھمر لگ گئی تھی کہ تیرے کو کھاٹ پہ ڈال کے لے گئے ہیں وہ سمجھا تجھے کھتم کر دیا ہے تو اس نے بڑا بلوا کیا، ڈریور نے، دو تین حرامیوں کو جکھم کیا۔ وہ لوگ نے اسے اتنی مار لگائی، اتنی لگائی، سمجھو مارنے میں کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی، باغیر بوڑی کے کو تو ال کو بلا کے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اسے۔ بولے یہ ادھر کار کھان میں ڈکیتی کرنے گھسا تھا۔ تیرے کو تو سیر کھان! پتا ہے، پولیس وہ لوگ سے مال کھا ہے۔ تھانے میں آنکھ کھلی، ہوس آئی تو تیرا ڈریور ایسا ہی الٹی سیدھی بکتا تھا، بولتے، اسے سر میں چوٹ پڑی تھی۔“ پولیس والے موٹے مالک سے پیسے لے کے ڈریور کو باغ کھانے میں بند کرائی آئے۔“

میں نے دھیرے سے پوچھا۔ ”یہ سب کس نے بتایا؟“

والوں کو، مجموعی طور پر یہ کوئی بارہ تیرہ ہزار کا کھیل، کھیلا تھا قادر نے۔

روپالی یہ سب سنا کر اور ذرا شرمناک رہا کہ آج تو ٹائم نہیں ملا مگر کل شام مغرب کی نماز سے پہلے اس کا قادر سے نکاح ہو جائے گا۔ بولی۔ ”کل تک تو سیر کھان! میں تجھے کہیں نہیں جانے دوں گی۔“

”ماشاء اللہ!“ میں نے روپالی کو۔ اپنی دوست روپا۔ روپ کو پیشگی مبارک باد دی۔

قادر اور اس کے بھائی بند خبر نہیں کب سے اس علاقے میں آباد تھے۔ ان لوگوں کی دوستیاں، مرد تیں ادھر بھی تھیں، دریا پار بھی تھیں پھر کاروباری رابطے تھے۔ دنیا کو گوشت کھلا رہے تھے یہ لوگ۔ ہم اجنبی علاقے میں بڑھتے جا رہے تھے لیکن ہر جگہ جان پہچان کے لوگ بھی مل رہے تھے۔

میل بھر دور سے دریا کی مہک آرہی تھی۔ ہمارا ٹرک کشتی گھاٹ پر لگا تو معلوم ہوا ایک اچھی جان دار موٹر بوٹ قادر ٹھیکے دار اور ان کے ”گھر والوں“ کے لیے پہلے سے تیار ہے۔

یہاں ٹرک والا اترا تھا، قادر کی طرف سے ہاتھ اٹھا کے وہ ”اچھا دلی کادر“ جاراؤں، کر کے پھر ٹرک میں بیٹھ گیا تھا اور کھڑکھڑاتا، پھٹ پھٹاتا، ہمیں گھاٹ پر کھڑا چھوڑ کر چل دیا تھا۔ یہ قادر قصائی کا بہترین دوست تھا اور اس معرکے میں معمولی زخمی بھی ہوا تھا مگر جاتے ہوئے نہ سلام دعا ہوئی نہ شکر یہ نوازش۔ بس ڈرائیور بھائی نے کچھ کھسپاتے شرماتے ہوئے ”اچھا بے!“ کہہ کر ہاتھ اٹھا دیا تھا اور وہ رخصت ہو گیا تھا۔ خوب لوگ تھے یہ بھی۔

موٹر بوٹ ہم تینوں کو لے کر تیس پینتیس منٹ میں دریا پار کسی دوسرے گھاٹ پر پہنچ گئی۔ یہاں ایک پرائیویٹ ٹیکسی میں قادر کے دو دوست ہمارے منتظر تھے، وہ کچھ کھانے کا بھی لائے تھے۔ کھاپی کر، ٹیکسی میں سوار ہو کر ہم دو گھنٹے بعد کسی گاؤں میں پہنچ گئے۔

ٹیکسی جس مکان کے سامنے جا کر رکی وہاں پیٹرو میکس جلتے تھے اور سامنے گلی میں چھ سات بوڑھے، ادھیڑ عمر کے آدمی تہ بند باندھے، شلو کے پہنے، جے بیٹھے تھے۔ ٹیکسی رکی تو اس وقت تک کوئی نہ اٹھا جب تک کہ مکان سے عورتیں نکل کے آگئیں اور روپا کو چادر اڑھا کر گھر میں نہ لے گئیں۔ ”جنانیوں“ کے جانے کے بعد مونڈھوں پر

مجھ سے روپا کی یاری، عاشقی تو نہیں چل رہی؟ اگر چل رہی ہے تو اس نے لڑکی سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی بھی وقت پانچ سات منٹ میں مجھے آدمی سے لاشی بنا دے گا بلکہ کہنے لگا اگر سے بھی کم ٹائم لگے گا۔ ہاتھ اس کا بہت تیز چلتا ہے۔

روپالی نے اس بات پر قادر کو اپنی کھاٹ سے لات مار کے اتار دیا تھا اور صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اب اسے ایک سیکنڈ کے لیے بھی کارخانے کی حدود میں نہیں دیکھنا چاہتی اور قادر قصائی کو اب بھول جانا چاہیے کہ روپالی نام کی کوئی لڑکی کہیں پیدا بھی ہوئی تھی۔ قادر بھائی کے لیے یہ نیا تجربہ تھا کہ کسی چھٹکنی برابر لڑکی نے انہیں اس طرف دھتکارا ہو۔ وہ غصے، شرمندگی اور روپالی کے پیار میں باؤ لے ہو کے کمرے میں ٹھنسنے لگا۔ گالیاں بکنے لگے۔ آخر کچھ ان کی کھوپڑی میں آیا تو بولے کہ کوئی لڑکی اپنے کسی عاشق کے سامنے کسی دوسرے عاشق کے لیے اتنا پھٹا نہیں کر سکتی۔ ہو نہ ہو، یہ شیر خان روپالی کا بھائی ہے۔ روپا ہنس پڑی بولی کہ پاگل! وہ نہ بھائی ہے نہ عاشق، شیر خان تو روپالی کا گرا ہے۔ مرشد ہے اس کا۔

قادر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر روپالی ہنسی تھی اور قادر قصائی کو ایک اطمینان سا ہو گیا تھا کہ میں جو کوئی بھی ہوں، روپا کا یار بہر حال نہیں ہوں۔ اس نے مجھے فرا کرانے کی حامی بھر لی۔

اس نے اپنی برادری اور پولیس والوں کی مدد سے کارخانے پر یلغار کا منصوبہ تیار کیا۔ اس میں دو چار، دس بکریوں، گایوں کے ضائع ہونے یا قصایوں، آڑھتیوں کے کچے زخمی ہونے کے سوا کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ پولیس والوں نے اتنا تعاون اور کیا تھا کہ کارخانے کے چار پانچ آدمیوں کو اپنی کسی بیگار میں الجھا کر وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ تو بس مویشی کے ریوڑ کو ہٹانے کے، پرانے پھانک پر اپنے پرانے جان دار ٹرک سے ٹکر مار کے پوری قصاب منڈی کے ساتھ کارخانے میں گھس پڑے تھے اور سیدھی جچی توڑ پھوڑ کر کے ہم دونوں کو نکال لائے تھے۔

یلغار سے دو گھنٹے پہلے قصائیوں، آڑھتیوں نے تھانے میں ریپٹ لکھوا دی تھی کہ ہمارے ریوڑ کے چار چھ جانور کل سے کارخانے والوں نے کپاؤنڈ میں بند کر رکھے ہیں، ہم مانگتے گئے تو انہوں نے گولی چلا کر ہمیں دوڑا دیا، دہائی ہے پولیس کی۔

قادر قصائی اور اس کے بھائیوں نے اس مہم کو کامیابی سے سر کرنے کا فیصلہ پولیس کو پورے دس ہزار روپے میں دیا تھا۔ اوپر سے تین بکری بھی دیے تھے۔ پولیس

تھی 'اپنی طرح' روپالی کی طرح۔

مسرت اور اندوہ کی اس گھڑی میں ایک عجیب سی حسرت 'ایک بے نام' فضول سے دکھ نے میرے دل کو جکڑ لیا۔ یہ خوش بختی 'یہ خوب صورتی یہ سارنگا- عورت۔ یہ دوسرے کے نصیب میں آئی ہے اور میری اس کی یہ آخری ملاقات ہے۔

اس نے مسکراتے 'روشنی بکھراتے دھیرے سے پوچھا' "سیر کھان! کیسا ہے؟" شاید اس وقت تک میری آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں 'تو اس نے جھپٹ کر مجھے گلے سے لگالیا اور یوں جیسے کوئی ماں 'بچے کو تسلی دیتی ہے' نانا- ناکر کے سرگوشیوں میں کچھ سمجھانے لگی۔

کچھ بہلاوے دیے ہوں گے اس نے۔ کچھ اچھی باتیں 'کچھ وعدے کیے ہوں گے اس نے مجھ سے۔ اب یاد نہیں۔

میں جب اس کے قرب سے محروم ہوا 'اس سے ہٹ کر کچھ دور جا کھڑا ہوا تو وہ آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ میں نے بڑھ کر اس کے رخسار جھو لیے۔ "روؤ مت دوست روپالی 'روپا' روپ۔ اب خوش رہو۔"

وہ آنکھوں میں آنسو لیے ہنس پڑی 'بولی' "میرا نام رکیہ ہے۔ روپالی تو بس میں تیرے لیے رہ گئی ہوں۔ برسوں سے لے کے اب تک سب نے رکیہ بول 'بول کے میرا اپنا جہنم کا نام ہی مجھے بھلا دیا۔"

"میں یاد رکھوں گا۔"

"ہاں تو یاد رکھنا سیر کھان! دوسرے! اور ہاتھ پھیلا کر اس نے میری بلا میں لے لیں پھر تیزی سے وہ مڑی اور روتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

چلتے ہوئے قادر نے دو ہزار روپے میری جیب میں ڈال دیے۔ میں نے واپس کرنے کی کوشش کی تو ناراض ہونے لگا۔ میں نے کہا۔ "یہ بہت ہیں۔"

اس نے میری جیب میں ہاتھ ڈال کر پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال لیا۔ "یہ لو کم ہو گئے۔" اور وہ مونچھوں میں ہنسا۔

قادر بھائی پہلی بار میرے سامنے ہنس رہے تھے لگتا تھا ان کی 'ہماری دوستی' آخر کار پکی ہو گئی ہے۔

اس گاؤں سے مجھے مضافاتی بس میں بیٹھ کر کشتی گھاٹ تک جانا تھا 'پھر دریا پار کرنا تھا۔ آگے میں نے سیدھے کاسیر بازار جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وکیل منزل 'بے بس

بیٹھے ہوئے لوگ کھانٹے 'کھنکھارتے ہوئے آئے اور "کیوں بے!" "ہاں بے" کہتے ہوئے قادر کے شانے یا بازو کو چھو کر تھپکی دینے کے بعد مسکراتے یا پسندیدگی میں ہلاتے واپس موٹھوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

قادر نے موٹھ سے والوں کی طرف دیکھ کر میری جانب ہاتھ اٹھایا اور اکھڑے اکھڑے انداز میں میرا تعارف کرایا۔ "یہ اس کے بھائی بند ہیں۔"

موٹھ سے والوں نے اس کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا 'کسی نے ایک موٹھا میری طرف بھی سر کا دیا۔ میں بیٹھ گیا۔ آدھی رات کے قریب مکان کے سامنے ہی چار پائیوں 'موٹھوں پر بیٹھ کے سب نے کھانا کھایا پھر مجھے گلی کے کسی مکان میں لے گئے۔ صاف ستھرا بستر دیا۔ ایک لائٹیں جلا کر فرش پر رکھ دی اور چلے گئے۔

میں وہاں دو روز رہا۔ قادر بھائی ویسے کی دعوت سے پہلے مجھے جانے ہی نہیں دیتا تھا۔

جانے سے آدھے گھنٹے پہلے قادر مجھے اس گھر میں لے گیا جس میں اس کے رشتے کی عورتیں 'روپالی کو چادر اڑھا کر لے گئی تھیں۔ جس کمرے میں مجھے انتظار کرنے کو بٹھایا گیا تھا عام سا مرغیہ آدمیوں کا کمرہ تھا 'مگر صاف ستھرا۔ نیچے دری بچھی تھی اور دور 'دور صرف دو کرسیاں پڑی تھیں۔ یہاں میری اور روپالی کی الوداعی ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا۔

کوئی دس منٹ کے انتظار کے بعد چوڑیوں اور زیوروں کے بجنے کی آواز کے ساتھ وہ کمرے میں آئی۔

اتنی عمر ہو گئی زندگی نے مجھے بہت کچھ دیا ہے 'خوشیاں 'مایوسیاں 'امیدیں 'غم میں رویا بھی ہوں 'اپنوں کے ملنے 'اپنوں سے بچھڑنے پر مگر اس روز ایک اجنبی گھر کے بے رنگ کمرے میں جب میں کرسی سے دلہن کی پیشوائی کے لیے اٹھا اور اسے روپالی کو دیکھا تو لگا کوئی چیز 'کوئی بہت عزیز شے۔ میری جان 'شاید میرے وجود سے جینج مار لی ہوئی نکلی ہے اور اس چھوٹی موٹی کی گٹھری 'اس چھوٹی سی دودن کی دلہن 'کے گرد دیوانہ وار چکر لگانے لگی ہے۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "قربانت شوم! تم پر قربان جاؤں۔"

وہ تنہا کمرے میں آئی تھی اور دروازے سے ہو کر کمرے کے وسط تک میری آنکھوں پر پاؤں رکھتی پہنچی تھی۔

میں کوئی عام سی فضول 'بے اثر 'عامیانہ سی بات نہیں کہوں گا۔ وہ کھلی پڑ رہی

کرنی ہے۔ وہ فون رکھ کر بلا نے چلا گیا۔ گیسٹ ہاؤس میں دوپہر کے کھانے کے لیے مہمان ہال میں جمع ہو رہے تھے۔ آوازوں سے پتا چل رہا تھا۔
اس مانوس شور کو دہاتی ہوئی کسی کی بھدی آواز سنائی دی۔ ”یہ فون کیوں ہولڈ کیا ہے بھئی؟“ میرے لیے یہ نئی آواز تھی۔
ایک بیرے نے، جس کی آواز میں پہچان رہا تھا، کہا، ”کک کا فون ہے صاحب۔“

نئے آدمی نے فون اٹھالیا اور بگڑ کر بولا۔ ”یہ ہمارے کام کا ٹائم ہے بھئی۔ کک سے کیا کام ہے آپ کو؟ کون ہیں آپ؟“
میں نے نزلے جیسی آواز بنائی۔ جی ہوئی بنگلا میں بگڑ کر بولا، ”کاکسیر بازار، ٹریک پولیس سینٹرل ڈویژن سے ہیڈ کلرک نازلر اسلام میاں بول رہا ہوں۔ یہ ہمارے بھی کام کا ٹائم ہے بھئی سمجھے؟ بلاؤ اس کو، دن بھر ہولڈ نہیں رکھیں گے۔ سمجھے؟“
میں نے ہیڈ کلرک نذر السلام میاں کا نام لیا تھا، یہ کک کا سرالی رشتے دار تھا اکثر فون کرتا رہتا تھا۔

”اچھا صاحب! اچھا۔“ کہہ کر نئے آدمی نے فون رکھ دیا مگر اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ ہیڈ کلرک کی خوشامد میں کک کو جھاڑ پلا رہا تھا۔ ”کہاں رہ گئے تھے بھئی؟ کب سے ہولڈ کر لیا ہوا ہے۔“
کک نے ریسیور اٹھایا، کہا، ”ہیلو!“

میں نے کہا آہستہ ”سنو میں شیر خان ہوں۔ میرا نام مت دہراتا۔ فون لے کے برابر کیمین میں چلے جاؤ۔ میں جو پوچھ رہا ہوں ہلکی آواز میں اس کا جواب دینا۔ دروازہ بند کر لینا جاتے ہی۔ اور یاد رکھنا نام کوئی بھی مت لینا۔ جاؤ۔“

”ہاں صاحب“ کہہ کے کک نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ لیا۔ لمحے بھر بعد اس کی آواز آئی۔ ”ہیلو سر!“
”سر، در مت کہو! تم کیمین میں ہو؟“
”ہاں صاحب۔“

”یہ کاؤنٹر پر کون ہے؟“
کک نے بتایا ”دو صاحب ہے۔“ پھر اس نے تشویش سے پوچھا۔ ”صاحب آپ خیرت سے ہو؟“

پڑے ہیں تو کیا ہوا۔ والد صاحب کے تعلقات سرکاری افسروں، پرائیویٹ فرموں کے اہم لوگوں میں اتنے ہیں کہ گھنٹا بھر بھی نہیں گنگے گا اور سلسیل چوہدری اور اس کا ذلیل بھتیجا سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔ کوئی اندھیر تو نہیں ہے۔ حکومت کی پوری مشینری ہے جو رشوت اور بد عنوانی سے ممکن ہے رنگ آلود ہو گئی ہو مگر ٹھپ تو نہیں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ مجھے خدا بخش اور میر باز کا پتا اٹھانا ہے۔ سلسیل چوہدری کا ہیڈ کوارٹر بھی کاکسیر بازار ہی ہے۔ اصولی طور پر مجھے یہاں سے وہیں جانا چاہیے۔ گیسٹ ہاؤس کا بھی پتا کروں گا، وہاں کیا ہو چکا ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟

کشتی گھاٹ پر پہنچا۔ بازار میں قادر کے ان دو دوستوں صدیق اور سلیم سے ملا، جنہوں نے آتے ہوئے موٹر بوٹ پر ہمارا استقبال کیا تھا، کھانا کھلایا تھا۔ دونوں بہت مزے کے آدمی نکلے۔ دونوں کپڑے کی دکان میں ساجھے دار تھے۔ بڑی دکان تھی، پانچ چھ ملازم کام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے گھروں کو فون کر دیا کہ کھانا بھیج دو، یہیں مہمان کے ساتھ کھائیں گے۔ مجھ سے قادر کی شادی کا حال احوال پوچھتے رہے۔

ایک بولا۔ ”وہ ادھر آئے گا تو دعوت کریں گے، ادھی مارکیٹ کو بلائیں گے اور شکوہ بھی کریں گے قادر نے اتنا کم وقت دیا تھا۔ ہم دونوں ادھر کام میں پھنسے ہوئے تھے شریک نہ ہو سکے۔ پہلے سے بتا دیتا تو ہم بھی ارمان نکالتے کچھ دھوم دھام کرتے۔“
دوسرا کہنے لگا ”شکوے کا حق قادر بھائی کا ہے۔ وہ ہم کو دن ٹائم سب بتا کر گیا تھا۔ ہمیں کام پڑ گیا تھا تو یہ اس کا مسئلہ نہیں ہے۔ غرض دونوں ہی سب محبت کی باتیں کرتے رہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہاں سے کاکسیر بازار فون ہو سکتا ہے؟“
بولے ”ضرور ہو سکتا ہے بتاؤ کیا نمبر ملتا ہے۔“
میں سوچ رہا تھا ہمارے گیسٹ ہاؤس کا پرانا کک سمجھ دار آدمی ہے اس سے وہاں کا کچھ معلوم کروں۔ آخر کیا ہو رہا ہے؟ چوہدری کی جعل سازی اور وارداتیں اپنی جگہ اصل میں تو گیسٹ ہاؤس ہی میرا گھر تھا۔ ابھی تو بابا ہی کی پراپرٹی تھی۔ گیسٹ ہاؤس اور میں ان کی نمائندگی کر رہا تھا۔

میں نے گیسٹ ہاؤس کا نمبر دے دیا۔
کافی دیر بعد کاکسیر بازار ملا۔ آپریٹر سے گیسٹ ہاؤس کا نمبر مانگا۔ مل گیا۔ کسی پرانے بیرے نے فون اٹھایا۔ میں نے اسے اپنا نام نہیں بتایا۔ کک کا نام لیا کہ اس سے بات

نہیں ہے۔ غضب کیا میں نے اسے پتا نشان بتا کے، بہت بڑی غلطی کی۔
مجھے اس وقت ہوش کیوں نہیں آیا، جس وقت وہ جگہ کا نام اور فون نمبر پوچھ رہا تھا۔

ایک لمحے کا بھی انتظار کیے بغیر میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے یہاں سے فوراً چل دینا چاہیے۔

قادر کے کلاتھ مرچنٹ دوستوں سے میں نے پوچھا۔ ”اس پار جانے والی پبلک لائنج یہاں سے کتنی دیر بعد چھوٹے گی؟“
کہنے لگے۔ ”کمال کرتے ہو آپ؟ گھر سے کھانا آرہا ہے۔ کھانا کھائے بغیر تو آپ جانے والے کا سوچو بھی مت۔“
میں گھبرا یا ہوا تھا، وہ پوچھنے لگے۔ ”ادھر خیر تو ہے؟ کیا بات ہے؟ پریشان دکھتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”خیر نہیں ہے اسی لیے تو لائنج کا پوچھ رہا ہوں۔ فوراً جانا چاہتا ہوں۔“

بولے۔ ”نہیں بھئی، کھانا آتا ہو گا ہم تینوں بھائی کھانا کھائیں گے۔ پبلک لائنج کو جانے دو۔ جیسے ہی کھانے سے فراغت ہو گی کوئی پرائیویٹ لائنج کر کے تمہیں تمہارے گھاٹ پر اس پار اتروادیں گے۔“

پرائیویٹ لائنج؟ میں نے سوچا، میرا پیچھا کرتے ہوئے بازار کے بد معاش یہاں کپڑے کی دکان تک تو آ ہی جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں یہاں کے بعد انہیں کوئی سراغ نہ ملے کہ میں کس طرف گیا ہوں۔ ذہن میں فرار کا جو منصوبہ تیار ہو رہا تھا پرائیویٹ لائنج کرنے سے اس میں گڑبڑ ہو سکتی تھی۔

منصوبہ یہ تھا کہ تیس چالیس مسافروں کے ساتھ پبلک لائنج میں بیٹھ کر آخری گھاٹ تک کا ٹکٹ لے کے میں خاموشی سے بچ کے کسی گھاٹ اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو بھی اب تو کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں کہاں اترتا ہوں۔

میرے دونوں میزبان بہت مشکل سے پبلک لائنج پر بٹھانے کو راضی ہوئے۔ چلتے ہوئے وہیں بازار سے مٹھائی کا ایک ڈبہ لے کر میرے حوالے کیا کہنے لگے کہ ”کھانا ہمارے ساتھ نہیں کھا رہے تو اسے لائنج میں بیٹھ کر کھاتے چلے جانا۔“

”ہاں، ہاں سب صحیح ہے۔ یہ دتہ صاحب کون ہے؟“

”بازر صاحب بیٹھا کے گیا ہے۔ صاحب! صاحب! آپ کہاں سے پر رہے ہو؟ کیا ادھر ہی کاسیز بازار ہے؟“ بے چارہ کلک میرے لیے پریشان ہو گا۔ آدمی تھا۔

میں جہاں تھا میں نے اس قصبے کا نام لیا اور کشتی گھاٹ کا بتایا۔

”ادھر کہاں ٹھہرے ہو آپ؟“

میں نے کہا۔ ”یہ سب چھوڑو۔ اس نے خبیث بازار نے میرا خدا بخش میر باز کا تم سے کیا کہا ہے؟“

کلک نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”وہ بد معاش آدمی ہے کچھ بھی بولتا رہا صاحب۔ ہم لوگ ادھر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ کدھر سے فون کر رہے ہو آپ؟ میں نے کہا۔ ”نمبر تو نہیں معلوم کپڑے کی دکان ہے صدیق سلیم کا مرچنٹ۔“

”صدیق سلیم کلاتھ مرچنٹ۔ ہاں صاحب؟ صدیق سلیم؟ اس نے جس طرح احتیاط سے دکان کا نام دہرایا، تصدیق کی اس سے مجھے فکر ہو گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ دہرا کر نام یاد کر لینا چاہتا ہے۔ مجھے یہ غیر متعلق بات لگی۔ آخر کیوں؟ وہ نام کیوں یاد کر رہا تھا؟ خطرے کے احساس کے ساتھ میں نے کہا۔ ”اچھا پھر فون کروں گا۔“

بولے۔ ”ٹھہرو صاحب اور سب ٹھیک ہے؟ خدا بخش کہاں ہے؟“
خدا بخش؟ خدا بخش سے تو اس کا جھگڑا رہتا تھا۔ اس کا کیوں پوچھ رہا ہے؟
میں نے میر باز کا نام نہیں لیا تھا جس سے اس کی دوستی تھی۔ کیوں؟ کیا اسے معلوم ہے میر باز میرے پاس نہیں ہو سکتا؟

میں نے جلدی، جلدی کہنا شروع کیا۔ ”ہاں خدا بخش بھی ٹھیک ہے، میر بھی۔ ادھر ہی ہیں دونوں۔“

”دونوں ہیں؟ اچھا۔ اچھا میرا سلام کہنا، صاحب! آپ کب آرہے ہو؟“
یہ کوئی وہم نہیں تھا۔ کلک نے حیران ہو کر پوچھا تھا کہ کیا دونوں ہیں؟ اس

لہجے میں بے اعتباری تھی۔
بہت بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے۔ کلک میرا آدمی نہیں ہے۔ وہی گیٹ میں بازار کا، سلسیل چوہدری کا مخبر ہو سکتا ہے۔ اسے معلوم ہو گا کہ میر باز میرے

ہے۔

”گجراتی؟ کپڑے کی دکان؟“

ایک دم جیسے بجلی کا زندہ تار چھو لیا ہو۔ میں بننے کی طرف گھوم گیا۔

”گجراتیوں کی کون سی دکان؟“

بولا۔ ”بڑی دکان ہے۔ صدیق سلیم کلاتھ مرچنٹ۔“

میرا گلا خشک ہو گیا، او خدا! ”آگ لگا دی؟ کیوں؟“

”اصل بات تو معلوم نہیں۔ میں نے بلوے سے پہلے دکان کے سامنے سے

گزرتے سنا تھا۔ وہ صدیق اور سلیم سے ___ دونوں مالکوں سے کسی مہمان کا پوچھ رہے تھے۔“

”مہمان؟“ کہہ رہے تھے۔ ”اس کا بتاؤ کدھر گیا نہیں تو ہم تمہارے کو جان

سے مار دے گا؟“

”ہاں۔ ادھر کوئی مہمان آیا ہو گا کپڑے والوں سے اس کا پوچھ رہے تھے۔“



پبلک لانچ کے چلتے ٹھہرنے کا نظام بہت ناقص تھا۔ انہوں نے چلنے میں اتنا وقت لگا دیا کہ اس عرصے میں دو پرائیویٹ لائیکس گھاٹ سے فرار ہو گئیں۔ میرا کم سے کم آدھا گھنٹا خراب کیا اس پبلک ٹرانسپورٹ نے۔

لانچ آخر چل پڑی۔ میں انجن روم کے سائے میں اوگوں میں گھل مل کے اس طرح جا بیٹھا کہ رستے کے کسی بھی اسٹاپ میں اترنے میں آسانی ہو۔ الگ تھلگ بیٹھنا۔ مصلحت کے خلاف تھا۔ یہ لوگ چلتے چلتے بھی مسافر چڑھا رہے تھے۔ آخری آدمی ایک بھاری بدن کا گجراتی بنیا تھا جسے مشکل سے خلاصیوں نے پیر سے کھینچ کے اندر لایا تھا۔ وہ غصے میں بکتا، جھکتا اور پریشان حال میرے برابر آ بیٹھا۔

کہنے لگا۔ ”یہ پبلک لانچ والے بہت بے لحاظ بد تمیز ہیں۔ ذرا پرائیویٹ لانچ پر نوکری کرتے اور پاسبانوں سے بد تمیزی کر کے دیکھتے۔ مالک گھنے بھر میں حساب صاف کر دیتا۔“

وہ مجھ سے کسی جواب کی توقع نہیں رکھتا تھا پھر بھی میں نے آہستہ سے کہا۔ ”صحیح کہہ رہے ہو۔“ وہ بیچ پر مشکل سے میں بیٹھا تھا میں نے ذرا سرک کے جگہ دے دی۔

بولا۔ ”میں تو دس‘ بیس منٹ پہلے چل پڑا تھا۔ آرام سے جگہ مل جاتی۔ دوڑتا بھاگتا نہیں پڑتا۔“

میں اس کی فضول بات چیت میں نہ معلوم کیوں حصہ لینے لگا۔ میں نے کہا۔ ”ہاں، جلدی چل پڑنا اچھا رہتا ہے۔“

”میں تو چل پڑا تھا جلدی۔ بازار میں بلوہ ہو گیا۔ میں گلی میں چھپا کھڑا رہا۔ میرا پاؤ گھنٹا خراب کیا۔ ان بنگلہ دوست والوں نے۔“

”بنگلہ دوست۔“ انتہا پسند سیاسی لوگ تھے۔ یہ وہی تھے جنہوں نے وکیل مرزا حسین مسلم لیگی کو مارا پینا تھا۔ ان کا دفتر برباد کر دیا تھا۔

میرے کان کھڑے ہو گئے، پوچھا۔ ”بنگلہ دوست‘ والے کیا کر رہے تھے؟“

”خبر نہیں کیا کر رہے تھے اصل بات کچھ اور ہی ہو گی۔ ادھر مارکیٹ میں گجراتی بھائیوں کی ایک دکان ہے کپڑے کی بد معاشوں نے آگ لگا دی دکان کو‘ بھگدڑ مچ گئی۔“

آواز تو آئی تھی۔ مجھے یاد آیا، دور کی بھنبھناہٹ سنی تھی۔ جیسے کچھ گڑبڑ ہو رہی

کوئی بڑا گھاٹ تھا۔ بارہ پندرہ مسافر اترنے کے لیے قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ میں بھی شامل ہو گیا۔ قادر قصائی کا تحفہ حاجیوں والا پیلا رومال میں نے سر سے باندھ لیا تھا جس سے ایک نظر میں میری عمر اور شکل سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اترنے والے دھیرے دھیرے اتر رہے تھے۔ مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔

آخر میری بھی باری آئی۔ میں اتر اور بارہ پندرہ مسافروں کے ٹولے کے ساتھ سامنے کے چائے خانے میں داخل ہو گیا۔ بیٹھنے کے بجائے میں پچھلے برآمدے سے باہر نکل کر سامنے کی تنگ گلی سے گزرتا گھاٹ بازار کی چھوٹی مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ سوچا پانی پی لوں گا۔ اچانک شور سنائی دیا اور میں نے دیکھا کہ ایک پرانی جیپ پر سوار آٹھ دس لڑکے بابا ہو ہو کا سا شور کرتے گھاٹ پر رکے ہیں۔ انہوں نے بریک لگاتے ہوئے تیز آواز کی تھی۔ وہ جیپ سے کود کر اترے اور ڈرائیور سمیت جس کے گلے میں ہتھیار لگی پلٹ پڑی تھی۔ جھپٹ کر لالچ کے تختے پر چڑھتے چلے گئے۔ وہ سوار ہوتے مسافروں کو دھکا دیتے، شور شرابا کرتے چڑھتے تھے۔

میں تیزی سے مسجد میں داخل ہو کر وضو خانے میں جا کھڑا ہوا اور ستون کی اوٹ میں رومال سے چہرہ پونچھنے لگا۔ گھاٹ پر جو کچھ ہو رہا تھا مجھے یہاں سے بہ خوبی نظر آ رہا تھا۔

لالچ پر چڑھنے والے غنڈا مانپ لڑکے اس علاقے کے لگتے تھے۔ ہر شخص ان سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لالچ سے دھڑ دھڑاتے ہوئے اترے تو وہ سب کے سب چائے خانے میں گھس پڑے۔ لالچ والوں نے انہیں بتایا ہو گا کہ اترنے والے ایک ہی جماعت کے تھے اور وہ سیدھے چائے خانے میں گئے ہیں۔

میں نے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر چیونٹیاں سی ریختی محسوس کیں۔

جیپ پر آنے والے کافی دیر چائے خانے میں رہے۔ دور کی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ ان کی اور چائے خانے میں موجود لوگوں کی لحم لحشا ہو رہی ہے۔ پھر وہ چائے خانے سے نکلے اور جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں نے سوچا اس پورے علاقے میں مسلسل چوہدری کے کارندوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہ شخص اپنی مجرمانہ کارروائیوں پر پردہ ڈالنے، انہیں منظم انداز میں جاری رکھنے کے لیے اس پارٹی بنگلہ دوست میں شامل ہو گیا ہے۔ حیرت ہوئی اس کے گر گئے کتنی تیز رفتاری سے کارروائی کرتے ہیں۔ میں اگر لالچ میں رہتا یا ان کی جیپ دو منٹ پہلے گھاٹ پر پہنچ گئی ہوتی یا میں چائے پینے کو چائے

موت میرے پیچھے پیچھے آرہی تھی پھر بھی میں نے رواروی میں کہا۔ ”ان لوگوں کا یہی ہے۔“ وہ بولا ”ہاں“ جھٹھا بلوہ کرنے کو کوئی بہانہ بنا لیتے ہیں۔ دونوں دکاندار قسمیں کھا رہے تھے کہ نہیں ادھر کوئی مہمان نہیں آیا۔ پر وہ کہہ رہے تھے نہیں تم بھی اس کے ساتھ مٹھائی کی دکان پہ کھڑے تھے۔“

میں نے تھوک نلگتے ہوئے بے دھیانی میں پوچھا۔ ”مٹھائی کی دکان؟ کیسی؟“

ڈبا جو صدیق اور سلیم نے ساتھ کر دیا تھا اخبار میں لپٹا میرے ہاتھ کے تھیلے میں رکھا تھا۔

بنیا بولا۔ ”ارے! مہمان اور مٹھائی کی دکان یہ سب بہانے بازی ہے۔ کوئی پرانی دشمنی نکالنے آئے ہوں گے بد معاش۔“

میں نے آہستہ سے ”ہاں“ میں سر ہلایا۔

لگتا تھا جیسے ہاتھ پیروں کی جان نکل گئی ہے۔ میں خوفزدہ نہیں تھا۔ موت نے ایک بار آنی ہے وہ کبھی بھی آجائے۔ مجھے تو اپنے بے قصور میزبانوں کی تباہی کا صدمہ تھا۔ ان کا گناہ بس یہ تھا کہ اپنے کسی دوست کے ملاقاتی کو مجھے کچھ دیر کے لیے دکان روک کر انہوں نے کھانے کو پوچھ لیا تھا اور بس۔ سب اثاثہ زندگی بھر کی محنت ان سارا کیا دھرا برباد ہو گیا تھا۔ میری وجہ سے جی چاہا چلتی لالچ سے دریا میں کود پڑوں، لوٹ کے جاؤں اور خود کو ان بنگلہ دوست دشمنوں کے حوالے کر دوں۔ میری وجہ سے اور کس کس کو ستائیں گے اور کسے برباد کریں گے بد معاش۔

مگر کچھ دیر میں خاموش بیٹھا رہا۔ بنیا اونگھ رہا تھا۔ لالچ اپنے پہلے گھاٹ اسٹیشن پر رکی تھی۔ ابھی ہم دریا کے دوسرے کنارے پر نہیں لگے تھے۔ ادھر ہی تھے جس کنارے پر کپڑے والوں کی تباہی ہوئی تھی۔ بارہ پندرہ میل دور ہم دریا کے بہاؤ کے ساتھ آگے نکل آئے تھے۔ لالچ کا اگلا اسٹیشن دریا پار تھا۔ لالچ کو بہاؤ کے ساتھ پانچ میل اور چھ

میں بیٹے کے پاس سے اٹھ آیا۔ لالچ اپنے دوسرے اسٹاپ پر کنارے لگی۔

بڑی عمر والا کہنے لگا۔ ”کرنا کیا ہے۔ وہ جانیں، یہ جانے۔“
 چھوٹا لڑکا بولا تو اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ ”وہ سب ابھی ادھر ہی ہیں۔
 آنے کا کہہ گئے ہیں۔“
 ”آئیں، نہیں آئیں، ہماری بلا ہے۔“
 ”اور جو وہ بکواس کر کے گئے ہیں؟ اس لڑکے کی وجہ سے ہمیں دھمکیاں دے
 گئے ہیں؟“

بڑے کے لہجے میں ذرا سی بے خونی تھی جو عمر اور تجربے کی وجہ سے ہو
 گی۔ بولا۔ ”ان بد معاشوں کا کیا ہے سبھی سے بکواس کرتے ہیں۔“
 ”نہیں وہ شک کر رہے تھے کہ ہمیں پٹھان بھائی کا معلوم ہے مگر ہم چھپا رہے
 ہیں۔ اب جا کے بتاؤ ان سالوں کو کہ تمہارے بھگڑے سے ہمارا کیا لینا دینا۔ دیکھو یہ بیٹھا
 ہے تمہارا پٹھان۔“

بہت عجیب دلیل دے رہا تھا یہ لڑکا۔ یہ مروادے گا مجھے۔

بڑے نے کہا۔ ”نہیں جی ہمیں کیا ضرورت ہے۔“ اور وہ اٹھنے کو ہوا۔
 چھوٹے نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”ٹھہرو تو بھی ان سے بلا وجہ دشمنی رکھنا
 اچھا نہیں ہے۔ ہم بھی ادھر ہی ہیں۔ وہ بھی ادھر ہی ہیں۔“
 اب میرے لیے چپ بیٹھے سنتے رہنا ممکن نہیں رہا۔ میں نے اپنی بہترین بنگلا
 میں کہا۔ ”اور میں بھی ادھر ہی ہوں، دو ستو! ادھر ہی پیدا ہوا ہوں۔ پٹھان بھائی ہوں تو
 کیا ہوا؟“

میری آواز سن کر انہیں جھٹکا سالگا۔ دونوں کھسیا گئے۔ بڑے نے کہا۔ ”معاف
 کرنا ہم سمجھے تھیں بنگلا نہیں آتی۔ تمہارا کیا بھگڑا ہے ان سے؟“
 میرے ذہن میں ایک تصویر کی طرح وہ اخباری کالم آیا جس میں وکیل منزل
 حسین پر حملے کی ہیڈنگ لگی تھی۔

میں نے مسکسی آواز میں پوچھا۔ ”آپ لوگوں نے کاسیز بازار کے مسلم لیگی
 لیڈر وکیل منزل حسین صاحب کا نام سنا ہے؟“

”ہاں ہاں جسے اس دوست پارٹی والوں نے ابھی دو چار دن پیچھے مار پیٹ کی
 ہے؟“

”ہاں وہی۔“ میں نے کہا۔ ”میں وکیل صاحب کے آفس میں کام کرتا ہوں۔“

خانے میں ٹھہر جاتا تو بس دھر لیا گیا تھا۔

اس علاقے کی نوے فیصد سے زیادہ بنگالی آبادی میں لمبے قد، گوری رنگت کے
 ایک پٹھان لڑکے کو تلاش کر لینا کسی کے لیے کیا مشکل ہو گا۔ چوہدری کے کارندے
 لالچ کے مسافروں کو چپک کر رہے ہیں۔ وہ پرائیویٹ لائسنس جو اس پبلک لالچ سے پل
 چل پڑی تھیں انہیں بھی چپک کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے جیپ والے اس گھاٹ اسٹیشن پر
 بھی آئیں۔ یہاں ٹھہرے رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔

میں مسجد سے نکلنے کی سوچ رہا تھا کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ لالچ سے اترنے والا
 مسافروں کی جماعت جو چائے پینے گھسی گھسی اب ادھر ہی آرہی تھی۔ نماز کا وقت نہیں
 تھا مگر ان میں سے دو آدمی وضو خانے کی طرف آگئے۔ باقی لوگ جن میں کچھ سگریٹیں
 جلائے ہوئے تھے مسجد کے باہر ٹھہرے رہے۔ وہ اونچی آواز میں جیپ والوں کے روپے
 پر تبصرہ کر رہے تھے۔ انہیں غصہ تھا کہ جیپ والوں نے ان پر دھونس جمانے کی کوشش
 کی تھی اور دھمکیاں دی تھیں۔

میں نے وضو کے لیے آنے والوں کی طرف پشت کر لی اور خود وضو شروع کر
 دیا۔ چاہتا تھا وہ دونوں فارغ ہو کر وضو خانے سے نکل جائیں تاکہ میرا راستہ صاف ہو
 اب جب کہ جیپ والوں نے ان سے پوچھ گچھ کی ہے تو ان کے ذہن میں ہے وہ مجھے
 آسانی سے پہچان لیں گے۔

میں جانتا تھا یہ دشمن نہیں ہیں پھر بھی ضروری تھا کہ میں کسی کے سامنے
 آؤں۔ کیا خبر وہ بد معاش میرے بارے میں عام لوگوں سے کیا کہتے پھر رہے ہیں۔ غار
 ہے میں ان میں سے نہیں ہوں۔ ماحول بگڑتا جا رہا ہے۔ احتیاط کرنی چاہیے۔

اچانک دونوں وضو کرنے والے اٹھے اور میرے دائیں بائیں کے ٹکے سنہار
 کر بیٹھ گئے۔ عجیب بات ہے۔ ابھی وہ جہاں بیٹھے تھے وہاں بھی خوب پانی آ رہا تھا پھر
 گھیر کے بیٹھنے کا کیا مطلب ہے؟

ان میں سے ایک جو میری عمر کا تھا بنگلا میں اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا۔

وہی ہے جسے جیپ والے ڈھونڈ رہے تھے؟“

میرا دل دھک سے ہو گیا۔

دوسرا بڑی عمر کا آدمی بولا۔ ”ہاں وہی لگتا ہے۔“

پہلے نے پوچھا۔ ”کیا کریں؟“

ابھی چار پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ میں نے دیکھا تبلیغی پارٹی کا چھوٹا کارکن ادھر ادھر دیکھتا پھر مسجد میں آگیا ہے۔ میں اوٹ سے نکل آیا۔ قریب آکر وہ دہلی آواز میں بولا۔

”وہ بازار میں پھیل گئے ہیں۔ اس لیے آیا ہوں کہ بتا دوں۔“
 ”اوہ!“ یہ پریشانی کی بات تھی۔
 ”نکلنے کے سب راستوں پر کھڑے ہیں وہ لوگ۔“
 ”اچھا؟“

”ہاں۔ دو لڑکے ہماری جماعت کے ساتھ لگ گئے ہیں۔ کچھ کہہ نہیں رہے۔ بس جدھر ہم جا رہے ہیں۔ پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔“
 میں نے پوچھا۔ ”تمہیں ادھر آتے تو نہیں دیکھا؟“
 ”نا۔۔۔ اچھا میں جا رہا ہوں۔ انہیں اگر شک بھی ہو گیا کہ ایک آدمی کم ہے تو گڑبڑ ہو جائے گی۔“
 ”اچھا بھائی شکریہ۔“

وہ بولا۔ ”بس تمہیں بتانا تھا کہ خطرہ ہے، کہیں تم نکل نہ پڑنا۔“
 ”مہربانی تمہاری۔“

”کوئی بات نہیں۔“ لڑکا جاتے جاتے رکا اور اشارہ کر کے کہنے لگا۔ ”اندر چلے جاؤ یہاں مت کھڑے رہو۔“

میں نے خود کو اس جانور کی طرح محسوس کیا جس کا کھیدا کیا جا رہا ہو۔ ہر طرف سے جسے شکاریوں نے گھیر لیا ہو۔

مگر نہیں، کھرے ہونے کے باوجود یہ دو بنگالی نوجوان میری مدد کر رہے ہیں۔ گھرے ہوئے جانور کی سی بے بسی نہیں ہے۔ میں نے مسجد کے اندرونی حصے میں جا کر دور کھٹ نفل پڑھے۔ خود کو پرسکون رکھنے کے لیے کلام مجید لے کر بیٹھا۔ ایک رکوع پڑھا۔

دو گھنٹے سے زیادہ گزر گئے۔ میں نے ایک بار باہر جھانک کر جائزہ لیا۔ مجھے تو کچھ بھی غیر معمولی نظر نہ آیا۔ نظر بھی کیسے آتا؟ شکاری تو چھپ کر گھات لگائے ہوں گے۔ شکار کو کیوں دکھائی دیں گے۔

نماز کا وقت قریب آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں مسجد میں لوگ آنا شروع ہو جائیں

ان کے دوست کا بیٹا ہوں۔“ ظاہر ہے یہ آخری بات جھوٹ نہیں تھی۔
 ”ارے!“

میں نے دونوں کو زیادہ موقع نہیں دیا اور کہا۔ ”انہوں نے وکیل صاحب کو میرے سامنے مارا بیٹا تھا۔ اس لیے اور میرے دشمن ہو گئے ہیں جیسی سے میرے پیچھے لگے ہیں۔“
 ”اوہو!“ دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ”جیپ والوں نے تم سے میرے بارے میں کیا کہا ہے؟ آخر مجھے معلوم تو ہونا چاہیے۔“
 ”کچھ نہیں کہا بس وہ ہم پہ شبہ کر رہے تھے۔ کہتے تھے پٹھان کو لانچ سے تم لے کے نکلے ہو۔ تمہی نے اسے کہیں چھپایا ہے۔ ہمیں وہ چاہیے۔“
 میں نے غصے سے کہا۔ ”وہ برے لوگ ہیں۔“

ایک بولا۔ ”بہت برے یہ بھی بھلا کوئی بات ہے۔ کوئی کسی بھی پارٹی میں کام کرے۔ ہیں تو سبھی اپنے ہی ملک کے۔“

دوسرا کہنے لگا۔ ”ہاں سبھی مسلمان ہیں۔ دشمن تو نہیں ہیں۔“
 پہلے والے نے آگہی میں سر ہلا کر کہا۔ ”دشمنوں کے کہنے پر اچھل رہے ہیں سالے۔“

”اور کیا۔“ میں نے لقمہ دیا۔

بڑے والے نے مجھے مشورہ دیا۔ بولا۔ ”سنو تم ابھی ادھر ہی رہنا مسجد میں۔“
 میں نے انہیں پکا کرنے کو کہا۔ ”اپنے ساتھیوں کو یا کسی کو میرا مت بتانا۔ میں تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کے نکل جاؤں گا۔“

نوعمر ساتھی اب شد و مد سے میرا ہمدرد ہو گیا تھا۔ ”نہیں نہیں۔ بے فکر رہو، ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔“
 بڑے نے بھی مجھے تسلی دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہاں بھئی، ہم تبلیغی پارٹی کے لوگ ہیں ہمیں سیاسی جھگڑوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ کسی کو نہیں بتائیں گے۔ بے فکر رہو۔“

وہ لوگ چلے گئے۔ میں اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ سڑک اور بازار پر نظر رکھنا ضروری تھا جیسے ہی میدان صاف دکھا میں چل دوں گا۔

ہا کر اتر گیا۔

رکشا والا مجھے نامعلوم بازاروں اور گنجان آباد علاقوں سے گھنٹی بجاتا لے چلا۔
سنے کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی مگر مجھے خطرے سے بچ نکلنے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے خود
تلی دی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اور کیا؟ جب اتنا بھروسہ کیا ہے تو پھر کسی شک میں پڑنے کی ضرورت نہیں
ہے۔ تبلیغی پارٹی کے لوگ واقعی ہمدرد ہیں انہوں نے بہت خطرہ مول لے کر مجھے
صرے سے نکال لیا ہے۔

رکشا ایک لکڑی کے گودام میں جارہی۔ سب طرف اوپر تلے عمارتی لکڑی چنی
ٹی تھی۔ رکشا والے نے کہا۔ ”اتر جاؤ۔“ میں اپنی تھیلی سنبھالے پردے سے نکل رکشے
ہے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ رکشے والے نے کہا۔ ”ادھر ہی کہیں بیٹھ جاؤ وہ لوگ آتے ہوں
”اوہ!“ یہ تو وہی تبلیغی پارٹی کا لڑکا تھا۔ اس کے اس طرح آنے اور ششکارے

وہ جانے لگا تو میں نے پوچھا۔ ”کتنے پیسے ہوئے؟“

بولاً۔ ”پیسال گیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گیا۔

ٹین کے شیڈ تلے ایک لمبی چوڑی بچ پڑی تھی میں جا بیٹھا۔ اب جو ذرا عافیت
بیب ہوئی تو بھوک لگنا شروع ہو گئی۔ میرے پاس کھانے کو وہی مٹھائی تھی۔ تھیلی سے
نکالا تو وہ دونوں دوست اور ان کی مصیبت یاد آئی۔ میں نے خود سے کہا۔ ”شیر خان!
دو رہا تو ان کپڑے والوں کے نقصان کی تلافی کروں گا۔“

بچ کے پاس گلاس سے ڈھکی صراحی رکھی تھی۔ مٹھائی کھا کر پانی پی کر شکر کیا
تھیلی سرہانے رکھ کر بچ پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر نیند بہر حال
ٹی۔ کافی دیر سویا۔ آنکھ کھلی تو سنا کوئی آواز دے رہا تھا۔ بڑھاسا چوکیدار تھا پوچھ رہا تھا۔
دن ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟“

میں نے بتادیا کہ تبلیغی پارٹی کے ساتھ جانے کو آیا ہوں۔ کہنے لگا۔ ”اچھا اچھا۔
ام کرو۔ ابھی بس نہیں آئی ہے۔ آئے گی تو بتا دوں گا۔ تم آرام کرو۔“

کوئی ایک گھنٹے بعد بس آگئی۔ میرے وہ دونوں محسن گودام میں آکر مجھ سے
لم پوچھنے لگے۔ ”کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی وجہ سے میں بچ گیا۔ ورنہ ”بنگلا دوست“
سے خدا معلوم میرا کیا حشر کرتے۔ تبلیغی پارٹی والے اپنے اپنے خرچ پر چٹاگانگ جا رہے

گے۔ میں نے سوچا اس وقت میرے لیے یہ جاننا بہت مشکل ہو گا کہ ان میں ”بنگلا
دوست“ کے کھوجی کون ہیں اور عام نمازی کون؟

اچانک گھنٹی بجاتی ہوئی ایک رکشا مسجد کے سامنے آکر رکی۔ رکشا میں پردے
لگے تھے۔ میں نے جھانک کر دیکھا پھر اوٹ میں ہو گیا۔ بہت سے مسلمان خاندان اپنی
عورتوں کو پردہ لگی رکشادوں میں لے جاتے تھے۔ یہ بات مغربی پاکستان میں عجیب لگتی ہو
گی۔ ادھر ایسٹ پاکستان میں یہ عام سامنظر تھا۔

مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ پردے دار عورت نے مسجد کے سامنے کیوں رکشا
رکوائی۔ خطرے کا احساس ہوا پھر اسی وقت پردہ سر کا کر کسی نے سر باہر نکالا اور کہا۔
”شش!“ میں پیچھے ہٹا۔ پردے سے جھانکنے والے چہرے نے اب کے قدرے اونچی آواز
میں کہا۔ ”ارے! سنو! ادھر۔“

”اوہ!“ یہ تو وہی تبلیغی پارٹی کا لڑکا تھا۔ اس کے اس طرح آنے اور ششکارے

پر میں ہلکے سے مسکرایا۔

وہ بولا۔ ”آ جاؤ۔ ٹائم نہیں ہے۔“

خوب یہاں سے نکالنے کا اچھا طریقہ سوچا ہے۔

رکشا والے نے گھبرا کر مجھے جلدی کرنے کو کہا وہ سامنے گلی میں دیکھے جا رہا تو
اور پریشان تھا۔

میں مسجد سے نکلا اور پردہ اٹھا کر غڑاپ سے رکشا میں جا گھسا۔ لڑکے نے
خود بھی پوری طرح چھپا ہوا بیٹھا تھا مجھے اشارے سے بتایا کہ میں کس طرح بیٹھوں جو
جو تے لباس کا کوئی بھی حصہ باہر سے دکھائی نہ دے۔

میرے بیٹھے ہی رکشا چل پڑی تھی۔ رکشا والا بہت تیزی اور ہوشیاری سے
رکشا مسجد سے دور لے گیا اور بازار کی بھیڑ میں شامل ہو کر گھنٹی بجا بجا کر اب مزے
چلنے لگا۔

لڑکے نے بھرے بازار سے گزرتے ہوئے کان کے پاس منہ لے جا کر مجھ۔

کہا۔ ”میں ابھی اتر جاؤں گا اپنی جماعت کے ساتھ مجھے کچھ ٹائم رہنا پڑے گا۔ رکشا والا
معلوم ہے تمہیں کہاں اتارنا ہے۔ وہ تمہیں حفاظت کی جگہ پہنچا کر چلا جائے گا۔ ادھر
نہیں ہو گا اگر کوئی آئے اور پوچھے تو بتا دینا تبلیغی پارٹی کے ساتھ جانے کے لیے
ہوں۔“ لڑکے نے رکشا والے کو اشارہ کیا اور ”اچھا چلتا ہوں۔“ کہہ کر تیزی سے

بالا لیا۔ سپاہی اس وقت تک کھڑا رہا جب تک اس نے دیکھ نہیں لیا کہ مسعود علی مجھے ہا ہے۔

میرے اندر پہنچتے ہی منشی مسعود علی نے جھٹ دروازہ بند کیا اور بولٹ لگا دیا۔ مجھے بازو تھام کر کھڑکیوں دروازوں سے دور لے گیا اور کرسیاں کھینچ کر بٹھا دیا۔

اس نے مجھے بازو سے تھاما تو محسوس ہوا تھا کہ اس کا ہاتھ ہلکے ہلکے لرز رہا ہے۔ درجوان آدمی تھا۔ اتنا گھبرا ہوا میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اندر آفس میں کوئی الماری نہیں تھی۔ دھوئیں سے کالی جلی ہوئی دیواریں رہ فیں۔ تڑنے ہوئے فرش پر گھر کے اندر سے لائی ہوئی کرسیاں میزیں لگی تھیں۔

میں نے دل میں کہا۔ ”بگلا دوست“ والوں نے مکمل تباہی کی ہے۔ فرنیچر، قالین، الماریاں، کتابیں کاغذات گویا وکالت اور کاکسیز بازار سٹی مسلم لیگ کا پورا ڈبلا دیا گیا ہے۔ ہفتے بھر بعد بھی بیٹھک میں دھوئیں کی بوبسی ہوئی تھی۔

مسعود منشی نے ادھر ادھر پریشانی سے دیکھا پھر بولا۔ ”کہاں سے آرہے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”یہیں سے۔“

کہنے لگا۔ ”میں نے سنا تھا تم شہر میں نہیں تھے۔“

”چلا گیا تھا۔ اب آگیا۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

حالات جانے بغیر میں کسی کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے گھبرا کر پھر ادھر ادھر دیکھا۔ ”سنا تھا تم میں نے اور بھی کچھ سنا ٹھیک تو رہے نا؟“

گویا کاکسیز بازار میں میرے بارے میں کچھ خبریں گشت کر رہی ہیں۔

میں نے کہا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔ وکیل صاحب کیسے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”ہسپتال میں ہیں۔“

”اور ان کے گھر والے؟“

”کچھ چلے گئے، کچھ بڑی بیٹی کے ہاں شفٹ ہو گئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”مطلب یہ کہ یہاں بس تہی ہو؟“

”ہاں اور چونکدار ہے دوسرے سب لوگ مالی، کنگ، ڈرائیور وہ بھاگ گئے۔“

”تم روز آتے ہو؟“ میں نے پوچھا تو اس نے ہاں میں سر ہلایا بولا۔ ”صبح آتا ہے بچے چلا جاتا ہوں۔“

تھے۔ انہیں دو دن کاکسیز بازار ٹھہر کر آگے چلا جانا تھا۔ کہنے لگے کہ فکر مت کر تمہیں کاکسیز بازار چھوڑتے ہوئے نکل جائیں گے۔

کاکسیز بازار پہنچ کر مجھے پہلے وکیل صاحب کو دیکھنا تھا پھر اور سب کارروائی کرنی تھی۔

چند گھنٹے کا یہ سفر اچھی طرح کٹا۔ وہ مجھے خرچ ہی نہیں کرنے دیتے تھے۔ نے بہر حال اصرار کر کے کاکسیز بازار تک کا اپنا کرایہ ادا کیا۔ ہم رات میں وہاں پر

میرے دونوں محسنوں نے کہا کہ رات میں کہاں ٹھکانا ڈھونڈو گے۔ صبح تک ہمارے ہی میں ٹھہرو۔ دن نکلتے چلے جانا۔

صبح میں نے ان کے ساتھ ہی ناشتا کیا اور شکریہ ادا کرتا دعائیں دیتا سیدھا وکیل منزل حسین کے گھر پہنچا۔

وکیل منزل گھر کی بیٹھک ہی میں دفتر کرتے تھے۔ ایک لمبے چوڑے کمرے میں چاروں طرف کتابوں سے بھری الماریاں لگی رہتی تھیں۔ ایک طرف بڑی میز

باقی بیٹھک میں بہت سے صوفے، کرسیاں، تپائیاں، ڈیک پڑے ہوتے تھے۔ ان کا دفتر مجھے اس طرح یاد تھا۔

میں صبح دس بجے وہاں پہنچا تو دیکھا گھر کے سامنے ہمیشہ کی طرح ساہو وکیل صاحب کے منشی مسعود علی کی اسکوٹر کھڑی تھی جسے میں پہنچاتا تھا۔ اسکوٹر

وہاں اب کوئی اور چیز پہچان میں نہیں آئی تھی۔ توڑ پھوڑ کے علاوہ مکان کی بیرونی دیو دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ سب شخصے ٹوٹے ہوئے تھے۔ تمام کھڑکیاں اور بہن

دروازے تختے ٹھونک کر بند کر دیے گئے تھے۔ سامنے کا باغیچہ اجڑ چکا تھا۔ وہاں بس پ کے خالی تختے، جلی ہوئی جھاڑیاں اور کٹے ہوئے درخت رہ گئے تھے۔ صدر دروازہ

پاس ایک چھوٹا سفید خیمہ لگا تھا۔

میں صدر دروازے کے سامنے پہنچا تو خیمے سے میلی، مسلی ہوئی وردی پن پولیس والا برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ پوچھنے لگا کہ ”کیا بات ہے“

سے ملتا ہے؟“ میں نے وکیل صاحب کے منشی کا نام لیا۔ پوچھنے لگا۔ ”کوئی کام ہے؟“

نے کہا۔ ”ہاں دوست ہے وہ میرا۔“ اس نے اشارہ کیا کہ ٹھیک ہے جاؤ۔

میں نے تیل بجائی تو مسعود علی نے تختہ جڑی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ کون ہے پھر کچھ دیر بعد اس نے بیٹھک کا دروازہ کھول کر ہاتھ کے اشارے

مجھے کس طرح روکتے ہیں۔ میں وکیل صاحب کے رشتے داروں سے ملوں گا۔ وہ پہچانتے ہیں مجھے۔“

مسعود علی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا اسکے چہرے پر تذبذب اور پریشانی صاف پڑھی جاتی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر آخر بولا۔ ”گارڈ کے ساتھ ایک اے ایس آئی کی بھی ڈیوٹی ہے وہاں۔ اس سے میری سلام دعا ہے۔ میں فون کر کے دیکھتا ہوں اگر وہ ہوا تو تمہیں ابھی لے جاؤں گا۔ بیٹھو، جانا مت، میں ابھی آتا ہوں۔“ اور وہ اٹھ کر اندر وکیل صاحب کے گھر میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد آیا تو اتنا پریشان تھا مگر مجھے اطمینان دلانے لگا کہ اے ایس آئی سے بات ہو گئی ہے۔ وہ کہتا ہے آجاؤ ملاقات کرادوں گا۔“

وکیل صاحب کی بیٹھک کو تالا لگا کر وہ اپنے اسکوٹر پر روانہ ہوا۔ مجھے اس نے پیچھے بٹھالیا تھا۔

مسعود علی برسوں سے اسکوٹر چلا رہا تھا لیکن آج صاف ستھری ٹریفک میں بھی جس طرح گھبرا گھبرا کر اس نے اسکوٹر چلائی اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی انارڈی چلا رہا ہے۔ میں نے سوچا وکیل صاحب پر ہونے والے حملے کا اثر ہوا ہے نشی پر۔ بکھر سا گیا ہے یہ شخص۔

وہ اسکوٹر چلاتے ہوئے مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ میں نے اپنے والد صاحب کو خط یا تار کچھ بھیجا ہے؟ میں نے بتایا وکیل صاحب کو دیکھ لوں تو تار بھیجوں گا یا ٹرک کال کرنے کی کوشش کروں گا۔

باتوں میں اندازہ نہیں ہوا۔ نشی شاید کسی لمبے راستے سے لے جا رہا تھا ورنہ اسپتال تو اتنی دور نہیں تھا۔ نشی جس مہنجان علاقے میں اسکوٹر لے آیا تھا ادھر آئے بغیر بھی جلد اسپتال پہنچا جاسکتا تھا۔ یہ تو پھیر کا راستہ ہے۔ میں نے اسے توجہ دلائی کہ وہ غلط رستے پر لے آیا ہے تو بولا کہ ہاں باتوں میں خیال نہیں رہا۔ کہنے لگا۔ ”یہ سامنے والی گلی شارٹ کٹ ہے ادھر سے نکل جاتے ہیں۔“ اور اس نے اسکوٹر ایسی گلی میں گھمادی جو آگے سے بند تھی۔ لا حول پڑھتا ہوا وہ اپنی اسکوٹر واپس موڑنے لگا تو اچانک اس کا انجن بند ہو گیا۔ عجیب آدمی ہے؟ دیر کر رہا۔ میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“

بولا۔ ”پٹرول ختم ہو گیا۔ اترو۔ ٹھہرو ریزرو لگا کر دیکھتا ہوں۔“ اس نے مجھے اتار دیا کچھ ادھر ادھر ہاتھ ڈالتا رہا بولا۔ ”کو شش کرتا ہوں۔“ اور وہ اسکوٹر پر سوار ہو

میں نے کہا۔ ”میں وکیل صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“

دھیرے سے بولا۔ ”ملنے کے لیے اب وہاں کون ہے۔“

”میں دیکھنا چاہتا ہوں انہیں۔“

نشی گھبرا کے بولا۔ ”نہیں، نہیں۔ وہاں مت جانا۔“

”کیوں؟“

”وہاں سوچ کر کہنے لگا۔“ وہاں پولیس لگی ہے حفاظت کے لیے۔“

”ٹھیک ہے لگی رہے پولیس۔ میں تو بس دیکھ کر آ جاؤں گا۔“

”دیکھنا کیا ہے۔ میں بتا رہا ہوں نا بس ٹھیک ہی ہیں۔ ٹھوس غذا دینا ضرور

دی ہے۔“

”لوگوں کو پہچانتے ہیں؟“

”نہیں۔“

”اور باتیں؟ مطلب زبان سے کچھ بھی کہتے ہیں یا نہیں؟“

”باتیں کیسی۔“ وہ ذرا الجھ کر بولا۔ ”پڑے چھت کو تکتے رہتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”تم وہاں کب جاتے ہو؟“

کہنے لگا۔ ”روز۔“

”میں بھی چلوں گا۔ آج کب جاؤ گے۔“

وہ کچھ دیر میری صورت دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”آج نہیں جاؤں گا۔“

مجھے اس کی یہ بات بری لگی۔ وہ کیوں چاہتا ہے کہ میں نہ جاؤں؟ وہ کیوں

ساتھ لے جانا نہیں چاہتا۔ میں نے کہا۔ ”تم کیوں روک رہے ہو مجھے؟“

وہ بولا۔ ”ڈاکٹر تمہیں اجازت نہیں دیں گے۔“

”کیوں نہیں دیں گے؟“

”صرف فیملی کو جانے دیتے ہیں۔ اسٹاف میں بس مجھے اجازت ملی ہے۔“

مجھے غصہ آ گیا۔ ”مگر میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہر حال میں د

ہوں۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔“

کہنے لگا۔ ”خان! ضد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں تمہیں وکیل

خیریت فون پر بتاتا رہوں گا۔“

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں وہیں جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں ڈاکٹر یا پو

گھناؤ گھنا گھاس کے کٹھوں پر پڑا رہا پھر کچھ کرنے، ہلنے چلنے کے قابل ہوا۔ ایک جگہ سے سر کی کھال پھٹ گئی تھی۔ خون بہتا رہا پھر جم کر خود ہی رک گیا۔ قیص کا ہار خون سے تر تھا۔ سر میں دو تین جگہ گومڑ بن گئے تھے۔ آنکھ سوچ کر تقریباً بند ہو گئی تھی۔ انہوں نے پنڈلیوں پر چوٹیں لگائی تھیں تو چلنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ میں نے کہنے ہو کر اور فرش پر پیر نکا نکا کر اطمینان کر لیا۔ ہڈی نہیں ٹوٹی تھی مگر میں اس کوشش میں پسینے پسینے ہو گیا۔ بازوؤں میں سے ایک پر لاشی کی چوٹ بھی بہت تکلیف دے رہی تھی۔ میں نے رومال نکال کر گردن میں جھولی سی ڈالی اور سہارے کے لیے اپنا بازو اس سیلنگ میں ڈال لیا۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا تھا؟ اتنی تھکن تھی کہ جی کرتا تھا وہیں ننگے فرش پر لیٹ جاؤں۔ خیر، بہت مشکل سے اور آہستہ آہستہ گھاس کے کٹھوں پر چڑھا اور لیٹ گیا۔

یہ تازہ پریشانی میری اپنی لائی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا۔ میں اگر ذرا سمجھ سے کام لیتا۔ منشی کی باتوں پر اس کے رویے پر ذرا توجہ دیتا تو سب کچھ سمجھ میں آ جاتا اور مصیبت میں اس طرح نہ کود پڑتا۔

منشی چاہتا تھا میں وہاں سے چلا جاؤں۔ اسپتال جانے کا بھی خیال چھوڑ دوں۔ ایک طرح سے میرے بھلے کی سوچ رہا تھا وہ۔ یقیناً اسپتال پر بھی سلسل چوہدری کے ٹھکوں کا پہرہ ہو گا۔ منشی بہت ڈرا ہوا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ چوہدری کے گروگوں نے اسے پوری طرح قابو کر لیا ہے۔ کیا کرتا وہ۔ اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ جیسا جیسا ”لوگ کہتے جاکیں کرتا چلا جائے نہیں تو نتائج کا سامنا کرے۔

سیدھی سی بات ہے یعنی اب یہ بات سیدھی لگتی ہے کہ چوہدری اور اس کے نتیجے باز لر کو یقین تھا کہ کارخانے کی قید سے بھاگ کر میں زیادہ دن غائب نہیں رہوں گا۔ لوٹ کر کاسیر بازار ہی آؤں گا۔ میں نے گیٹ ہاؤس میں ان کے مخبر تک سے بات کی تھی۔ کاسیر بازار آکر ہی مجھے اپنے وکیل اور سرپرست منزل حسین کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ جانتے تھے وکیل منزل ہی میرا نقطہ آغاز ہوں گے پہلے میں ان کا حال دیکھوں گا۔ پولیس کو رپورٹ بعد میں کروں گا۔ اس لیے مجھے کسی اور جگہ تلاش کرنے میں انہوں نے وقت ضائع نہیں کیا۔ بس وکیل صاحب کے گھر اور اسپتال پر ”جم کر بیٹھ گئے اور مجھے پکڑ لیا۔

رات ہو گئی تو مارچ اور کھانا لے کر دو لڑکے آ گئے۔ دونوں کے ہاتھ میں کھلے

گیا۔ اب کے ایک ہی لک میں انجن اشارت ہو گیا۔ بیٹھنے کے لیے میں نے ایک ہی قدم بڑھایا تھا کہ منشی نے مجھے دھکا دیا اور اسکوڑ بھگاتا گلی سے نکل گیا۔

”یہ کیا؟ منشی مجھے یہاں پھنسانے لایا تھا؟“

میں نے گلی سے نکلنے کے لیے دیوانہ وار دوڑنا شروع کر دیا مگر دیر ہو چکی تھی۔ گلی کے دونوں طرف کے مکانوں سے بنگالی لڑکے نکل نکل کر آ گئے تھے۔ انہوں نے راستہ روک دیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں پولیس والوں جیسے ڈنڈے، چاقو، ربر کے بھاری پائپ اور لائٹیاں تھیں اور وہ پوری طرح گھیر اڈال چکے تھے۔ مسعود کے اسکوڑ کی آواز دور ہو کر ختم ہو گئی۔ میں نے سوچا یہاں تو میں خود آکر پھنسا ہوں۔ منشی مال رہا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

لڑکے ہر طرف سے بڑھتے آرہے تھے۔

میں نے ایک دیوانہ وار کوشش میں ان کے گھیرے سے نکل جانا چاہا اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح مجھ پر آ پڑے۔ کبھی اتنی مار نہیں پڑی تھی جتنی اس روز بند گلی میں گھیر کے ان لڑکوں نے لگائی۔ وہ مجھ پر ڈنڈے اور ربر کے بھاری پائپ برساتے رہے۔ غنیمت تھا کہ چاقو والے مجھ سے دور رہے۔ ویسے ان کے لٹکارنے کی آوازیں اور دھمکیاں برابر سنائی دیتی رہیں۔ لڑتے ہوئے میری پوری کوشش یہ تھی کہ ان میں سے کسی کی لاشی چھین لوں۔ لکڑی یا پائپ چھیننے میں کامیاب نہ ہو سکا بے کار کوشش کی۔ بس جواب میں کچھ لڑکوں پر گھونٹے برسائے خود کو بچانے پر توجہ دیتا تو اتنی مار نہ پڑتی۔ اپنے پیروں پر زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا۔ میں گر گیا۔ گرنے پر بھی وہ لکڑیاں اور پائپ برساتے رہے۔

حلقے کے باہر شاید کوئی ان لڑکوں کی کمان کر رہا تھا۔ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ ”بس کرو رہے۔ مارنے کا نہیں ہے۔“ دو تین لڑکوں نے مجھے گریبان اور بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور گھینٹے ہوئے گلے کے مکانوں میں سے ایک میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے جانوروں کے بازے میں گھاس کے کٹھوں سے بنے ایک چوہرے پر مجھے ڈال دیا۔ وہ جیسا پھینک کر گئے تھے میں اسی طرح پڑا رہا۔ پوزی طرح ہوش میں تو تھا مگر سر کی اور بدن کی چوٹوں سے بے حال تھا۔ ایک آنکھ پر ورم آنا شروع ہو گیا تھا۔ دونوں آنکھیں کھول کر زیادہ دیر کچھ دیکھنے کی ہمت ہوتی تھی۔

کیوں میرے دشمنوں کی مدد کر رہے تھے۔

کچھ لڑکے ٹرک پر سوار ہو گئے۔ ٹرک چل پڑا۔ بہت دیر چلتے رہنے کے بعد آخر کار اذانوں کے ہوتے ٹرک رکا اور کسی احاطے میں داخل ہو گیا۔ مجھے بندل کی طرح بندھا ہوا لے جا کر انہوں نے عمارت میں کہیں ٹاٹ بچھے فرش پر ڈال دیا پھر میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔ ذرا جان میں جان آئی۔ اس کھینچ تان سے سر کی چوٹ پھر سے رسنے لگی تھی۔ ہاتھ پیروں کے زخم پھر سے دھڑکنے لگے تھے مگر ان بد معاشوں کے سامنے میں نے اپنی تکلیف ظاہر نہ ہونے دی۔ بے بسی میں پڑا سب کچھ سہتا رہا۔

کسی نے لائنٹ جلا دی تو میں نے دیکھا میں کسی گیراج کے فرش پر پڑا ہوں اور مجھے لانے والے دائرہ سا بنائے کر سیوں پر خاموش بیٹھے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد میرے ہوش بحال ہوئے۔ ایک نوکر ٹرے اٹھائے ہوئے گیراج میں آیا۔ وہ مجھ سمیت سب کے لیے چائے لایا تھا۔ چائے بہت گرم، بہت میٹھی تھی۔

چائے پی کر سب لڑکے گیراج سے نکل گئے۔ ٹاٹ کے فرش پر اکیلا میں بیٹھا رہ گیا۔

مگر زیادہ دیر میں اکیلا نہ رہا۔ میں نے ہنسی کی آواز سنی پھر دیکھا کہ سلپنگ گاؤن پہنے چوہدری باز لر یعنی بھتیجا بزل الرحمن گیراج میں چلا آ رہا ہے۔ وہ فلمی ولنوں کی طرح خود اپنی کمینگی پر خوش ہوتا آ رہا تھا۔ گیراج میں آ کر اس نے ویلوں ہی کی طرح مجھے دیکھ کر چیخ کر کے افسوس ظاہر کیا بولا۔ ”نیچے بٹھا رکھا ہے ان لوگوں نے تمہیں؟ بہت برا کیا ہے۔ آؤ اھر کر سی پر آ جاؤ۔ آؤ۔“

میں غصہ کر کے، جھنجھلا کر اسے خوش ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ ”شکریہ“ کہہ کر ٹاٹ سے اٹھا اور قریب ترین کر سی پر جا بیٹھا۔

باز لر دوسری کر سی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ سر سے پیر تک مجھے ایک دو بار دیکھ کر اس نے مایوسی میں سر ہلایا بولا۔ ”شیر خان! یار ہم نے سوچ لیا تھا اھر کارخانے میں تمہیں بہت آرام سے رکھیں گے۔ یاد ہو گا چچا بھی یہی کہہ رہے تھے؟ پھر ہم نے تمہیں وہاں بستر بھی دے دیا تھا، بہت اچھا کھانا کھا رہے تھے۔ آگے چل کر جب ہماری تمہاری دوستی پکی ہو جاتی تو اور اچھا کھانا دیتے مگر تمہارے اندر بالکل سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ وہاں سے

چا تو تھے۔ انہوں نے مارچ جلا کر مجھے دیکھا اشارے سے مجھے قریب بلایا اور کھانے کے برتنوں پر روشنی ڈال کر سخت لہجے میں کہنے لگے۔ ”کھاؤ۔ جولد ی۔“ میں سمجھ گیا تھا کہ اگر میں نے دیر کی یا کسی طرح تامل کیا تو وہ کھانا واپس لے جائیں گے۔

میں نے بہت مشکل سے گھاس کے گٹھوں سے اتر کر کھانا زہر مار کیا۔ پانی پیلا وہ وقفہ وقفے سے مجھ پر مارچ کی روشنی ڈالتے رہے تھے۔ کھا چکا تو کچھ کہے بغیر برتن اٹا کر چل دیے۔

وہی دونوں رات میں کسی وقت آئے اور ایک درمی اور چادر پھینک گئے۔ بخار اور تکلیف میں خود کو آرام پہنچانے کے لیے میں گھاس پر درمی بچھا کر اوڑھ لپٹ کر سو گیا مگر نیند بار بار اچنتی رہی۔ آنکھ لگ جاتی پھر سر بازو یا پنڈلیوں کی تکلیف سے آنکھ کھل جاتی۔

تین دن اسی طرح گزرتے کہ دو تین لڑکے لاٹھی، چا تو سنبھالے آتے۔ کھا دے جاتے۔ رات میں وہ مارچ دکھا کھا کر کھانا کھلاتے پھر مجھے اندھیرے میں چھو جاتے۔ میری ذاتی ضروریات کے لیے وہ مجھے رات میں کسی وقت لے جاتے تھے۔ ویلے میں چاہے کتنا شور کروں سنتے ہی نہیں تھے۔

ایک بار میرے شور مچانے پر انہوں نے اپنی اکھڑی اکھڑی سی اردو میں بتادیا کہ پہلے یہاں ایک پاگل آدمی کو بند رکھا جاتا تھا۔ محلے والوں کو اس کے شور کی عادت ہے۔ جتنی مرضی ہو۔ ”بو کو اس“ کرو، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

میں نے نوٹ کیا تھا کہ یہ جاننے کے باوجود کہ میں بہت اچھی بگلا بولتا ہوں لڑکوں نے مجھ سے بگلا میں بات نہیں کی تھی۔ وہ مجھ سے ہمیشہ اپنی کمزور انگریزی میں ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتے تھے۔ شاید مجھے بگلا زبان کے لائق نہیں سمجھتے ہوں گے۔ تین دن اسی طرح گزر گئے۔

چوتھے دن رات کے آخری پہر تین چار ہتھیار بند لڑکوں کے ساتھ ایک ڈرائیور جیسا آدمی آیا۔ ان سب نے میرے احتجاج کے باوجود خوب سختی سے میرے ہاتھ پاؤں باندھے۔ منہ میں کپڑا ٹھونس کر ڈھانک دیا اور بندل کی طرح مجھے اٹھا کر گلی پر کھڑے ٹرک میں ڈال دیا اور سے درمی اڑھادی۔ میرا دم گھٹا جاتا تھا مگر سہنے صبر کر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ ٹرک پر دودھ کے بڑے بڑے برتن لدے ہوئے ہیں اور وہ خالی نہیں ہیں۔ یہ دودھ سپلائی کرنے والے لوگ تھے جو نہ معلوم

سے پہلے ہی حساب چکنا کر لیا ہے اب تو دونوں بڑی معافیاں مانگ رہے ہیں۔ دکان ہی جل گئی ان کی۔“

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”جی ہاں چوہدری صاحب تمہاری کیا بات ہے۔ دور تک تمہارے جال پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ہمارے کک کو اپنے گینگ میں تم نے کب بھرتی کر لیا تھا؟ کیا ہمارے اور نوکر بھی تم سے مخبری کی تنخواہ لیتے ہیں؟“

”بہت سے لوگ ہیں مگر سب پر رقم نہیں خرچی پڑتی۔ کچھ ویسے ہی دوستی میں ہماری مدد کرتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں جیسے وکیل مزل صاحب کا منشی مسعود علی۔“

وہ بولا۔ ”ہاں جیسے مسعود علی۔ تم نے دیکھا؟ وہ ہمارا بنگالی بھائی نہیں ہے پھر بھی یہ بات جانتا ہے کہ وقت کا کیا تقاضا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”چوہدری صاحب! مجھے بھی تو بتائیے کہ وقت کا تقاضا آخر کیا ہے۔ اس مار پیٹ سے اور بار بار قید میں ڈالتے رہنے سے تو آپ مجھ کچھ بھی نہ سمجھ پائیں گے۔“

وہ رسانیٹ سے کہنے لگا۔ ”شیر علی! تمہیں کچھ نہیں سمجھانا۔ سمجھانا اصل میں تمہارے باپ کو ہے۔ تم وسیلہ ہو ان تک پہنچنے، انہیں قابو کرنے کا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا خیال ہے تمہارا؟ وہ کب تک قابو آجائیں گے؟“

وہ بولا۔ ”جیسے ہی تم نے بارڈر پار کیا انہیں خبر پہنچادی جائے گی۔“

”بارڈر؟“ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ”مجھے کون سا بارڈر پار کرنا ہے؟“

سلسل چوہدری کہنے لگا۔ ”ایسٹ پاکستان اور برما کے بیچ کی سرحد۔“

”اور یہ سرحد مجھے کون پار کرائے گا؟“

وہ بڑی مستعدی سے بولا۔ ”ہم پار کرائیں گے یہ سرحد۔“

”اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟“

”کہانا، صد بنگش، تمہارا بابا قابو میں رہے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ تم سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ تم ادھر رہے تو جھوٹی سچی کہانیاں سناتے پھر دو گے جو ہمارے لیے اچھی بات نہیں ہوگی۔“

میں نے کہا۔ ”وہ کہانیاں تو میں وہاں بھی سنا سکوں گا۔“

”نا! بالکل نہیں!“ وہ پہلی بار ہنسا۔ ”برما کی سرحدی پولیس تمہیں تمہارے

فرار ہو گئے اور اپنا نقصان کر لیا۔ اب دیکھو بھینسوں والوں نے کس طرح رکھا ہوا ہے تمہیں۔ کیا معلوم کیا بدتر بلائیں کھلاتے ہوں گے۔ سنا ہے بے وقت باتھ روم کو بھی نہیں جانے دیتے۔ بڑے سور ہیں۔ چیچ چیچ۔“

میں نے اس کی طرف صرف دیکھا۔ کہا کچھ نہیں۔

بھتیجا کہنے لگا۔ ”ہم نے اور چیچانے سوچا تھا ہم تمہیں ادھر کارخانے میں سال بھر رکھیں گے پھر رہا کر دیں گے یا کوئی اور اچھا بندوبست کر دیں گے۔ کہیں شادی کرا دیں گے تمہاری بابا بابا، مگر تم نے کو آپریشن نہیں کیا ہمارے ساتھ مجبوری ہے۔ تمہاری سزا اب یہ ہے کہ وہیں بھینسوں والوں کے پاس رہو۔ کسی نے بتایا ہو گا کہ بہت دن تک ایک پاگل بند رہا تھا وہاں۔ بے چارہ مر گیا۔ اب تمہاری باری ہے سال بھر تم وہاں رہو گے سمجھے؟ ایک سال وہاں گزار لو پھر تمہارا سوچیں گے ہم لوگ کہ کیا کیا جائے۔“

میں نے خوب منہ پھاڑ کر جہاں لی اور مسکرانے لگا۔ بازو کو طیش آچلا تھا۔ اس نے بنگلا میں مجھے گالی دی اور اردو میں بولا۔ ”ابھی تمہی کو نیند آتا ہے؟ ٹھیک ہے! سالا ادھر سو جاؤ۔“ اور وہ تیزی سے گراج سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہی نوکر جو چائے لایا تھا آیا اور دو تین پھیروں میں گیراج کی سب کرسیاں بلکہ ٹاٹ کا ٹکڑا تک اٹھالے گیا۔ بازو میں تھوڑی بہت تبدیلی تو آئی تھی۔ پہلے وہ چڑاتا تھا تو پستول نکال لیتا تھا گولی چلاتا تھا اب صرف کرسیاں ہٹا رہا ہے۔ میں ننگے فرش ہی پر لیٹ گیا اور نیند پوری کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

نوساڑھے نوبت کے قریب بازو اپنے چچا کے ساتھ آگیا۔ مجھے کھرے فرش پر پڑا دیکھ کر سلسل چوہدری اپنے بھتیجے کی طرف ایک بار گھوما۔ شاید اس چھوٹی حرکت پر اسے خاموش ملامت کرتا تھا۔ بازو نے فوراً نوکر کو آواز دی پھر خود بھی گیراج سے نکل گیا۔ وہ آیا تو نوکر سے دو کرسیاں اٹھا کر لایا تھا۔ ایک وہ خود اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے انتظار کیا۔ جب چچا چوہدری بیٹھ گیا اس کے بعد ہی یہ سعادت مند بھتیجا۔ اپنی لائی ہوئی کرسی پر بیٹھا۔

سلسل چوہدری نے ایک دم بات شروع کر دی بولا۔ شیر خان! یہ تو ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ ہمارے کارخانے سے تمہیں نکال لے جانے والے کون لوگ ہیں۔ اتنا تو پہلے ہی معلوم تھا کہ جانوروں کے اسمگلر، بیوپاری ویوپاری قصائی دھائی ہیں۔ اس پندرہ روز میں ہم انہیں اور اپنی ملازمہ اس عورت روپالی کو بھی گھیر لائیں گے۔ کپڑے والوں

کس کا تاریک سازشی دماغ کس طرح کام کر رہا ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی یہ سب کہیں کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے غصے میں سوال کیا۔ ”مگر کیوں ہوگا؟“ ”یہ سب کیوں ہوگا؟“ وہ بولا تو اس کے لہجے میں ایک طرح کی نرمی تھی۔ ”یہ کیوں والی بات نہیں بتاؤں گا۔“

میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ”ہاں“ میں سر ہلایا۔ ”اتنا بتا سکتا ہوں کہ طے شدہ نتائج حاصل کرنے کے لیے ہم بھاری رقمیں خرچ کر رہے ہیں۔ انتظامات پر بھی اور تحفے دینے کے لیے بھی۔“

”تحفہ نہیں رشوت۔“ میں نے کہا۔ ”رشوت کہو، تحفہ کچھ اور ہی چیز ہوتا ہے۔“

”جو جی چاہے کہو۔ دونوں طرف کی امیگریشن والے بہت زیادہ رقم کھینچ رہے ہیں۔“

میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔ ”دونوں طرف کے کیوں؟ ادھر ایسٹ پاکستان سرحد پر جو گئے ہیں انہیں کیوں رقم کھلا رہے ہو؟“

”اس لیے کہ اگر تم کسی طرح برما کی سرحدی پولیس کے شکنجے سے چھوٹ کر ایسٹ پاکستان کی سرحد کی طرف چل پڑے تو ایسٹ پاکستان سرحدی پولیس کے وہ لوگ جو ہمارے ساتھ تعاون کر رہے ہیں تمہیں گھنے نہیں دیں گے۔ مجبور ہو کر تمہیں گولی تک مار دیں گے۔“

”کیوں؟ مطلب اپنے گھر واپس آنے والے کو وہ گولی کیوں ماریں گے؟“

”ظاہر ہے ہمیں خوش کرنے کو اور سرکاری ریکارڈ میں درج کرنے کو کہ ایک غیر ملکی جاسوس پاکستان کی سرحد میں گھستے ہوئے مار دیا گیا۔“

میں واقعی مرعوب ہو چکا تھا۔ ”واہ! خوب پلان بنایا ہے اور خریدے ہوئے لوگوں کی بہت لمبی لسٹ ہے۔“

سلسل چوہدری اٹھ کھڑا ہوا کہنے لگا۔ ”ہاں بہت لوگ ہیں۔ اچھا، چلتا ہوں۔ میں نے ڈریس کو بلایا ہے۔ وہ آئے گا مرہم پٹی کر دے گا۔ باز لڑکا کوئی پرانا جوڑا میرا نوکر لادے گا وہ پہن لینا۔ یہ تو سب برباد ہو گیا ہے۔ کچھ دیر ریٹ کر لو گے تو تمہیں ہی فائدہ ہوگا۔ آج ساری رات سمجھو تمہاری سفر میں گزرے گی۔“

آدمی میر باز اور تمہاری داشتہ بولاری کو پکڑ لے گی۔“

”میری داشتہ کون؟“

”ارے وہی تصویر والی جسے ہم نے تمہارے لیے چنا ہے۔“

جسے اغوا کر کے تم برمالے جاؤ گے۔ بولاری نام ہے اس کا، تو تم تین بندوں کو غیر قانونی طور پر ایسٹ پاکستان کی سرحد سے برما میں داخل ہوتے ہوئے پولیس پکڑ لے گی۔ میر باز امیگریشن پولیس کے آدمیوں پر اپنے پستول سے فائر کر دے گا۔ جس سے ان کا انچارج افسر بال بال بچ جائے گا۔ وہ بے چارہ اپنی جان بچانے کو جواب میں فائر کرے گا تو میر باز زخمی ہو جائے گا اور بعد میں اسپتال میں دم توڑ دے گا۔ تم اور تمہاری داشتہ زندہ گرفتار کر لیے جائیں گے۔“

اوہ! ان شیطان حرام خوروں نے یہ تک طے کر لیا ہے کہ کس کو کب اور کس طرح ٹھکانے لگاتا ہے۔ بے چارہ میر باز۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس چوہدری نے ابھی تک خدا بخش رائیں کا نام نہیں لیا ہے۔

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”پھر؟“

”پھر برما کے امیگریشن قوانین کے حساب سے تم پر مقدمہ چلے گا اور کم سے کم بارہ مہینے کی سزا سنائی جائے گی۔ یہ ایک برس تم برما کی کسی سینٹرل جیل میں گزارو گے۔“

”اچھا اور وہ عورت جسے تم میری داشتہ بتا رہے ہو؟ کیا نام تھا اس کا؟“

”بولاری۔“

”ہاں۔ اس بولاری کا کیا ہوگا؟“

”وہ بہت تیز عورت ہے۔ ہفتے دو ہفتے میں ہنستی بولتی، کھاتی پیتی رشوت میں کچھ لوگوں کی خدمتیں کرتی وہ پھر ادھر آجائے گی۔ یا ہو سکتا ہے انڈیا کے علاقے آسام کی طرف نکل جائے۔ اس کی فکر مت کرو تم۔“

”اچھا۔ سال بھر بعد برما والے مجھے چھوڑ دیں گے؟ یا نہیں چھوڑیں گے؟“

”چھوڑیں گے کیوں نہیں بالکل چھوڑیں گے۔“

”پھر میرا کیا ہوگا چوہدری صاحب! یہ بھی بتا دو۔“

”چوہدری بولا۔ ”تمہیں ملک بدر کر دیں گے وہ۔ وہاں بھیج دیں گے جہاں تمہارا باپ ہوگا۔“

میں اس کمینے موٹے کے ساتھ کوئی کھیل نہیں کھیل رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا

میں نے روکھے پن سے سوال کیا اور میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مگر سلسلہ چوہدری! یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“

وہ کہنے لگا۔ ”اس لیے کہ پڑھے لکھے لڑکے ہو سمجھ جاؤ گے کہ ہماری پائونڈ اور ہمارے ہاتھ کتنے مضبوط ہیں اور تم مزاحمت نہیں کرو گے۔ تم نے جھنجٹ کیا۔ لڑ بھڑے ہاتھ پیر چلائے تو پانچ بھی ہو سکتے ہو۔ مثلاً تمہارا یہ ہاتھ جو سیلنگ میں پڑا، اسے شانے سے اکھاڑ کر ہاتھی کی سونڈ کی طرح لٹکا دیا جائے تو بے حد بے حساب تکلیف ہوگی۔ تم شاید یہ برداشت بھی نہ کر پاؤ۔ پھر یہ بھی ہے کہ شانے پر سے سونڈ کی طرح جھولتا ہوا بازو کچھ اچھا بھی نظر نہیں آئے گا۔ مطلب یہ کہ دیکھنے والے کو بھی تو ابھن گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے دھمکا رہے ہو؟“

”نا‘نا‘ دھمکانا اسے کہتے ہیں جب صرف زبان سے کہا جائے۔ کیا نہ جائے یہاں تو یہ حال ہے۔ بازو!“ اس نے اپنے بھتیجے کو اشارہ کیا اور اس حرام زادے نے بیٹھے اپنی کرسی پر ہی سے اپنا سیدھا پیر چلایا جو میرے چوٹ کھائے ہوئے بازو پر لگا۔ مگر کرسی سے گرا۔ ابھی اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ بازو سر پر آپہنچا اس نے ایسے ہانے بڑھایا گویا سہارا دے کر مجھے اٹھانا چاہتا ہو۔ میں تکلیف میں تھا اس لیے سنبولیے کو انچہ طرح جانتے ہوئے بھی سہارے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے بہت آسانی سے دونوں ہاتھوں میں میرا بازو تھام لیا اور خبر نہیں کون سا داؤ مارا، مجھے لگا آسمان سے بجلی گری۔ اور میرا بازو مونڈھے کے پاس سے اتر کر جھول گیا۔

زبردست تکلیف، مسلسل اذیت میں میرا روٹکا، روٹکا لڑ گیا۔ میں نے ماری اور برابر چیخا رہا۔ اس غیر انسانی تکلیف کو جو ظاہر ہے انسان کی برداشت سے ناپا تھی کوئی مضبوط جانور بھی سہہ نہ پاتا، ذکرانے لگتا۔ چوہدری نے درست کہا تھا مونڈھے کے پاس سے میرا بازو ہاتھی کی سونڈ کی طرح جھول رہا تھا۔ اس کی معمولی سی لڑائی میرے بدن میں تکلیف نہیں عذاب کی میخیں سی ٹھونکنے دیتی تھی۔

چوہدری کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آیا۔ جھکا اور میری چیخوں پر اپنی آواز بلند کرتے ہوئے بولا۔ ”ہمارے ساتھ چپ چاپ چلو گے؟ گڑبڑ تو نہیں کرو گے؟“

میں نے ذکرانے ہوئے وعدہ کیا۔ ”نہیں۔ کچھ نہیں کروں گا۔ خدا کے لیے۔“

چوہدری منہ بگاڑ کر بولا۔ ”تم لوگ ہر بات میں خدا کو ڈال دیتے ہو، خیر! بنا

طریقہ ہے۔“ وہ بازو کی طرف گھوما بولا۔ ”بس!“

بازو اپنی گھڑی دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے گھڑی پر سے نظریں ہٹائے بنا ہاتھ بڑھا کر میرا جھولتا ہوا بازو کھینچتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میرے شانے پر تھپکی دی۔ کوس کی سی آواز ہوئی اور میرا بازو شانے کے جوڑ پر سیٹ ہو گیا۔ تکلیف جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح یک لخت ختم ہو گئی۔ بازو نے گھڑی پر آنکھیں گڑائے گڑائے کہا۔ ”چالیس سیکنڈ۔“

میں نے دل میں جیسے چیخ کر کہا۔ ”سور کی اولاد! کتے!“ اور بلند آواز میں ان دونوں کا شکریہ ادا کیا۔

یہ اذیت پورے پون منٹ بھی نہیں دی گئی تھی اور میں، بنگش۔ کسی بازاری لوٹے کی طرح دل ہی دل میں سہی گالیوں پر اتر آیا تھا افسوس۔

اس لیے دوسرے لمحے میں نے دل میں یہ لفظ دہرائے۔ ”بابا! میں شرمندہ ہوں خیال میں بھی مجھے بدگلامی نہیں سوچنا تھی مگر میں یاد رکھوں گا۔ اس بھتیجے کو اور اس جھجھ کو یاد رکھوں گا۔ ساری ذلت ان کے صحیح منافع کے ساتھ انہیں لوٹاؤں گا۔ اللہ نے چاہا تو۔ ضرور۔“

میں پسینے پسینے ہو گیا تھا اور فرش پر پڑا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بزل الرحمن نے پھر ہاتھ بڑھایا۔ اس بار واقعی مجھے سہارا دینے کے لیے مگر میں نے نفرت سے اسے گھورتے ہوئے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ بازو خوشی میں چپکنے لگا۔ ”ہو ہو ہو، واہ۔“

چوہدری نے سرزنش کے انداز میں اسے دیکھا اور بازو کی چپکار بند ہو گئی۔

سلسل چوہدری۔ ”اچھا۔“ کہتا اور سر ہلاتا ہوا مطمئن گیراج سے نکل گیا۔

بازو اپنے چچا کے پیچھے پیچھے کچھ دور چلا پھر چپکے سے لوٹ آیا۔ میرے پاس آکر رازداری سے کہنے لگا۔ ”یہ میں نے ایک پہلوان سے سیکھا تھا۔ استاد بدیع الزماں لاہوری سے۔ سب انہیں استاد بدیع مولا کہتے تھے۔ اسی بیاسی سال کے ہوں گے جب مجھے بگڑی باندھ کے مٹھائی کھلا کے شاگردی میں لیا تھا انہوں نے۔“

میں نے دل میں استاد بدیع مولا کی مغفرت کی دعا کی۔ انہوں نے ایک تادہ ہند بد معاش کو اپنے داؤ بیچ سکھا کر فن کی مٹی پلید کی ہے۔ خدا انہیں معاف کرے اور دو چار برس اپنے سینے میں ہی دبا کر رکھتے یہ فن۔ اپنے ساتھ ہی لے جاتے تو اچھا تھا۔

بد معاش چچا، بھتیجے کے دفع ہونے کے تھوڑی دیر بعد نوکر کے ساتھ ڈریس

ہیں اور تم مجھے وعظ مت سناؤ، سمجھے؟“ وہ مجھے غصے سے گھورتا ہوا سامان سمیٹ کر چلا گیا۔ میں نے دل میں کہا کیا آدمی ہے۔

تھوڑی دیر بعد جو وہ آیا تو نہ غصے میں تھا نہ خوش تھا۔ وہ دو جوڑی نئی ہتھکڑیاں، کچھ تالے اور بھینس باندھنے کی لمبی سی زنجیر لے کر آیا تھا۔ ایک جوڑی ہتھکڑی اس نے میرے دونوں پیروں میں ڈال دی۔ دوسری جوڑی کا ایک حصہ میرے بائیں ہاتھ میں پہنا کر دوسرے حصے میں اس نے بھینس کی طولانی زنجیر مقفل کر دی۔ یہ زنجیر وہ بیراج کے دروازے سے گزار کر کہیں باہر لے گیا اور اسے نصب کر آیا۔ میں نے اس کے کہنے پر خوب کھینچ کر دیکھا زنجیر لٹس سے مس نہیں ہوتی تھی۔

وہ قفل بھی بہت مضبوط امر کیکن لایا تھا۔ ایک اس نے گیراج کے دروازے کے لیے رکھا، دوسرا قفل اس نے گیراج میں پڑے ٹول بکس میں ڈال دیا۔ کہنے لگا۔ ”اس میں نوک دار، دھار والی چیزیں ہیں اس لیے تالا ڈال رہا ہوں۔“

سلسیل چوہدری نے مجھ سے کہا تھا۔ اسی رات میں کسی وقت روانگی ہو گی مگر دن گزرا، رات آئی، دوسرا دن بھی آگیا نہ تو چوہدری نے اپنی منحوس شکل دکھائی نہ اس کے حرام خور بھتیجے نے۔

پانچ دن گزر گئے۔ نوک وقت سے کھانا پانی، چائے، پھل سب لاتا رہا۔ خوب آدمی تھا۔ کھاتے وقت وہ مجھے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ پلاسٹک کا چھوٹا ب لے آتا اس میں میرا ہاتھ منہ دھلاتا، تولیہ دیتا۔ کوشش کرتا کہ کھانا کھاتے ہوئے ہتھکڑیوں، زنجیروں کا شور کم سے کم ہو۔ خود چیزیں اٹھا اٹھا کر دیتا جاتا۔

ایک بار کہنے لگا۔ ”میں نے سلسیل چوہدری سے پوچھا ہے کہ میں اگر کھاتے ہوئے لڑکے کے دونوں ہاتھ کھول دیا کروں تو اسے زنجیر کی چھن چھن نہیں سنی پڑے گی۔ کھانا کھاتے وقت یہ شور اچھا نہیں لگتا۔“

عجیب بات تھی مگر میری ہمدردی میں تھی اس لیے میں کچھ نہ بولا۔

اگلی دفعہ آیا تو کہنے لگا۔ ”چوہدری منع کرتا ہے بولتا ہے جیسا ہے ٹھیک ہے۔“

پھر کہنے لگا۔ ”وہ مالک ہے اگر وہ بولتا ہے ٹھیک ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ایسے ہی کام چلاؤ۔“

اس سے اگلے روز میں نے نوکر سے کہا۔ ”مجھے کچھ پڑھنے کو لادو۔“

وہ بولا۔ ”میرے پاس دو تین کتابیں اولیاء اللہ کے حالات والی ہیں کیا وہ لا

کھاؤ نذر آگیا۔

نوکر ایک اسٹوو اور میرے لیے پینے کے پکڑے لے کر آیا تھا۔ ڈیرے پانی کھولا کر سوڈا پانی کا رب سے میرے زخم دھوئے۔ اسپرٹ لگائی، کوئی انجکشن دیا اور سر اور بازو کے زخموں پر مرہم لگا کر پٹی کر دی۔ شیشی میں بام جیسا کچھ دے کر کہہ گیا کہ بازوؤں اور پنڈلیوں پر ملے رہو آرام ملے گا۔

نوکر اسے چھوڑ کر سامان اٹھانے آیا تو ہاتھ کا کام روک کر مجھے دیکھنے لگا۔ بنگا میں بولا۔ ”صاف پکڑے پہن لو تو اپنے پکڑے مجھے دے دینا۔ میں دھو سکھا کے، جدم سے پھٹ گئے ہیں سوئی سے سی کر لے آؤں گا۔ ابھی تمہارے لیے دیا اور مچھلی کا شوربا بنایا ہے۔ پکڑے بدل کے وہ کھالینا۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں چائے دوں گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”بھائی! تم میری اتنی فکر کیوں کرتے ہو؟“

کہنے لگا۔ ”مجھے تمہاری فکر نہیں ہے۔ چوہدری صاحب کا آرڈر ہے کہتے ہیں۔ اسے کھلاؤ پلاؤنٹ کر دو۔ میں سوچتا ہوں تم بھی انسان ہو اگر صاف ستھرے پکڑے پہن کے، کچھ ٹھیک ٹھاک کھاپی کے آرام کر لو گے تو مجھے ثواب ملے گا۔“

میں نے کہا۔ ”خدا تمہارا بھلا کرے۔ اچھے آدمی ہو۔“

وہ بولا۔ ”نہیں۔ اچھا برا کچھ نہیں۔ اپنی ڈیوٹی دیتا ہوں۔ بس مالک کو خوش رکھتا ہوں۔“

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”ویسے ہم سب کو اپنے اصل مالک کی فکر کرنی چاہیے۔ وہ خوش رہے تو ٹھیک ہے۔“

وہ دھیرے دھیرے سر ہلاتا ہوا بولا۔ ”ابھی تم مجھے وعظ مت سناؤ۔ مجھے پتا ہے کہ میں صحیح ہوں کسی کو مار پیٹ نہیں کرتا، ستاتا نہیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ پکڑے گا تو بھدر لوگ کو پکڑے گا۔ سلسیل چوہدری کو، بازو کو پکڑے گا۔ میں نے انہیں پہلے بول دیا تھا کہ دیکھو میں نماز پڑھتا ہوں، روزے رکھتا ہوں، روٹنڈی، کھسرے کے چکر میں نہیں ہوں۔ کسی مسلمان کو ماروں گا پیٹوں گا نہیں، شراب کے برتن کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا اور جو ادھر ادھر کی بے شرم عورتیں تم لوگ یہاں منگاتے ہو ان کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پلاؤں گا۔ بھلے وہ پیاس سے ہی مر جائیں۔ ہاں، میں نے کہہ دیا ہے میں حرامی نہیں ہوں، دلال نہیں ہوں۔ یہ لوگ بولے ٹھیک ہے منظور ہے۔ تو بس، مجھے صحیح تنخواہ مل جانی ہے۔ یہ میری مرضی کے خلاف کام نہیں لیتے۔ میں خوش ہوں۔ مالک لوگ بھی خوش

سے بچ جاؤ گے۔“

سلسل چوہدری کا نوکر پرچہ لے گیا۔ ایک دن ایک رات گزر گئے۔ اگلے روز میں نے سرسری طور سے پوچھا کہ اخبار فروش کی طرف گئے تھے؟ کہنے لگا کاموں سے فرصت ہی نہ مل سکی۔ آج جاؤں گا۔“

شام میں آیا تو بولا۔ ”اخبار فروش کو تمہارا پرچہ مل گیا ہے۔“

میرے اس بنگالی ہمدرد نے یہ پہلی خوش خبری سنائی تھی۔ بیجان میں آدمی رات تک جاگتا رہا۔ قدرت نے یہاں سے رہائی کی سبیل کر دی ہے۔ ایک دوروز میں اس دجال چوہدری سے نجات مل جائے گی۔ میں نے طے کر لیا کہ رہا ہوتے ہی بابا کو مفصل تاریخ دوں گا۔ یہ جو بھی سازش ہے بابا کو اس سے جلد از جلد آگاہ ہو جانا چاہیے۔

شام میں ایک مرتبہ بازار بھی دو منٹ کے لیے آیا۔ گیراج میں پڑے ٹول بکس سے اسے کچھ نکالنا تھا۔ جتنی دیر وہ گیراج میں رہا۔ میں دیوار کی طرف کروٹ لیے چادر میں منہ دیے پڑ رہا۔ وہ سمجھا ہو گا سو رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا وہ مجھ سے بات کرے میرا چہرہ بھی دیکھے نہیں چاہتا تھا میرے چہرے کا اطمینان دیکھ کر اسے ذرا بھی کسی قسم کا شک ہو۔

رات کو میں اپنے آپ میں مگن سو گیا۔

خدا معلوم آدمی رات گزرنے پہ یا تین چار بجے کے قریب گیراج میں ایک دم روشنی ہو گئی۔ میں نے بنگالی نوکر کی آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا پھر اس نے کندھا پکڑ کے ہلایا۔ میں اٹھ بیٹھا۔

گیراج میں سلسل چوہدری، بازار اور ان کے تین غنڈے میرے بستر کے گرد اس طرح کھڑے تھے جیسے تابوت لے جانے والے کھڑے ہوتے ہیں بالکل مستعد۔ نوکر مجھے اٹھاتا دیکھ کر سر جھکا کے چلا گیا۔

ہماری کوشش ناکام ہو گئی تھی۔

سلسل چوہدری کے ہاتھ میں وہ رقعہ تھا جو میں نے اخبار فروش کو لکھا تھا۔ چوہدری ناراض نہیں تھا۔ اس نے طنز بھی نہیں کیا۔ رقعہ میری طرف بڑھا دیا بولا۔ ”شیر علی! میرا نوکر بہت سیدھا آدمی ہے۔ یہ وفادار بھی بہت ہے۔ اس لیے میں اسے دوسروں سے دگنی تنخواہ دیتا ہوں۔ بہت خیال رکھتا ہوں اس کا۔ آج سویرے جب میں دفتر کے لیے نکل رہا تھا اس نے مجھے اپنے کام سے بازار جانے کی اجازت مانگی۔ میں نے

دوں؟“

میں نے کہا۔ ”وہ سب میں پڑھ چکا ہوں، اولیاء اللہ کے سب حالات معلوم ہیں

مجھے۔“

سوچ کر بولا۔ ”ایک اخبار فروش ہے سرور دہلوی اس سے کہتا ہوں وہ پہلے

دہلی میں رہتا تھا۔“

سرور دہلوی؟ خوب! میرے ذہن میں جیسے ایک روشنی سی جھلکانا شروع

ہوئی۔ دہلی والا اخبار فروش یہاں کا اخبار ایسٹ پاکستان کرانیکل۔ اس کے ایڈیٹر میرے بابا کو جاننے والے میری لائن مل سکتی تھی۔

نوکر اس سرور دہلوی کا بتا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”دوست آدمی ہے اردو میں گانے

بناتا ہے۔ وہی مجھے کبھی کتاب لا دیتا ہے۔ کبھی بنگلا کا اخبار بالکل فری دے دیتا ہے۔ تم کسی کتاب کا نام لو۔ میں اس سے معلوم کروں گا۔“

میں نے جلدی سے کہا ”چوہدری کو یا بازار کو مت بتانا۔ وہ کتاب کو منع کر دیں

گے۔“

کہنے لگا۔ ”مالک لوگ ہیں چھپانا بری بات ہے مگر خیر تم کہتے ہو تو نہیں بتاؤں

گا۔ ہاں بھلا کتاب میں کیا ہے۔“

میں نے ایک منصوبے کی شکل اپنے ذہن میں بننے دیکھی۔

میں نے نوکر سے کہا۔ ”بنگلا پڑھنے میں مجھے مشکل ہوتی ہے۔ ایک پرزے پہ

اردو کی دو تین اچھی کتابوں کے نام لکھ دوں گا۔ اخبار فروش کے پاس ہوں گی تو وہ دے

دے گا۔ نہیں تو کسی سے لے آئے گا۔ میں پڑھوں گا۔ ثواب اسے اور تمہیں سب کو ملے

گا۔ کیا خیال ہے نام لکھ دوں؟“ بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

کہنے لگا۔ ”ٹھیک ہے لکھ دو۔“

میں نے قلم کاغذ منگوا کر ایک پرزے پر جیسے فہرست لکھی جاتی ہے اس طرح

اردو میں سرور دہلوی کے نام یہ لکھا کہ خدا را میری مدد کرو۔ مجھے فلاں گھر میں اس

طرح قید میں رکھا گیا ہے خدا را رسول کا واسطہ یہ پرچہ ایسٹ پاکستان کرانیکل کے ایڈیٹر کو

پہنچا دو۔ پولیس سے یا کسی سے بھی ذکر مت کرنا۔

نوکر پرچہ دیکھ کر کہنے لگا۔ ”یہ تو بہت لمبی لسٹ ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ایک بار میں جتنی کتابیں آجائیں اچھا ہے تم بار بار کے جانے

چوہدری کی دھمکیاں خالی خولی دھمکیاں نہیں تھیں۔ میں واقعی ڈر گیا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے بند گاڑی میں بٹھا کر میرے منہ پر ٹیپ لگائی اور بیروں میں زنجیر ڈال دی۔ جیسا کہ وعدہ کیا تھا، چوہدری نے بازو کو میرے برابر بٹھا دیا۔ وہ خود آگے ذرا بیروں کے پاس جا بیٹھا۔ تینوں مسلح غنڈے میرے دائیں بائیں جم گئے اور پچھلی رات کے گھپ اندھیرے اور سنائے میں گاڑی روانہ ہو گئی۔

سات آٹھ دن پہلے چوہدری نے سرحد پار کرانے کا جو منصوبہ بنایا تھا آج اس پر عمل کیا جا رہا تھا۔

گاڑی چھ سات گھنٹے برابر چلتی رہی۔ دن نکل آیا تھا اور دھوپ میں تیزی آچلی تھی۔ مجھے گرمی سے پریشانی ہو رہی تھی۔ آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ گاڑی جنگل پرانے سے گزر رہی ہے۔ آخر کسی نالے کی تلپٹی میں گاڑی روک دی گئی۔ چوہدری نے پیچھے کو آواز دی اور مجھے زنجیر اور ٹیپ کے ساتھ اتار لیا گیا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ یہ ان کا پانا پچانا علاقہ ہو گا کیوں کہ چوہدری اور اس کے کارندے بہت اطمینان سے چل پھر رہے تھے۔ پکانے کھانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ کھانا کھا کر، مجھے کھلا کر کچھ دیر سنانے کے بعد وہ پھر چل پڑے۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے ہم ایک بار اور رکے ہوں گے۔ کچھ کھانے پینے کو، پھر جو چلے تو دس گیارہ بجے رات کو جنگل میں رکے۔ بازو نے اترنے سے پہلے اطمینان کر لیا تھا کہ میرے پاؤں کی زنجیر اور منہ پر لگا ٹیپ درست ہے۔ اترنے سے پہلے اس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ ہم سرحد پر آگئے ہیں بہت احتیاط سے اترنا گڑبڑ کی تو چوٹ کھا جاؤ گے۔

لبے سفر میں ویسے ہی بے حال ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا۔

انہوں نے گاڑی سے اتار کر مجھے جس طرح بٹھا دیا تھا۔ میں بیٹھا رہا۔ تینوں غنڈے اور بازو مجھے چھوڑ کر گاڑی میں خاموشی سے جا بیٹھے تھے۔ انہوں نے دروازے بند کر لیے تھے۔ پردے گرا دیے تھے۔ چوہدری میری زنجیر تھامے ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھا رہا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ سامنے کوئی نہیں آیا۔ کسی نے بنگلا زبان میں پکار کر پوچھا۔ ”یہاں کون بیٹھا ہے رے؟ کون ہو تم لوگ؟“

چوہدری نے اونچی آواز میں کہا۔ ”انسپکٹر موجد ار کا مہمان آیا ہے۔ ہم موجد ار

کہا۔ آؤ میں جا رہا ہوں۔ تمہیں بازار چھوڑنا نکل جاؤں گا۔ کہنے لگا ٹھیک ہے۔ پھر گاڑی میں یہ کہنے لگا مجھے صدر بازار میں اخبار والے کے پاس اتار دینا۔ میں نے سوچا دہلی والے سے اپنے لیے کوئی کتاب لینے جا رہا ہو گا۔ ایسے ہی پوچھ لیا کہ کیا اپنے لیے کتاب لینے جا رہے ہو؟ بولا اپنے لیے نہیں شیر علی کے لیے۔ اسے اردو کی کتاب چاہیے وہ بنگلا نہیں پڑھ سکتا۔ بس میں سمجھ گیا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے نوکر کو کوئی کام بتا کے پہلے ہی اتار دیا۔ اس سے تمہارا یہ رقعہ لے لیا اور کہہ دیا کہ کتاب میں لیتا آؤں گا۔

میں اپنے جیلر کی صورت دیکھ رہا تھا۔ کچھ بھی کہنا بے کار تھا۔ سلسل چوہدری اب ہلکے سے مسکرایا۔ کہنے لگا۔ ”شیر علی! میرا نوکر سچا آدمی ہے۔ بہت بھولا بھی ہے۔ وہ تمہیں مجھے سب کو سچا سمجھتا ہے مگر یہ دنیا عجیب طرح بنی ہے۔ تم نے اس سے جھوٹ بولا اور کام نہ نکال سکے پڑے گئے۔ میں نے جھوٹ بولا اور کام نکال لیا۔“ وہ کچھ دیر چپ رہا پھر کہنے لگا۔ ”اچھا چلو، چلتے ہیں“ جانے کا وقت آ گیا ہے۔

میں بستر چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چوہدری کے آدمیوں نے اس سے چابیاں لے کر میری زنجیریں اور ہتھکڑیاں کھول دیں۔ چوہدری نے بازو کو اشارہ کیا وہ میرے بالکل قریب آکھڑا ہوا۔ چوہدری بولا۔ ”شیر علی! ابھی تو یاد ہو گا کہ بازو کس طرح کندھے کے پاس سے بازو اتار دیتا ہے؟“

میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔ بازو نے ہاتھ بڑھا کر میرا کندھا تھپک دیا کہنے لگا۔ ”جواب دو“ سر کیا کہہ رہے ہیں۔ ان کی بات کا جواب دو اگر یاد نہیں ہو تو یاد دلا دوں۔ ہاں؟“

میں نے چوہدری سے کہا۔ ”مجھے خوب یاد ہے چوہدری! اپنے اس بد معاش پیچھے سے کہو بک بک بند کرے۔“

بازو نے غصے میں کوئی آواز نکالی ہو گی کہ چوہدری نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ مجھ سے کہا۔ ”یاد ہے تو ٹھیک ہے مگر یہ بزل الرحمن اسی طرح تمہارے ساتھ ساتھ رہے گا۔ سمجھ؟ تم نے اخبار والے کو پرچا لکھا وہ تو میں معاف کرتا ہوں مگر اب تم نے میرے حکم کے خلاف پلک بھی جھپکی تو شیر علی! میں تمہارا وہ حال کرواؤں گا کہ یہ بازو اترنے والی تکلیف تو اس کے مقابلے میں کوئی تکلیف ہی نہیں تھی۔ آئی سمجھ میں؟“

رہی پھر جنگل کی آوازوں کے سوا سنا چھا گیا۔

معلوم نہیں یہ کس طرف کے بارڈر والے تھے۔ ان کی بنگلا میری طرح بے داغ تھی۔ یہ لوگ مشرقی پاکستان بارڈر پولیس کے کارندے بھی ہو سکتے تھے۔ برمی سرحدی پولیس کے بھی۔ مجھے معلوم تھا اس طرف بارڈر کے اہل کار دونوں زبانیں روانی سے بولتے تھے۔ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ برمی ہیں یا بنگالی۔

وردی والوں میں سے ایک نارچ دکھا رہا تھا۔ ایک میری زنجیر تھامے مویشی کی طرح مجھے ہٹائے لیے جاتا تھا۔ تہہ والا اور تیسرا آدمی خاموشی سے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔

آدھے گھنٹے سے زیادہ ہم جنگل جھاڑی میں چلتے رہے۔ آخر سامنے ہلکی روشنی نظر آئی۔ تہہ والے نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کسی جنگلی پرندے کی آواز نکالی۔ دو تین بار اس نے ایسا کیا تو سامنے سے بھی ویسی ہی آواز سنائی دی تہہ والے نے برمی میں پکار کر کہا۔ ”ہم آرہے ہیں رے۔“

آواز آئی ”آ جاؤ سر۔“

پانی بھرے نالے سے گزر کر ہم اونچی جگہ پر پہنچے تو میں نے دیکھا یہ کسی قسم کی چیک پوسٹ تھی ہمارے پہنچنے ہی کہیں جزیئر چلا دیا گیا۔ بہت سی ٹیوب لائٹیں روشن ہو گئیں۔ میں نے دیکھا ٹیلے پر چار چھ بیرکیں بنی تھیں۔ درمیان میں ایک چووترے پر جھنڈا لگانے کا پول تھا۔ چووترے کے سامنے ایک بڑا سا کمرہ اور برآمد تھا۔ برآمدے کے ستون پر بورڈ نصب تھا جس پر برمی زبان میں چیک پوسٹ کا نام اور نمبر لکھا تھا۔

میں براہِ پنج گیا تھا۔ یعنی سلسیل چوہدری نے مجھے مشرقی پاکستان سے نکال دیا تھا۔

تہہ والا افسر ایک بیرک میں چلا گیا۔ تینوں ہتھیار بند سپاہی مجھے ایک لاک اپ کے سامنے لے گئے۔ لاک اپ پر باہر کہیں سے تیز روشنی چھینکی گئی۔ ایک وردی پوش نے میری تلاشی لی۔ میرے پاؤں کی زنجیر کھول کر منہ کا شیپ بنا کر اس نے مجھے اندر دھکا دے دیا پھر لاک اپ کا آہنی دروازہ بڑی آواز سے بند کر دیا گیا۔ قفل لگا دیا گیا۔

روشنی بھی بند کر دی گئی۔ سپاہیوں میں سے ایک نے سلاخوں کے پار سے روکھے پن سے کہا۔ ”تجھے پانی پینا ہے تو ابھی بتا دے میں ڈیوٹی سے اتر رہا ہوں۔ پلا دوں گا۔“

کا انتظار کر رہے ہیں۔“

جھاڑی میں سے وہی آدمی ہنسا بولا۔ ”ادھر سبھی موجد ار کے مہمان ہیں۔ بھلا اپنا نام تو بتا۔“

”سلسیل چوہدری کہنے لگا۔“ شیر علی نام ہے میرا۔ آج سولہا تاریخ کو مجھے ادھر آنا تھا۔“

جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی اور تین مسلح وردی پوش کارندوں کے ساتھ ایک کالا بھنگ آدمی بنگالی کرتے اور چوخانے والی تہہ میں کاندھے سے ہلکی مشین گن لٹکائے نکلا اور ہماری طرف آیا۔ اس نے چوہدری کو پہچان لیا تھا۔ اس کا حال چال پوچھا۔ بولا۔ ”کیا حال ہیں شیر علی صاحب! خیریت تو ہے؟“

وہ چوہدری کو شیر علی کہہ رہا تھا۔ کسی قسم کے اشارے طے کیے گئے ہوں گے جن کے مطابق باتیں کی جا رہی تھیں۔

چوہدری نے اپنی جیب سے ایک پیکٹ نکال کر تہہ والے کی طرف بڑھا دیا۔ کہنے لگا۔ ”یہ موجد ار صاحب کی چیز لے آیا ہوں۔ گن لو۔“

تہہ والے نے پیکٹ جیب میں ڈال لیا۔ ”بولا شیر علی بھائی کا اور موجد ار کا حساب دوستوں جیسا ہے۔ ہم کیا گنیں۔“

چوہدری ہنسا۔ میری زنجیر تہہ والے کے حوالے کر کے بولا۔ ”اچھا تو اسے سنبھالو۔“

تہہ والے نے زنجیر اپنے ساتھ والے ایک وردی پوش کو پکڑادی پھر اپنے آدمیوں سے بولا۔ ”ارے اس کی شکل پہ ذرا لائن تو دکھانا رے۔“

ایک نے نارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر ڈالی تہہ والا بولا۔ ”ابھی جھوٹی عمر کا ہے مگر دیکھو تو کیسے کیسے کاموں میں پڑ گیا ہے سال۔“

چوہدری نے ہاتھ بڑھایا مصافحہ کیا۔ تہہ والا ہنسا بولا۔ ”تھیک یو بھی۔ اچھا اب شیر علی صاحب! موجد ار کو ہم آپ کا سلام بول دیں گے۔ کو آپریشن کا شکریہ۔“

سلسیل چوہدری نے کہا۔ ”شکریہ تو ہم آپ لوگوں کا ادا کریں گے بھائی بڑی مہربانی۔“

وہ ہنستا ہوا گاڑی میں جا بیٹھا اور ڈرائیور نے لائن جلائے بغیر گاڑی اشارت دی پھر وہ لوگ گاڑی گھما کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ کچھ دیر انجن کی آواز سنائی دئی

میں نے دیکھا وہ جو پلنگ پر تھا جو ہنس رہا تھا مرد نہیں کوئی لڑکی ہے لڑکی بھی کہا۔ اچھی خاصی کھائی پی عورت۔ اب وہ تقریباً پورے پلنگ پر قبضہ کیے لیٹی تھی اور ہنسنے جا رہی تھی۔

میں نے گھبرا کر پلنگ سے اتر جانا چاہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے روک لیا۔

”ظہر۔“

”کون ہو تم؟“ میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

وہ بولی۔ ”بولاری۔“

”بولاری؟ بولاری کون؟“

وہ ہنسی۔ ”تجھے یاد نہیں؟ میرے ساتھ کیسی کیسی تصویریں اتروائی تھیں۔ بے شرم! اور اب پوچھتا ہے بولاری کون؟“

خدا یا! یہ کون عورت گھس آئی ہے؟ وہ لوگ لاک اپ میں بھی مجھے چین نہیں لینے دیتے۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا بلا ہے یہ؟

مگر ہاں بولاری! اچھا یہ وہ عورت ہے جسے سلسیل چوہدری نے میرے ساتھ فرار ہونے اور برما میں داخل ہونے والی کا پارٹ دیا ہے۔ چوہدری کے شیطانی منصوبے میں یہ میری ”داشتہ“ کا رول کر رہی ہے۔ میں زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہٹو! جاؤ نکلو یہاں سے۔ چلو۔“

جواب میں وہ پھر ہنسی۔ بولی۔ ”شیر علی! دونوں کو لڑنا نہیں چاہیے تو مجھے یہاں سے کیوں نکال رہا ہے؟ یہاں میں اپنی مرضی سے تو آئی نہیں۔ ان لوگوں نے ہم دونوں کو بارڈر پار کرتے پکڑا اور بند کر دیا۔ تیرے جاؤ جاؤ کہنے سے میں باہر تو نہیں جاسکتی۔ نا۔ بالکل بھی نہیں۔“

یہ عورت کبھی ہے دونوں کو بارڈر پار کرتے پکڑا ہے۔ ظاہر ہے اپنے مالکوں کا بتایا ہوا مکالمہ دہرا رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ”سن۔ نہ میں نے بارڈر پار کیا ہے نہ تو نے۔ مجھے پکڑ کر لایا گیا ہے اور تو پیسے لے کر ناک کرنے آئی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو پلنگ سے اتر جا۔ نہیں تو بہت بری ہوگی تیرے ساتھ۔“

وہ ہنسی پھر ایک آنکھ دبا کر کہنے لگی۔ ”سونے کیوں نہیں دیتا مجھے؟ سونے دے نا۔ تو بھی سولے بہت تھک گیا ہو گا۔“

میں نے انکار میں سر ہلایا تو وہ فرش پر تھوکتا، جہاں ہی لیتا چلا گیا۔

میں نے تیز روشنی میں دیکھ لیا تھا کہ لاک اپ میں لوہے کا ایک ہی پلنگ بچا ہے پلنگ پر درمی بچھی تھی۔ ایک کبل تہہ کر کے نیچے کی جگہ رکھ دیا گیا تھا۔ پائینٹی کی طرف ایک میلی سی چادر پڑی تھی۔ پلنگ کے سوا لاک اپ میں کچھ نہیں تھا۔

تھکن اور نیند سے لڑکھڑاتا میں بستر پر جا بیٹھا اور جوتے موزے اتار کر لیں گیا۔

یہ میرا قید خانہ تھا۔ میں اب تک چوہدری کے اور اس کے بد معاشوں کے باضابطہ قید میں رہا تھا۔ اب یہ لاک اپ ملی ہے غنیمت ہے اس پر کسی حکومت کا نام تو لکھا ہے۔

بہجان سے نڈھال اور تھکے ہوئے میرے ذہن نے اگلے پچھلے مصائب پر سوچنے سے انکار کر دیا۔ میں نے خود سے کہا۔ ”شیر علی خان۔ نیند بہت ضروری ہے سو جاؤ آگے جو ہوگی دیکھی جائے گی۔“

میں چار پانچ گھنٹے سے زیادہ سویا ہوں گا کہ کسی ان ہونی بات سے بیدار ہو گیا کوئی مجھے پلنگ سے گرائے دیتا تھا۔ میں نے گھبرا کر پلنگ کی پٹی تھامی اور اسے جو اپنے بدن سے ٹھیل ٹھیل کر مجھے گرا دینا چاہتا تھا ہاتھ بڑھا کر اور زور لگاتے ہوئے خود سے دور کرنے کی کوشش کی۔

میں ابھی نیند میں تھا۔ جھنجھلایا ہوا تھا۔ جھنجھلاہٹ اور نیند کے خمار میں مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ کچھ نرم اور گرم سا اور یوں لگا کہ وہ دوسرا جو بھی ہے وہ نیند میں نہیں ہے۔ مجھ سے دور ہٹنے کے بجائے اس دوسرے نے ہاتھ بڑھا کر خود کو مجھ سے اور بھڑا لیا۔ اس طرح میں گرتے گرتے سنبھل گیا تھا۔

مگر وہ جو کوئی بھی تھا جس نے مجھ سے خود کو بھڑا رکھا تھا بہت عجیب سا تھا نا، نا اور عجیب سا اور وہ ہنس رہا تھا۔ میں نے ادھ کچی نیند میں اسے ہٹتے سنا اور میرے نیند بھرے دماغ نے جیسے چمک کر ہاتھ پیروں کو حکم دیا۔ ”اٹھ جاؤ۔“

میں چونک پڑا اور اسے جو مجھ سے بھڑا ہوا تھا جھٹکے سے ہٹاتے ہوئے پلنگ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

لاک اپ میں بتی نہیں تھی مگر برآمدے سے آتی روشنی میں وہ جگہ اتنی ضرور اجل گئی تھی کہ میں نے اسے دیکھ لیا۔

میں تھی۔

جواب میں لاک اپ کے سپاہی نے قہقہہ مارا اور اس بات کو اور زیادہ کھلے پن سے آگے بڑھا کر کہہ دیا۔ عورت گالی دے کر ہنسنے لگی۔ عورت مرد کو اتنی کھلی ڈلی باتیں کرتے میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔

دونوں کو اس طرح کی نامعقول باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ میں پلنگ پر نہیں بیٹھ سکا تھا۔ میں نے غصے میں چادر اور کمبل کھینچ لیا اور لاک اپ کے کونے میں کمبل فرش پر ڈال کر اپنے لیے بستر سا بنالیا۔

ادھر میں بازو کا تکیہ بنا کر فرش پر لیٹا ادھر وہ پلنگ سے اتر کر آئی اور میرے برابر کمبل پر پھیل کر لیٹ گئی۔ میں نے غصے میں ہاتھ چلا دیا جو اس نے بہت مہارت سے اپنے کھلے پنچے پر روکا پھر آزاد دبا کر بالکل میرے کان کے پاس منہ لے جا کر وہ بولی۔

”مار پیٹ نہیں کر۔۔۔ تیرے فائدے کی بات بتاؤں گی۔ میں یہی چاہتی تھی ادھر لاک اپ کے کونے میں ہم لوگ ٹھیک ہیں۔ ادھر اسی لیے تجھے ستا رہی تھی۔ وہ پلنگ تو پورا باہر سے نظر آتا ہے۔ فرش پر ہم دونوں ٹھیک ہیں۔ بات کر سکتے ہیں۔ ابھی تو ایسا کر جھنجھٹ اور غصے کی آواز نکالتا رہ وہ سمجھے گا میں تیرے کو ستا رہی ہوں۔ شروع شروع میں یہی شور کرنا۔ پیچھے راضی باضی بات کرنے لگنا۔ وہ سمجھے گا دوستی ہو گئی۔ یاری دلداری ہو گئی ہے۔ شک نہیں کرے گا وہ۔ ان سوروں کو ایسی باتوں میں مزا آتا ہے۔ سن لے فائدے کی بات ہے۔ تو سمجھ گیا خان؟ سمجھ گیا نا؟“

عورت نے یہ باتیں بڑی سنجیدگی سے کہی تھیں۔ میں نے ہاں میں سر ہلا کر اسے بتا دیا کہ اس کی بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔

وہ اس طرح لیٹ گئی تھی جیسے میری اور اس کی برسوں کی یاریاں دوستیاں ہیں۔ اس نے بازو پھیلا کر میری گردن گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ وہ کوئی تیز گرم خوشبو لگائے ہوئے تھی۔ میرا جی اٹھنے لگا۔ ویسے بھی میں ان سب باتوں کا عادی نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کا بازو ہٹا دیا۔ سرک کر ایک طرف ہو گیا۔

وہ ہنسی دھیرے سے کہنے لگی۔ ”تو میرا کوئی نہیں لگتا۔ سلسیل چوہدری نے تو مال خرچ کیا ہے؟ تجھے پھنسانے کے لیے میں نے اس سے ہزاروں ہزار لیے ہیں۔ ایک صاحب سے وہ میرا باس ہے تو کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی خبر نہیں کیوں مجھے تیرے سے پیار نکر دی ہو گئی ہے۔ جب ادھر تھی پور بپاکستان میں تو چوہدری کے آدمی برابر نظر رکھتے

جی چاہا منہ پر چائنا رسید کر دوں مگر مجھے سکھایا گیا تھا کہ عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا جاتا۔ میں نے بہت غصے میں کہا۔ ”اگر تو بستر سے نہیں اتری تو اٹھا کے پھینک دوں تجھے۔“

وہ پھر بازاری انداز میں آنکھ دبا کر بولی۔ ”اٹھالے آ مجھے اٹھا کے دیکھ۔ اتنی ا نہیں ہوں۔ آکو شش کر لے۔“

یہ مجھے کس پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ پہلے سوچا اس تہہ والے افسر موجود آواز دے کر کہوں کہ اس عورت کو یہاں سے نکالے مگر پھر خیال ہوا وہی لوگ تو اب یہاں چھوڑ کر گئے ہیں۔ یہ خود سے تو آئی نہیں ہوگی۔

میں نے جھنجھلاہٹ میں ہاتھ بڑھا کر عورت کا بازو پکڑا اور جھٹکے سے کچھ میں اسے پلنگ سے گرا دینا چاہتا تھا مگر وہ بھاری تھی پھر خود بھی زور لگا رہی تھی۔ ا۔ تھوڑا سا ہی کھینچ پلایا۔ اتار نہیں سکا۔ عورت ایسے ہنسی جیسے ہم دونوں کوئی کھیل کھیل رہے ہوں۔ اس نے جھٹکا دے کر الٹا مجھے بستر پر کھینچ لینا چاہا۔ میں نے پٹی پر پیر اڑالیا۔ ہر طرح کی کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ یہ سب کرتے ہوئے وہ عورت بولاری قہقہے مارے غ ہنسی ٹھٹھول کر رہی۔

لاک اپ کے باہر اندھیرے میں کسی نے بری میں پکار کر کہا۔ ”ارے آ سے۔ ارے آرام سے۔ ادھر مستی کیوں کر رہے ہو؟ یہ کوئی بد معاشی کا اڈا نہیں لاک اپ ہے۔“

میں نے بھی غصے میں بری زبان میں کہا۔ ”اس سے بڑا بد معاشی کا اڈا اور ک ہو گا۔ اس رنڈی کو میرے ساتھ کیوں بند کر دیا ہے؟“

پکارنے والے نے مزے سے کہا۔ ”یہ تو پہلے سوچا ہوتا۔ اسے میں تو لے نہیں بھاگا ہوں۔ تو ہی لایا ہے۔ رنڈی منڈی جو بھی ہے تیرے ہی پسند کی ہے۔ رے؟ اب شور نہیں کر۔ جیسا بھی ہے جو بھی ہے ادھر آ رہے رے ہو دونوں۔“

میں نے غصے میں اسے گدھا کہہ دیا۔ وہ کوئی ڈھیٹ آدمی تھا بولا۔ ”گدھا نا رے۔ اپنے سے بڑی عورت کو دوڑائے لیے پھرتا ہے۔ ارے ادھر ایسٹ پاکستان ٹر عمر کی کامنی ناریوں کی کمی ہے کیا جو تو یہ پکنا تریل توڑ لایا ہے۔“

عورت ٹھٹھا مار کے ہنسی اپنی کچی بری میں پکار کر اس نے اپنی تہ کرتے ہوئے کوئی فضول سی بے ہودہ بات کہی جو اس کی جسمانی صلاحیتوں کے با

نہیں چڑھی رانفل اٹھا لایا تھا۔ اس کے پیچھے وہ گارڈ ”صاحب صاحب“ کرتا آگیا تھا۔
ناید اسی کے ہاتھ سے موجد ار نے رانفل چھینی ہوگی۔

گارڈ نے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہوئے اپنے افسر کے ہاتھ سے رانفل لے
اور اس کے شانوں کو بازو کے گھیرے میں لے کر اسے مشکل سے چلاتا ہوا بلکہ گھسیٹتا
والاک اپ کے سامنے سے ہٹا لے گیا۔ گارڈ اور اس کا افسر دونوں برمی زبان میں عورت
گندی گندی گالیاں دیتے ہوئے بٹے تھے۔

موجد ار کے جانے پر میں نے یوں محسوس کیا جیسے سامنے سے موت ٹل گئی
ہے۔ میں نے عورت سے دھیرے سے کہا۔ ”کیوں اپنی موت بلا رہی ہے خواہ مخواہ۔“
وہ ہنسی کہنے لگی۔ ”تو ان سالوں کو نہیں سمجھتا۔ یہ سب اگر نہیں کرتی تو وہ شک
ن پڑ جاتا کہ میں ضرور تجھ کو کچھ بول رہی ہوں۔ مجھے خبر ہے، چوہدری نے اس سال
اچھی طرح بھر دیا ہو گا۔ کھوپڑی گرم نہیں کرتی تو سوچ میں پڑ جاتا۔ موجد ار لے جاتا
تھے۔ اب گھٹنے دو گھٹنے کے لیے ٹل گیا ہے سال پونا چل چھوڑ۔ میری بات
نا۔ تیرے کو پتا ہوئے گا۔ یہ چوہدری ایسا کچھ کر رہا ہے کہ تیرا باپ فرنیئر سے
کے ادھر تیرے کو تلاش کرنے میں لگ جائے۔“

”ہاں یہ مجھے پتا ہے۔“

”چوہدری یہ بہانہ کرے گا جیسے وہ تیرے باپ کی مدد کر رہا ہے۔ تو نے
ہداری سے ڈیڑھ لاکھ روپیالے کے کھالیا ہے نا؟“

میں نے گھبرا کر کہا۔ ”نہیں نہیں۔ جھوٹ ہے یہ۔“

عورت بولی۔ ”وہ تو خبر ہے مجھے کہ جھوٹ ہے پر تیرے بابا کو تو نہیں معلوم۔
ہداری اسکو بولے گا ڈیڑھ لاکھ کو چھوڑو۔ میں تو وہ بھول گیا۔ تم بھی بھول جاؤ۔ آؤ بیٹے
چڑا کے لاتے ہیں۔ وہ ادھر ادھر برما، آسام، پوربواکستان میں اسے جگہ جگہ لیے لیے
رے گا ایسا دکھائے گا جیسے تیرے چھڑانے میں بہت پیسہ بھی خرچ کر رہا ہے۔ احسان
کے گاتیر نے باپ پر۔ چھڑا کس نے ہے۔ ادھر تو اس نے بندوبست کیا ہے تجھے سال
رنگ جیل میں رکھنے کا۔ بس اسے تیرے باپ پہ احسان جتنا ہے۔ جب وہ بے چارہ
ٹا طرح لپٹ جائے گا اس جال میں تو چوہدری کہے گا۔ خان صاحب! میری اس
بت کے بدلے میں ذرا سی آسانی کر دو میرے لیے کہ یہ ہوٹل ریٹ ہاؤس جو بھی
انہیں اپنے ہی نام رہنے دو۔“

تھے کہ کہیں میں ان کے خلاف تیری کوئی مدد نہ کر دوں۔ وہ سارے سور میری طبیعت
جانے ہیں۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا تیرے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کروں گی۔ وہ حرام
خور تیرے ساتھ جو کر رہے ہیں اچھا نہیں کر رہے۔“

اب جو وہ اتنے قریب سے بات کر رہی تھی۔ بالکل میرے چہرے کے سامنے
سانس لے رہی تھی تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ نشہ کیے ہوئے ہے۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔
خواہ مخواہ میں اس نشے باز عورت کی باتوں میں آگیا۔ یقیناً یہ فضول بکواس کرے گی۔

میں بستر پر اٹھ بیٹھا۔ وہ کبھی میں اس کی ہدایات کے مطابق ڈیوٹی والے سپاہی
کو سنانے کے لیے ”جھنجھٹ“ کر رہا ہوں مگر جب میں نے شراب کی بو سے بچنے کے لیے
ناک پر ہاتھ رکھا اور اس سے دور ہو گیا تو ہلکی ہنسی کے ساتھ بولی۔ ”میرا قصور نہیں ہے
وہ موجد ار کتا مجھے لے گیا تھا۔ اب خود بھی پی کے پڑا ہے۔ میں کیا کرتی۔ ان سب کا
خوش کرنا ہے۔ سلسیل چوہدری سے پیسے لیے ہیں لیکن خان! میں پوری ہوش مر
ہوں۔ بے کار بکواس نہیں کر رہی۔ سن مجھے جو اندر کی باتیں معلوم ہیں۔ میں چاہتی ہوں
تجھے بھی معلوم ہو جائیں۔ تو کچھ نہ کچھ بندوبست کر لے گا۔ یہ میں چاہتی ہوں۔ سمجھا
کہیں بے خبری میں اندھیرے میں نہیں مارا جائے گا تو۔“

اس عورت بولاری نے اپنی بانہ کا حلقہ تنگ کر دیا۔ میرے چہرے سے اپنا چہرہ
بھڑا دیا۔ موجد ار سمجھا ہو گا ”یاری دلداری“ چل رہی ہے۔ ہنس کر لڑکھائی زبان۔
بولا۔ ”چل ری چل بس آجا۔“

بولاری نے چہرہ گھا کر باہر دیکھا میں نے سکون کا سانس لیا۔ شراب کی بو۔
میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اب اس نے زیادہ ہی نشے والی آواز بنا کر کہا۔ ”جا جا۔ تیرے۔
بات نہیں کرتی۔ جا اپنی بوتل بغل میں لے کے سو جا۔ اور تو تیرا کوئی کام ہی نہیں۔“
موجد ار لڑنا نہیں چاہتا تھا بولا۔ ”چل بکواس نہیں کر۔ اٹھ۔ آ جا بس۔“
کہہ رہا ہوں۔

بولاری نے حقارت سے اس کے الفاظ دہرائے۔ ”میں کہہ راؤں۔“
کہنے جو گا ہی ہے تو۔ زبان ہی چلتی ہے تیری۔ موجد ار۔ ہا ہا سالہا جہان دار۔
جہان۔ زبان کا ہی رستم ہے۔ باقی تترت تو توں۔“ بولاری نے منہ پر
رکھ کر ہاتھی کی چٹکڑ جیسی آواز نکالی تھی۔

میں نے خوف زدہ ہو کر دیکھا۔ موجد ار طیش میں آکر پیچھے جھپٹ کر گیا تھا

”جتنے جائیں گے۔“

”آسانی سے کیسے۔ نہیں رے، بہت تکلیف، بہت پریشانی اٹھا کے ہی تیرا باپ چوہدری کو اپنا ہمدرد اپنا دوست سمجھے گا۔ ایسا کوئی مذاق تو نہیں ہے نا؟“

ہاں ایسا کوئی مذاق تو نہیں ہے لیکن میرا دل یہ بھی جانتا تھا کہ بابا مجھ سے محبت کرتے ہیں وہ مجھ سے ناراض بے شک ہوں گے لیکن مجھ سے بے تعلق نہیں ہو سکتے۔ وہ مجھ سے ملنے کی کوشش کریں گے۔ میری خیر خبر ضرور لیں گے۔ ہاں پھر تو ہو سکتا ہے میری تلاش کے بہانے سے چوہدری ان کی نظروں میں اعتبار حاصل کر لے۔

بولاری کا خیال غلط تھا کہ اس نے چال بازی سے جو موجد ار کو کھسکا دیا ہے تو اب اسے گھٹنے دو گھٹنے کی فرصت ہو گئی ہے۔

وہ مجھ سے گھٹ گھٹ کر باتیں کر رہی تھی۔ ابھی آدھا پون گھنٹا ہی ہوا ہو گا کہ موجد ار پوری وردی میں اپنے ہتھیار بند ماتحتوں کے ساتھ لاک اپ میں دھڑ دھڑاتا ہوا ٹھس آیا اور مجھ سے بھڑ کر بیٹھی ہوئی بے چاری بے خبر عورت کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لے گیا۔ بولاری نے اسے گالی گلوچ سے قابو کرنا چاہا مگر شاید موجد ار کا نشہ اثر چکا تھا۔ اس نے جما جما کے اپنے وردی کے بوٹ سے اسے دو تین ٹھو کریں ماریں۔ اس کے ساتھ آنے والے سپاہی بولاری کو ٹانگوں بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹے ہوئے لے گئے۔ میں نے ایک بار احتجاج کیا تو موجد ار نے ایل ایم جی کا بٹ چلا کر مجھے زخمی کرنے کی کوشش کی۔ وہ تو میں اچانک ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ جھجھکتی ہوئی سی چوٹ لگی۔ میں خاموش ہو گیا تو وہ لوگ میری طرف سے جیسے بے تعلق ہو گئے۔ اصل میں تو وہ عورت کو لے جانے آئے تھے۔

بہت دیر تک بولاری کے چیخنے، گالیاں بکنے کی آوازیں آتی رہیں موجد ار عورت کو اس کی بدزبانی کی سزا دے رہا تھا۔ اپنی مردانگی دکھا رہا تھا۔

میں کچھ دیر کونے میں پڑے کبل پر لیٹتا بیٹھا رہا پھر پلنگ پر آ بیٹھتا۔ میں برابر بولاری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیسی بے خوف اور باؤلی عورت ہے وہ اگر سلسیل چوہدری کا پورا منصوبہ مجھے نہ بتاتی تو میں اندھیرے میں رہتا۔ مطلب اندھیرے میں مارا جاتا۔ اب جو بھگتنا ہے لاعلمی میں نہیں بھگتوں گا اور کچھ نہیں ہو گا تو اس طرح میری ہمت ہی قائم رہے گی۔

یہی سب سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

میں نے کہا۔ ”اوہ! یہ تو حرام زدگی ہے۔“

وہ بولی۔ ”ہاں نا۔ چوہدری سالا خان صاحب کو بولے گا میں نے سرکاری سروس میں اٹلے سیدھے طریقے سے کمائی کر کے پیسا جوڑا ہے اگر سامنے آکے بڑوں کردں گا تو سزاوار انکوائری بٹھا دے گی پکڑا جاؤں گا۔ اسی لیے یہ سب کر رہا ہوں۔ تیرا باپ بولے گا یہ کون بڑی بات ہے اور وہ چوہدری کے جال میں پھنس جائے گا۔“

میں اندھیرے میں اس کی چمک دار آنکھوں اور چمک دار باتوں پر دھیان دے بیٹھا تھا۔ اس نے پھر دوستوں کی طرح گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ کہنے لگی۔ ”ابھی اگر جاسوسی اڈے کا پول کھل جاتا ہے تو سلسیل چوہدری خاموشی سے کھسک جائے گا۔ کلکتے بھاگ جائے گا۔ گورنمنٹ تیرے باپ کو دھر لے گی۔ وہ جدھر بھی ہوئے گا۔ فرنیر میں، پنجاب میں، ادھر پور بپاکستان میں جدھر بھی اور جو کچھ نہیں ہوا تو دیے کہ کو شک شبہ بھی نہیں ہوئے گا۔ بھلا کون شک کرے گا کہ ایک پٹھان بھائی جس نے بھرا ایمان داری سے افسری کی ہے ادھر انڈیا کا جاسوسی کا اڈا بنا کے بیٹھ سکتا ہے۔ اسی لیے چوہدری نے یہ جال ڈالا ہے کہ اس کا کام بے دھڑک چلتا رہے۔“

”اور میں؟ میرا کیا سوچا ہے ان لوگوں نے؟“

وہ بولی۔ ”بتایا تو جیل کا لے گا۔ سال بھر ادھر ہی برما میں رہے گا۔“

”سال بھر بعد تو چھوڑیں گے یہ لوگ۔ پھر چوہدری کیسے بچے گا؟“

”چوہدری سوچتا ہے سال بھر بعد کی خیر ہے جب تک کچھ بھی ہو جائے گا۔“

”مطلب؟“

”مطلب۔۔۔ جاسوسی کا اڈا وہ لوگ نے اپنے دل بہلانے کو تو نہیں کھولا۔“

سال بھر میں وہ ادھر پور بپاکستان میں کچھ کر دیں گے۔“

”کیا کر دیں گے؟“

”کچھ بھی۔۔۔ کوئی گڑبڑ۔۔۔ حملہ۔۔۔ میرے کو کیا خبر۔“

”میں نہیں مانتا۔“

”تو کیا نہیں مانتا؟“

”اتنی ہمت نہیں ہے ان میں۔“

بولاری کہنے لگی۔ ”ہاں، نہیں ہوگی پر ہمت آنے دیر کتنی لگتی ہے؟“

”اور میں یہ بھی نہیں مانتا کہ میرے بابا اتنی آسانی سے چوہدری کے جال

اس نے مجھے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ افسر نے ایک کاغذ پر دستخط کر کے گویا میری رسید موجددار کے حوالے کر دی۔ اس کے آدمیوں نے مجھے گہرے ہرے رنگ کے ایک ٹرک میں لے جاکے بٹھادیا۔

ٹرک کی طرف جاتے ہوئے میں نے بیرکوں کی کھڑکیوں سے کمروں کے کھلے دروازوں سے اندر دیکھنا چاہا۔ موجددار ٹرک تک ساتھ آیا تھا۔ سمجھ گیا کہ مجھے بولاری کی تلاش ہے۔

وہ عورت مجھے نظر نہ آئی۔ عجیب سی مایوسی ہوئی۔ موجددار میرا چہرہ دیکھ کر کبکٹی سے مسکرا رہا تھا۔

ہری وردی والا افسر گاڑی میں بیٹھنے کو بڑھا تو میں نے چیخ کر کہا۔ ”سر! آپ بریز آرمی کے ذمہ دار افسر ہیں۔ سنئے اس پولیس والے نے ایک انڈین ایجنٹ سے بہت بھاری رشوت لی ہے۔ سر! مجھے ایسٹ پاکستان سے اغوا کر کے لایا گیا ہے۔ خدا جانتا ہے میں نے پاکستان برما سرحد خود سے پار نہیں کی۔ یہ بد معاش موجددار اور اس کے شریک جرم مجھے اغوا کر کے لائے ہیں۔“

میں نے یہ سب کچھ برمی زبان میں نہیں انگریزی میں کہا تھا۔ میں چاہتا تھا چیک پوسٹ کے گارڈ اور ہری وردی والے فوجی جوان میری باتیں سمجھ نہ سکیں۔

ہری وردی والے افسر نے غور سے میری پوری بات سنی۔ پھر سوکھے سے منہ سے انگریزی میں کہنے لگا۔ ”بل شٹ! لڑکے تمہیں جو کہنا ہو کورٹ میں کہنا۔ میرا کام صرف اتنا ہے کہ تمہیں لے جا کے متعلقہ حکام کے حوالے کر دوں اور بس۔“

میں نے پھر کہا۔ ”سر! میری بات تو سنئے۔ یہ رشوت خور بریز گورنمنٹ کو اور آپ کو سب کو دھوکا دے رہا ہے۔“

افسر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے آنکھیں نکال کر برمی زبان میں کہا۔ ”کو اس بندہ کو بالکل بند اور سمجھ لو تم ایسے بد معاشوں کو سدھارنا آتا ہے مجھے۔“

موجددار پیچھے کھڑا ہوا اطمینان سے مسکرائے جا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا ان سب کی ملی بھگت سے یہ کام ہو رہا ہے۔

میں نے خود سے کہا۔ ”شیر علی! توانائی خرچ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بیٹھو خاموش۔“ اور میں سر جھکا کر چپ بیٹھ گیا۔

میرے اس طرح چیختے پکارنے کا یہ اثر ہوا کہ ہری وردی والے افسر کے حکم

دن نکلنے پر آنکھ کھلی تو لاک اپ کی سلاخوں کے پار مجھے بڑی گہما گہمی نظر آئی۔ چیک پوسٹ کے سبھی اہلکار وردیوں میں تھے اور ہتھیار اٹھائے ہوئے تھے۔ کئی بات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

وہ گارڈ جس نے رات کی ڈیوٹی ختم کرتے ہوئے میرے پاس آکر روکھے پن سے پانی لانے کی پیشکش کی تھی مجھے اٹھتا دیکھ کر گیا اور کاغذ کی تھیلی میں کٹی ہوئی ڈبل روٹی اور مٹی کے پیالے میں شکر پڑا دی لے کر آگیا۔ بولا۔ ”لے۔ کھالے تو آواز دے لینا پانی اور چائے لادوں گا۔“

نہ معلوم کیوں یہ روکھے پن سے بات کرتا تھا۔ آدمی زبان کا کڑوا ہو گا مگر بہر حال ہمدرد تھا۔

میں ناشتا کر چکا تو گارڈ ایک صراحی اور مٹی کے پیالے میں چائے لے کر آگیا۔ چائے گرم تھی۔ میں نے اس کی تعریف کی اور گارڈ کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے منہ بگاڑ کر مجھے دیکھا جواب میں کچھ نہیں کہا۔ خالی برتن اور کاغذ کی تھیلیاں سیٹ کر چلتا ہوا۔ تاہم کے بعد میں پھر کچھ دیر لاک اپ میں ٹہلتا رہا۔ پلنگ پر آبیٹھا۔ تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ رات کے بعد سے بولاری کی آواز بھی سن نہیں دی تھی۔ نہ معلوم ان لوگوں نے اس کا کیا حشر کیا ہے۔

دوپہر سے پہلے کہیں سے ہری وردیوں والے کوئی آٹھ دس فوجی آگئے۔ سلاخوں کے پار سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ مجھے دیکھتے رہے۔ شاید میرے بارے میں بات کرتے رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے چڑیا گھر میں لائے گئے کسی نئے جانور کو دیکھتے ہیں۔ کونے میں آکے بیٹھ گیا پھر بھی وہ لوگ نہیں ہٹے۔ شش شش کر کے مجھے متوجہ کرنا سامنے بلانا چاہتے تھے۔

اچانک موجددار کے ساتھ ہری وردی والا ایک افسر اور اس کے گارڈ لاک اپ میں داخل ہو گئے۔ ہری وردی والے نے ہاتھ میں ایک چھوٹا چمک دار بید لے رکھا۔ بید کے اشارے سے اس نے مجھے اٹھنے کو کہا۔ میں کھڑا ہو گیا تو اس نے آس پاس گھومنا میرا جائزہ لیا۔ لاک اپ کے ایک گوشے سے دوسرے تک چلنے کا اشارہ کیا۔ مجھے ہوئے دیکھتا رہا۔ سامنے روک کر مجھے حکم دیا کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر ”کراؤں“ جوتے موزے اتار کر پیروں کی انگلیاں گنواؤں۔

اس معائنے کے بعد ہری وردی والے افسر نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ

اور اس سے کہا۔ جاڑ کے کی آنکھوں سے پٹی کھول دے۔ اسے کچن میں لے جا کے کچھ کھلا بھی دینا۔

ایک ہری وردی والے نے آنکھوں کی پٹی کھول دی اور ہتھکڑی کی زنجیر سنہال کر مجھے نیچے باورچی خانے کی طرف لے گیا۔

خلاصوں کو میرے بارے میں علم تھا۔ انہوں نے پہلے سے کچھ دلیہ جیسا اور پھلی تیار کر کے رکھی تھی۔ ساتھ میں چاول بھی تھے۔ مجھے انسانوں کی طرح بٹھا کر ان لوگوں نے کھانا کھلایا۔

میں نے کھانا ختم کیا تو اسٹیر کے خلاصی کو لیے ہوئے ایک اور ہری وردی والا جوان آگیا۔ اس نے پہلے والے گارڈ سے میری ہتھکڑی کی زنجیر لے لی اور یہ لوگ مجھے لے کر اسٹیر بوٹ کے نچلے حصے میں ایک طرف چل پڑے۔ خلاصی رہنمائی کر رہا تھا۔

ہم جہاں رکے وہ ایک چھوٹا کیمین یا اسٹور سا تھا جس میں پرانی ترپالیں اوپر تلے تہ کی ہوئی رکھی تھیں لیکن کیمین کی چھت سے موٹے تار کے پنجرے میں بند ایک پیلا بلب جل رہا تھا جس کی کمزور روشنی میں میں نے دیکھا کہ کیمین میں دو آدمی پہلے سے موجود ہیں۔

ہری وردی والے گارڈ نے مجھے کیمین میں ٹھیل دیا اور بغیر کچھ کہے میری ہتھکڑی کھول دی۔ پہلے سے بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک نے کیمین میں میرے آنے پر احتجاج سا کیا۔ اسے اعتراض تھا کہ یہاں جگہ نہیں ہے پھر کیوں وہ ایک اور قیدی کو لے آئے ہیں۔

یہ آدمی خواہ مخواہ جھنجٹ کر رہا تھا۔ کیمین چھوٹا تھا مگر تین چار آدمی تو اس میں آرام سے آسکتے تھے۔

گارڈ نے بڑی آواز کے ساتھ کیمین کا دروازہ بند کیا اور باہر سے بولٹ چڑھا کر تلاؤ ڈال دیا۔ میں نے دیکھا کیمین کے دروازے میں آدھے حصے میں موٹی موٹی سلاخیں جڑی تھیں۔ باہر سے ہوا اور آوازیں چلی آرہی تھیں۔ قید خانہ برا نہیں تھا۔ میں فوراً سو جانا چاہتا تھا۔ دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا میں اپنی سونے کی جگہ بنانے کو بڑھ رہا تھا کہ اسی بڑھے نے جو ایک قیدی کے اضافے پر بڑبڑا رہا تھا چیخ کر مجھ سے کہا۔ ”پرے ہٹ۔ ادھر کیوں جا رہا ہے؟“ جس طرف سے وہ مجھے دور رکھنا چاہتا تھا اس طرف اس کا ساتھی چادر لپیٹ بیٹھا تھا۔

سے میری آنکھوں پر کس کے پٹی باندھ دی گئی۔

ٹرک نہ معلوم کس طرف روانہ ہو گیا۔

ٹرک کئی گھنٹے چلتا رہا۔ ایک بار یہ لوگ رکے بھی کھانا کھانے اور چائے پانے کو۔ مجھے انہوں نے پینے کا پانی بھی نہ دیا۔ میں اپنے اندھیرے اور اپنی مایوسی میں بیٹھا اپنے چیز چیز کھانا کھاتے، پانی اور چائے سترپتے سنتا رہا۔ کوئی آدھے گھنٹے آرام کرنے کے بارے میں نہ چل پڑے۔

شام ہوتے ہوئے ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں پانی کی لپ لپ سنائی دے رہی تھی میں نے ہوا کو سونگھ کر معلوم کیا کہ دریا یا سمندر کا قریب ہے۔ یہاں ٹرک کافی دیر رکا وہ لوگ زیادہ تر خاموش رہے مگر ادھر ادھر کے ایک جملے لفظ یا آس پاس کی آوازیں میں سمجھ گیا کہ آگے کا سفر کسی اسٹیر یا کشتی پر ہوگا۔

آخر کنارے پر کشتی یا چھوٹے اسٹیر کے ٹکٹے کی آوازیں سنائی دیں اور کچھ بعد مجھے اسٹیر پر سوار کرا دیا گیا۔ فوجیوں میں سے ایک میری ہتھکڑی کی زنجیر سنہال رہا تھا۔ دوسرے نے اپنے سخت پنچے میں میرا بازو جکڑ رکھا تھا۔ مجھے لے جا کر انہوں نے عرشے پر بٹھا دیا۔

میں نے آوازوں سے اندازہ لگایا کہ ہری وردی والا افسر کچھ لوگوں کو ٹرک ساتھ واپس بھیج رہا ہے۔ کچھ اس کے ساتھ اسٹیر پر رہیں گے۔

کسی خلاصی نے شاید خود ہی رحم کھا کے یا کسی اور کے اشارے پر چھوٹے کیلے میرے سامنے ڈال دیے اور میرا ہاتھ کیلوں سے مس کر کے دھیرے سے بولا۔

”کھالے۔“

مجھے علم نہیں تھا یہ کون سا دریا یا سمندر تھا۔ بس اتنا اندازہ لگا لیا کہ اسٹیر مسافر نہیں لے رہی تھی۔ رکے بغیر چلی جا رہی تھی شاید یہ سرکاری بوٹ تھی۔

شروع رات میں بھاری بوٹوں کی دھمک اور دوسری آوازوں سے میں بھی معلوم کر لیا کہ عرشے پر ایک طرف میز کرسی بچھا کر مجھے لانے والا افسر اور آنا خدا شراب پی رہے ہیں۔ وہ کبھی بنگلا کبھی برمی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ لفظ نہیں دیتے تھے مگر ایک بار میں نے محسوس کیا کہ بوٹ کے کپتان نے آرمی افسر میرے بارے میں کچھ کہا ہے اور اس نے سختی سے انکار کر دیا ہے۔ کچھ دیر بعد بوٹ نے شاید پھر وہی بات کی تو افسر نے نشے میں لڑکھڑاتی اونچی آواز میں اپنے آدمی

مجھے بڑھے کی بات بری لگی میں نے چمک کر کہا۔ ”او تو نے جگہ خریدی ہے؟“
 ”ہے؟ بولتا ہے کیوں جا رہا ہے ادھر؟“
 بڑھا میری طرف غصے سے مڑا۔ وہ کوئی بہت سخت بات کہنا چاہتا تھا مگر اپنا

رک گیا، بولا۔ ”ارے اتم؟“
 کیا مطلب؟ میں نے بلب کی پیلی کمزور روشنی میں اسے غور سے دیکھا،
 کیسے جانتا ہے یہ آدمی؟

اوہ! کانسیر بازار کے قبائلی میلے کا بوڑھا مداری۔ یہ وہی تھا۔ وہ ایک دم کرا
 لگ رہا تھا۔ ڈاڑھی بھی بڑھ آئی تھی مگر میں اسے پہچان گیا۔ میں بوڑھے مداری اس
 پوتا پوتی اور ریتھ کے بارے میں برابر سوچتا رہا تھا۔ اسے زندہ سلامت دیکھ کر خوش
 ہوئی۔ میں نے کہا۔ ”تم؟ اس طرح؟“ بچے کہاں ہیں؟ تمہارے پوتا پوتی؟“
 اوہو! یہ بے چاری بھی قید میں ہے۔

مداری نے چادر میں لپٹے بیولے کی طرف اشارہ کیا، بولا۔ ”پوتی یہ را
 میری۔“

”اور لڑکا؟ تمہارا پوتا؟“ لڑکی کے منہ سے سسکی کی آواز نکلی۔ میں نے ٹا
 غلط سوال کر دیا تھا۔

مداری نے کھٹک کر اپنا گلا صاف کیا، ”پوتا؟“ وہ مارا گیا۔ حرام کے؛
 نے مار دیا اس کو۔“

”مگر کیسے؟“ یہ میرا سوال نہیں تکلیف کی چیز تھی۔
 ”کیسے؟“ بوڑھے نے سوال دہرایا۔ ”ہم بھاگ رہے تھے، وہ گولی چلا رہے
 بس۔ لڑکے کو گولی لگ گئی۔ مر گیا۔“ چادر میں لپٹی اس کی پوتی نے اب آواز سے
 شروع کر دیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا ان دونوں کو کیسے تسلی دوں۔ منہ سے انسو
 بے معنی آواز نکال کر رہ گیا۔

مداری پھر کھٹکرا۔ وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پوچھنے لگا۔ ”تم
 بد معاشوں کے ہاتھ کیسے لگے؟ یہاں برما میں کیا کر رہے تھے؟“
 میں نے مختصر اُبتا دیا کہ سلسیل چوہدری نے کیا سازش کی ہے اور ا
 کہاں کہاں مجھے بند رکھا ہے۔

میں پوچھنا چاہتا تھا وہ دونوں کیسے گرفتار ہو گئے۔ میں اس عورت بولاری کی
 بات کی تصدیق بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑے میاں سے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ چوہدری اور
 اس کا بھتیجا۔ یہ لوگ تمہارے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟“
 مداری ایک منٹ تک چپ بیٹھا دیوار تکتا رہا پھر بولا۔ ”اب تو دشمن دوست کی
 پہچان صاف ہو گئی ہے۔ پہلے میں ہر ایک سے ڈرتا رہتا تھا۔ پھر بھی تم سے اس وقت
 جھوٹ نہیں کہا تھا۔ باز لڑکا ڈرائیور میری پوتی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ سچ ہے مگر وہ
 لوگ بہت پہلے سے میرے پیچھے تھے۔ ڈرائیور کی شادی کی وجہ سے نہیں۔ وجہ کچھ
 اور تھی۔“
 میں نے آہستہ سے کہا۔ ”وجہ شاید مجھے معلوم ہے۔ یہ بتاؤ کیا دتہ نام کا کوئی
 آدمی اصل وجہ ہے؟“
 مداری میری صورت دیکھنے لگا۔ پھر دھیرے سے پوچھنے لگا۔ ”کیا تمہیں خبر
 ہے؟“

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔
 بوڑھا مداری بولا۔ ”ہاں میں دتہ کو جانتا ہوں۔ وہ انڈیا کے لیے جاسوسی کرتا
 ہے۔ پہلے یہاں تھا برما میں۔ اب پاکستان میں ہے۔ میں نے سوم ناتھ دتہ کو سلسیل
 چوہدری اور باز لڑکے ساتھ وہاں میلے میں دیکھا۔ اسے ایک ہی نظر میں پہچان گیا تھا میں۔
 اپنے پوتا پوتی کی وجہ سے میں نے سوچا ان لوگوں کی نظروں سے بچ چکا کر چیکے سے نکل
 جاؤں گا مگر وہ مجھے دیکھ چکے تھے۔ انہیں ڈر تھا اگر میں نے پاکستان کے افسروں کو دتہ کے
 بارے میں بتا دیا تو جو کچھ وہ کرنے جا رہے ہیں نہیں ہو سکے گا۔ مجھے قابو کرنا ضروری تھا
 اس لیے وہ میری نگرانی کرتے رہے۔ میں پھنس گیا۔ نکل نہ سکا۔ میلے میں آنے والے
 قافلے سب چلے گئے۔ بس میں رہ گیا اور میرے دشمن رہ گئے۔ اتفاق دیکھو میں جہاں چٹائی
 کی چھت ڈالے پڑا تھا۔ اسی جگہ کو انہوں نے اپنے اڈے کے لیے چنا تھا۔ تم نے رحم کھا
 کے کچھ دینا دلانا آنا جانا شروع کیا تو ذرا اہمیت ہوئی۔ سوچا نکل جاؤں گا تم سے مدد لے لوں
 گا۔ اب یہ کیا معلوم تھا کہ تم بھی اس چکر میں پھنس جاؤ گے۔“

میں نے تسلی دی۔ ”اب ہم دو ہیں۔ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔“
 وہ آہستہ سے بولا۔ ”نہیں ہم تین ہیں۔ ایک لڑکی ہے۔ لڑکی ساتھ ہو تو دس
 کی جماعت کی طاقت بھی گھٹ کے دو جتنی رہ جاتی ہے۔“

میرا دل ایک دم جیسے سرد ہو گیا۔ یہ حرام خور شراب کے نشے میں دیوانہ ہو کر عورت کی تلاش میں نکلا ہے مگر عورت کیسی؟ مداری کی پوتی تو غریب تیرہ برس کی لڑکی تھی۔

افسر کی بات سن کر لڑکی اپنی چادر میں سٹ گئی۔ بوڑھے مداری نے ایک بازو بڑھا کر پوتی کو خود سے قریب کر لیا۔ اس نے دھیرے سے مجھے مخاطب کیا تھا۔ ”خان!“ میں نے بھی اسے آہستہ سے آواز دی۔ ”بابا۔ یہ تمہاری بری فوج کا افسر ہے۔ یہی مجھے بارڈر سے لے کر آیا ہے۔“

اس اثنا میں بری افسر نے مارچ کی روشنی پھراتے ہوئے لڑکی کا چہرہ تلاش کر لیا تھا۔

اس نے پھر اپنی مکروہ آواز میں کہا۔ ”یہ! اے تم آؤ۔۔۔ چلو میرے ساتھ۔“

لڑکی نے سٹھی ہوئی سی چیخ ماری۔ میں نے ڈپٹ کر انگریزی میں کہا۔ ”نہیں آفیسر۔“

اس کے اور میرے بڑوں کے پچھلے حاکم یہی زبان بولتے ہوئے اس کے ملک اور میرے ملک میں آگھے تھے اور دو سو برس سے زیادہ ہم پر حکومت کرتے رہے تھے۔ میرے خیال میں یہ موثر زبان تھی۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں! یہ لڑکی برمانی شہری ہے۔ اپنے کمیشن کی رو سے تم اس کے محافظ ہو پیشہ ور سپاہی کا حلف اٹھایا ہے تم نے۔ اس جیسی تمام لڑکیوں کی حفاظت کا حلف اٹھایا ہے۔ اسے اپنے دادا کے ساتھ رہنے دو۔ جاؤ یہاں سے۔“

ہری وردی والے افسر نے تھوک اڑاتے ہوئے کہا۔ ”بل شٹ! حلف کی اور اس کے دادا کی ایسی تیسی۔ تو کون ہے؟ اس کا دلال؟“

میرے ہنگش خون نے ابل کے مجھے حکم دیا۔ چڑھ دوڑ اس بد زبان سور پر مگر مصلحت کا تقاضا تھا میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”میں پشتون ہوں۔ ہم لوگ اپنی اور سب انسانوں کی آبرو کی قیمت جانتے ہیں۔ شاید دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں۔“

”دوسرے کون؟“ اس کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی ہو گی۔ لہجے کی لا علمی سے معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”دوسرے یعنی وہ بعض بے غیرت بری افسر جو شراب پی کر سور

بوڑھا عجیب بات کر رہا تھا مگر جس حالات سے وہ گزرا تھا شاید ایسے حالات میں یہ بات سچ ہوتی ہو گی۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ تمہیں کہاں سے لار ہے ہیں؟“
 بولا۔ ”بنگل سے۔ وہاں انہوں نے میرے پوتے کو مار دیا تھا۔ ہمیں پکڑ لیا تھا۔ بہت دن ادھر ہی دونوں کو قید رکھا۔ تمہارے نوکر اس پٹھان لڑکے کو بھی وہیں ہمارے ساتھ رکھا تھا۔

اپنے وفادار ساتھی میر باز کے بارے میں پہلی بار میں کوئی ایسی خبر سن رہا تھا جس پر اعتبار کیا جاسکتا تھا۔

مداری کہنے لگا۔ ”تمہارے نوکر کی وجہ سے مجھے حوصلہ تھا مگر دو روز پہلے یہ لوگ ہمیں برمالے آئے۔ اسے شاید وہیں رکھا ہو گا۔“

میں نے سوچا مجھے تو یہ اس لیے لائے ہیں کہ برما میں غیر قانونی داخلے کے جرم میں سال بھر روک رکھیں گے۔ بوڑھا اور اس کی پوتی تو یہیں کے رہنے والے ہیں انہیں یہاں کیوں لائے ہیں؟ خیر جو بھی ہو ممکن ہے یہاں آنے سے ان کے لیے کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔

میں نے کہا۔ ”سچ پوچھو تو تمہارا اپنے ملک میں آنا ادھر پھنسنے رہنے سے تو اچھا ہے ادھر برما میں تمہارے اپنے لوگ ہیں خبر لگے گی تو تمہارے لیے ضرور کچھ کریں گے۔“

وہ بھیجی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہاں۔ اگر خبر لگے گی تو۔۔۔“

بہ مشکل آدھا گھٹنا ہمیں اس قید خانے میں آئے ہوا ہو گا کہ اسٹیر کے انجن کی آواز بدلی اور پھر اچانک انجن بند ہو گیا۔ ہمارے مختصر قید خانے میں جلتی پیلی بتی بجھ گئی۔

اندھیرا ہوا تو بوڑھے مداری نے پوتی کو اپنی زبان میں تسلی دی بولا: ”فکر نہ کر ابھی آجائے گی روشنی۔“

کچھ دیر گھپ اندھیرا رہا پھر بھاری بوٹوں کی آواز کے ساتھ مارچ کی روشنی پھراتا ہوا کوئی ہماری کوشٹری کے دروازے تک پہنچا۔ اس نے ہم پر مارچ کی روشنی ڈالی اور بھاری آواز میں بولا۔ ”کہاں ہے؟“

میں نے آواز پہچان لی۔ یہ ہری وردی والا آرمی آفیسر تھا۔ اس نے پھر نٹے سے بدلی ہوئی بھاری آواز میں پوچھا۔ ”ارے کہاں ہے وہ لڑکی کہاں ہے؟“

یہاں سر تا سر سیاہ رینگھ اٹھ کر کھڑا ہو رہا تھا۔

بدحواسی یا واقعی بے ہوشی کے باوجود میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا مگر مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کم سے کم میں نے اپنے زور زور سے دھڑکتے دل میں محسوس کیا کہ میں اور مداری کی پوتی۔ ہم دونوں اب بالکل محفوظ ہیں۔

رینگھ نے غصے سے بلبلاتے ہوئے برمی افسر کی طرف جست کی۔

میں اسے جست ہی کہوں گا اگرچہ ایسا دیو قامت بھاری بھر کم رینگھ اتنی محدود جگہ میں کیونکر جست کر سکتا تھا مگر رینگھ اچلا اور اس سے پہلے کہ آرمی آفیسر اپنا ہتھیار والا ہاتھ سامنے لاتا بھیاں سیاہ رینگھ نے اسے جادو بچا۔

بس ایک غیر انسانی گز گڑا ہٹ اور نرم لکڑی کی طرح ہڈی چنکنے کی آواز سنائی دی اور برمی فوج کی ہری وردی میں لپٹا انسانی جسم۔ مردہ جسم ادھڑی ہوئی چیتھڑا گڑیا کی طرح رینگھ کے بازوؤں سے نکل کر اسٹیر کے عرشے پر بڑی آواز کے ساتھ گرا۔ گرا نہیں پھینکا گیا۔ اسٹیل کے فرش پر کاسہ سر کے اخروٹ کی طرح ٹوٹنے کی آواز سنائی دی اور یہ ادھڑے ہوئے افسر کے جسم سے پیدا ہونے والی آخری آواز تھی۔

لمحے بھر سناٹا رہا۔ پھر لوگوں کے زور زور سے چیخنے، پکارنے اور دوڑتے ہوئے ادھر ادھر آنے کی آواز آنے لگیں۔

فوجی افسر کے ماتھوں، اسٹیر کے عملے اور کپتان کو کسی جبلی اشارے سے خبر مل گئی ہو گی کہ اور نشے اور ہوسناکی میں لتھڑے ان کے افسر کو کسی طرح کا پر تشدد خاتمہ نصیب ہو گیا ہے۔

لڑکی میری طرف گھومی اور اس نے پہلی بار مجھے مخاطب کر کے کوئی فقرہ کہا۔ ”ادھر چلو۔ ان لوگ کی چھوٹی نشی پانی میں گرا دو۔ دونوں بیٹھ کے نکل چلیں گے۔“

میری سمجھ میں کچھ آ رہا تھا۔ کچھ نہیں مگر میں نے پوچھا۔ ”اور تمہارا ادا؟“ ”وہ آجائے گا۔ جلدی کرو چلو۔“ لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور عرشے پر جانے کے لیے اندھیرے میں بے خوفی سے ایک طرف دوڑنے لگی۔

میں بحر جہازوں، چھوٹے بڑے اسٹیروں اور بوٹوں کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا مگر مداری کی پوتی شاید سب کچھ جانتی ہو گی۔ وہ اندھیرے میں تلاش کر کے

بن جاتے ہیں۔“

اس نے اپنی بھونڈی مکروہ آواز میں گالی کبی اور بیلٹ سے اپنا سر دوسریوں پر نکال کر اس کا سیٹھی کیج اتار دیا۔ ”تو باہر آ چل۔“ اس نے مجھے حکم دیا اور نشے میں کھڑے کھڑے لڑکھڑا گیا۔ میں نے سوچا ٹھیک ہے میں اسٹور کے دروازے سے باہر نکلے ہی ریوالور پر ہاتھ ڈال دوں گا اور کچھ اور سوچے بنا میں دروازے کی طرف بڑھا۔ ہری وردی والے افسر کے نشے میں بے حال دماغ نے خدا معلوم کیسے اسے خبردار کر دیا۔ اس نے نشانہ سادھے بغیر گولی چلا دی۔ میرے بائیں شانے پر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دیوار گری ہے یا آواز اور ہوا تجسم ہو کر مجھ پر جھپٹ پڑے ہیں۔ انہوں نے مجھے الٹ دیا۔ لمے بھر کے لیے میں جیسے بدحواس ہو گیا۔ سوچا کیا مجھے گولی لگی ہے؟ نہیں۔ گولی شاید ایک آدھے انچ دور سے گزری ہے اور گولی نے اسٹور کی دیوار کے ایک حصے کے پر پنے ا دیے ہیں۔ پلائی وڈ میں جان ہی کتنی ہوتی ہے۔

میں نے ترپالوں پر پڑے پڑے دیکھا کہ برمی افسر اسٹور میں گھسا اور اس نے منہ سے نجس جانور کی طرح تھوک اڑاتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر مداری کی پوتی کو دبوچ لیا۔ لڑکی نے بھیاں کی چیخ ماری ہو گی مگر اتنے قریب سے چلائی ہوئی گولی نے میرے کان بند کر دیے تھے۔ میں نے کچھ نہیں سنا۔ ترپالوں پر پڑے پڑے میں ایک بے آواز منظر دیکھ رہا تھا۔ کان بس ایک شن شن جیسی آواز سن رہے تھے۔

وہ تارچ جلانے اسٹور کے دروازے سے لڑکی کو دبوچے ہوئے نکلنے کے لیے مڑا ہو گا کہ اس نے اسٹور میں لڑکی کے اور میرے علاوہ ایک اور وجود کی موجودگی محسوس کی۔ اس نے اور میں نے بہ یک وقت دیکھا کہ ادھر لڑکی نے چیخ ماری ادھر ترپالوں کے ڈھیر پر جہاں لڑکی کا دادا بوڑھا مداری بیٹھا تھا اندھیرے کا ایک دھبہ سا غبار کی طرح ہوا اور اسٹور کی تنگ جگہ میں میرے بند کانوں نے کسی کیٹیلے جانور کو غصے کی آواز نکالنے سنا۔ بوڑھے مداری کو غبار نے ڈھک لیا۔ برمی افسر کے لیے یہ آواز اور یہ بات کہیں نہ دہشت پیدا کرنے والی ہو گی۔ میں نے دیکھا اس کے کانپتے ہاتھ میں جلتی ہوئی تارچ خور اس کے بھیاں چہرے کو لمحے بھر کے لیے روشن کر گئی ہے۔ میں نے آج تک کسی انسان چہرے کو خوف سے اتنا مسخ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ گھبرا کر میں ترپالوں کے ڈھیر کی طرف گھوم گیا۔ میں نے دیکھا اندھیرے کا غبار ختم ہو چکا تھا اور ترپالوں کے ڈھیر سے ایک

بازار کی اس جھونپڑی میں ریچھ کے آنے مداری کے غائب ہو جانے اور مداری کے آنے ریچھ کے غائب ہو جانے کے جو خوفناک واقعات دو مرتبہ پیش آئے تھے انہوں نے مجھے پہلے ہی عجیب طرح کے ہول میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ خلاف فطرت تھا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ آدمی اپنا قالب بدل کر ریچھ کی شکل کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ مگر ابھی ابھی چند منٹ پہلے مجھ سے تین ساڑھے تین فٹ کے فاصلے پر جو کچھ ظہور میں آیا اس کے بارے میں سوچ کر ہی بدن میں جھرجھری دوڑ جاتی ہے۔ کیا یہ جادوگری ہے؟ نظر کا دھوکا ہر گز نہیں، یہ تو صاف جادوگری ہے۔ دھوکا تو سایہ اور وہم ہوتا ہے۔ یہ فرش و دیوار پر پڑنے والا سایہ نہیں تھا۔ بوڑھے مداری کی جگہ ہڈی گوشت پوست و خون سے بنا ایک قومی جانور ظاہر ہوا تھا جس نے بے پناہ حیوانی طاقت سے فوجی افسر کو اپنی بھیاں گرتی میں لے کر توڑ موڑ دیا تھا۔ پلک جھپکتے ہی جان نکال دی تھی اس کی، پھر چوڑے کی طرح اسے فولادی ڈیک پر دے پٹا تھا۔ فوجی افسر کا کاسہ سر آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا تھا۔ تربوز کی طرح چھار چھار ہو گیا تھا۔ میں نے کاکسیز بازار میں ریچھ کو اس بوڑھے مداری کو بھاری حیوانی پنجا چلا کر بازو کے ذریعہ کوزخمی کرتے دیکھا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ مگر کون بتاتا؟ میں کس سے پوچھتا؟ خاموش بیٹھا رہا۔

آبی کیڑوں کے شور کے سوا ہر طرف سناٹا تھا۔ سناٹے میں اچانک گولی چلنے کی آواز آئی۔ کشتی میں میرے برابر بیٹھی لڑکی اچھل پڑی۔ دوبارہ پھر کسی نے گولی چلائی۔ یہ فوجی رائفل کی آواز تھی۔

لڑکی نے منہ ہی منہ میں بد بدانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے عقیدے کے مطابق شاید کوئی دعا پڑھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا وہ ابھی تک کیکپاہٹ پر قابو نہیں پاسکی تھی۔ اب اس کے دانت بجنے لگے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا شانہ تھپکا آہستہ سے کہا۔ ”ہمت کرو ان کے گولی چلانے سے کچھ نہیں ہو گا۔“

اس نے میرے رخ اپنا چہرہ گھمایا۔ ”ہاں۔“ کہہ کر سر ہلایا۔

میرے حوصلہ دلانے سے اس کا لرزہ کچھ کم ہوا تھا۔

ہم کوئی دس منٹ اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں نے سنا اسٹیر کا انجن چلنے کی بہت ہلکی مگر صاف آواز آنے لگی تھی۔ میں نے کچھ اور بھی سنا، کوئی چیز، آدمی یا

مجھے لوہے کی سیڑھیوں پر چڑھالائی اور عرشے پر پہنچا دیا۔

افسر کی پستول کی آواز ریچھ کی پر غضب گزر گراہٹ اور افسر کے مرنے کی آوازیں سبھی کو بوٹ کے نچلے حصے میں دوڑا لے گئی تھیں۔ ویسے بھی گھپ اندھیرا تھا۔ کوئی وہاں ہوتا بھی تو کیا دیکھتا۔ ہمیں عرشے پر نقل و حرکت میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

مداری کی پوتی نے میرا ہاتھ پکڑ کر رسوں کے ایک گورکھ دھندے سے چھو دیا اور جلد جلد ہدایت دے کر اسے کھینچو، اسے ڈھیلا کرو، اب چھوڑ دو، سنبھال لو، کہہ کر اس نے ہنگامی حالات میں استعمال ہونے والی چھوٹی کشتی اسٹیر سے پانی میں اتروالی۔

اسٹیر کے پہلو سے لگی کشتی چمک دار پانی میں صاف دکھائی بلکہ بھائی دے رہی تھی۔ میں رسی تھامے، لڑکی کا ہاتھ پکڑے، جی کڑا کر کے کود پڑا اور سیدھا کشتی میں جا گرا۔ لڑکی نے خوف یا شاید تکلیف کی ہلکی آواز نکالی تھی مگر وہ پوری طرح اپنے حواسوں میں تھی۔

اس نے کشتی کے تختے سے بندھا چپو کھول کر میرے حوالے کیا، بولی۔ ”چلاؤ۔ جلدی۔ ان لوگ نے اگر دیکھ لیا تو گولی چلائیں گے۔“

میں نے دیوانہ وار چپو چلانا شروع کر دیا۔ کشتی تیزی کے ساتھ اسٹیر سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے دیوانوں کی طرح چپو چلاتے ہوئے کشتی کو اسٹیر سے دور پہنچا دیا تھا۔ سامنے ساحل کے قریب اگی آبی گھاس کی پناہ نظر آرہی تھی۔ میرا ارادہ آبی گھاس کی اوٹ میں کشتی لے جانے کا تھا۔ اگر اسٹیر سے طاقت ور سرچ لائٹ بھی ڈالی جاتی تو چار طرف اگی گھاس میں ہماری منہی کشتی کو نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

میں کشتی کھیتا ہوا آبی گھاس کے اس وسیع و عریض جنگل میں داخل ہو گیا۔ مداری کی پوتی یہاں تک تو ہمت سے کام لے کر خود کو اور مجھے نکال لائی تھی اب وہ خوف سے کانپ رہی تھی یا شاید یہ کچپی سردی کی تھی۔ یہاں کھلی ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ میں نے کوٹ اتار کر اسے دینا چاہا، لڑکی نے انکار کر دیا۔

مجھے بھی پچھلے چند منٹوں میں ہونے والے واقعات نے لرزادیا تھا۔ کاکسیز

پہلے لڑکی اتری۔ اس نے سہارا دے کر اپنے دادا کو اتارا پھر مجھے سہارا دینے کو اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے ”اوں ہنک۔“ کہہ کر انکار کیا تو اسے احساس ہوا کہ ہاتھ بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہولے سے ہنسی۔

اب جب کہ اس کا دادا اور وہ خود محفوظ تھے تو وہ خوش تھی۔ ہم تینوں کو پھر ایک بار زندوں میں گنا جاسکتا تھا۔ میں چپو کو لاشی کی طرح اٹھائے کشتی سے اتر آیا۔

مجھے چپو اٹھائے دیکھ کر بوڑھے نے سر ہلا کر اطمینان کا اظہار کیا۔ آہستہ سے بولا۔ ”ہاں چپو ادھر نہیں چھوڑنا۔ کشتی کو ڈبو کر اس میں پتھر ڈالو۔ اسے ادھر ہی چھپا دو۔

یہاں پانی زیادہ گہرا نہیں ہے بس یہیں ٹھیک ہے۔“

تجویز اچھی تھی۔ تھوڑی دیر کی محنت سے میں نے اتنے پتھر اس ڈبوئی ہوئی کشتی میں بار کر دیے کہ وہ پانی میں ہی بیٹھی رہی۔ قریب سے دیکھنے پر کوئی دو ہاتھ گہرے پانی میں میرے اکٹھا کیے پتھروں کا ڈھیر نظر آتا تھا اور بس اتنا اطمینان ہو گیا کہ سرسری سا دیکھنے والے کو کشتی دکھائی نہیں دے گی۔

بوڑھا مداری اپنی پوتی کو ہدایات دیتا رہا تھا۔ اس نے کنارے پر کسی خاص ترتیب سے پتھر رکھوا دیے تھے۔ ایک نشان بنادیا تھا جو بعد میں اگر ضرورت پڑی تو ہمیں کشتی ڈھونڈنے میں مدد دے سکتا تھا۔

میں نے اس کینڈے ’ان صلا حیتوں کا آدمی آج تک نہیں دیکھا تھا۔ یہ مداری نہیں اسرار سے بھرا جادو گر تھا۔

میں نے دیکھا وہ اب ایک چادر اور میرے کوٹ میں لپٹا کافی حد تک اپنی طاقت بحال کر چکا تھا۔ کشتی چھپانے کا کام مکمل ہو گیا تو اس نے اشارے سے مجھے پاس بلایا۔ وہ پتھر پر بیٹھا تھا۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں پاس بیٹھ گیا تو دھیرے دھیرے بولتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم ہم لوگوں کے کوئی نہیں تھے۔ پر اب ایسا ہو گیا کہ ہمارے اپنے بن گئے ہو۔ خان تم نے جو کچھ دیکھ لیا وہ باہر کا کوئی آدمی نہیں دیکھ سکتا۔ جو دیکھ لیتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ کیا ہوا میں اسے زندہ نہیں رہنے دیتا۔ سمجھے؟ اسی لیے یہ بات دیکھنے اور جان لینے والا باہر کا آدمی دوسرا کوئی نہیں ہے۔ بس ایک تم ہی ہو سمجھے؟“

میں ہنسا۔ ”تو ٹھیک ہے مار دو مجھے۔ میں نے دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ ریچھ کا کیا قصہ ہے۔ بس مار دو۔“

جانور تیرتا ہوا آ رہا تھا۔ پانی کے ہلکے چھپکے سنائی دے رہے تھے۔ کشتی سے کچھ دور آبی گھاس بلی تھی۔ کوئی کمزور مگر مہارت سے ہاتھ مارتا کشتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر دشمن ہوا تو میں تیار تھا۔ کشتی کا مضبوط چپو میری گرفت میں فوری پچاؤ کا ہتھیار بن سکتا تھا۔

لڑکی نے بھی یہ آواز سنی ’اس نے دھیرے سے پوچھا۔“ بابا؟“

”ہوں۔“ گو نجیلی رازدارانہ آواز آئی۔ ”ہو ووں۔“ اور وہ تیرتا ہوا قریب آ

گیا۔

لڑکی کشتی میں کھڑی ہو گئی اور ہاتھ بڑھا کر اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کی مدد کو میں نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔

مداری کا سوکھا بنجر ہاتھ بہت گرم تھا اور مشقت کی تھکن سے کانپ رہا تھا۔

میں نے لڑکی سے کہا۔ ”تم چھوڑ دو۔ میں کھینچ لوں گا۔“

مگر بوڑھا اتنا بے حال ہو رہا تھا کہ اسے کشتی میں کھینچنا دو بھر ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا

کہ بہت روز تک پانی میں بھیگا رہنے والا لحاف کھینچ کر نکالا جا رہا ہے۔ اتنا بے جان اور

بھاری ہو رہا تھا وہ۔

میں نے اور لڑکی نے جیسے تیسے اسے کھینچ کر تختوں کے بیچ ڈال دیا۔

لڑکی نے اپنی چادر اتاری، میں نے تیزی سے بوڑھے کے بدن سے چپکے ہوئے

اس کے کپڑے دور کیے۔ اسے چادر میں لپیٹ دیا اوپر سے اپنا کوٹ اوڑھا دیا۔ میں اور اس

کی پوتی ہم دونوں اس کا پتہ لرنے زندہ ڈھانچے کو کچھ دیر دبا کر بیٹھے رہے تو اس کا کانپنا

بند ہوا۔

تختوں کے بیچ کراہتا ہوا وہ بہت مشکل سے اٹھا اور بیٹھ گیا۔ بوڑھے مداری نے

اپنا لرنے والا ہاتھ بڑھا کر میرا بازو چھوا۔ آہستہ سے کمزور آواز میں کہنے لگا۔ ”وہ پرلی

طرف نکل گئے۔ سب ٹھیک ہے۔ کشتی کو اب کنارے پر لے چلو۔“ اس نے کنارے کی

سمت بھی بتائی۔ میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت میں کشتی موڑ دی۔

یہ جی ہوئی ریت کا سخت کنارہ تھا۔ یہاں گھاس، آبی پودے، درخت مٹی کچھ

نہیں تھا۔ ٹھکی ہوئی ریت اور ادھر ادھر بکھری چھوٹی چٹانوں کے بیچ میں نے کشتی

کنارے سے لگا دی۔

میں جانا چاہتا تھا کہ مداری نے اسٹیئر پر اور کنتوں کو ٹھکانے لگایا۔

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے اسٹیئر پر کچھ لوگ زندہ بچے ہوں گے۔“

”کیا مطلب کچھ لوگ بچے ہوں گے؟ کبھی بچے ہیں۔ تم کیا سمجھ رہے ہو مجھے

آدمیوں کو جان سے مارنے یا زخمی کرنے میں کوئی مزاحمتا ہے؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

اس نے احتجاج کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ ظاہر ہے میری بدگمانی پر برامان

لیا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں تو۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ بتاؤ میرے آنے

کے بعد وہاں کیا ہوا تھا؟“

کہنے لگا۔ ”جب وہ نیچے آگئے تو میں بلبلاتا آواز کرتا ہوا ایک طرف اوٹ میں

ہو گیا۔ مجھے خبر تھی وہ ضرور رائفلیں اٹھا کر چلے ہوں گے۔ فوجی جو تھے پہلے تو میں

مانے نہیں آیا۔ جہاز کی لوہے کی دیواروں کے پیچھے سے آوازیں سناتا اور دہلاتا رہا۔ انہیں

کبھی کسی پاپ کسی کعبے کے پیچھے جا کر اپنا آپ بھی دکھا دیتا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے اور ڈر

کے مارے مرے جاتے تھے۔ رائفلیں اٹھا کے فار کرنے کا ہوش کسے ہوتا۔ سمجھو دم ہی

نکل گیا تھا ان کا۔ ہاں ایک خنجر پھینک کے مارا۔ خیر ہوئی اس کا نشانہ ٹھیک نہیں تھا۔ میں

اسے ڈرانے کو بلبلاتا ہوا نکلا۔ اس کی شکل کے سامنے ایک بار ہوا میں بچا چلا دیا۔ وہ ایسا

گھبرایا کہ الٹ کے پھالکے (سامان رکھنے کے حوض) میں جا کر اچھر کسی نے حملہ کرنے کی

ہمت نہیں کی۔ اوٹ میں کھڑے ڈکراتے رہے۔ مجھ پر نارچوں کی روشنی پھینکتے رہے۔“

”ہاں سبھی نے دیکھ لیا۔ اچھا ہوا۔ اگر وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کے قیدیوں کو

بھی ریچھ نے زخمی کر کے پانی میں گرادیا ہے اور کچھ ڈوب مرے ہیں تو اچھی بات ہے۔

”تمہیں تلاش کرنے کی تکلیف نہیں کریں گے۔“

”پر یہ بھی تو سوچو تم ان کی کشتی لے آئے ہو۔ وہ تین میں سے ایک کو یاد دو کو

ڈوبا ہوا سمجھ لیں ٹھیک! تینوں کو ڈوبا نہیں سمجھ سکتے۔ ایک کو تو وہ تلاش کریں گے ہی۔

کچھ؟ ایک نے تو کشتی پانی میں گرائی اور بچ نکلا۔ اسے تو تلاش کریں گے ہی؟“

مداری ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ہاں اور ایک بات اور ہے۔“

بولاً۔ ”کیا؟“

”اس ایک فراری یادو پر فوجی افسر کے قتل کا الزام لگایا جاسکتا ہے کیونکہ کوئی

فوج کوئی عدالت اس کہانی کو نہیں مانے گی کہ چلتے ہوئے اسٹیئر پر کہیں سے ایک ریچھ آ

وہ بولا۔ ”کیا کہہ رہے ہو! تم نے کو سومی کی‘ میری پوتی کی آبرو بچائی‘ جان بچائی اس کی۔ ہم تو تمہارے بندی ہو گئے۔ غلام ہیں تمہارے۔ تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے ہم پر۔ دوسرے احسان کا تو کوئی بدلہ کوئی اتار ہوتا ہو گا ایسے احسان کو کوئی نہیں اتر سکتا۔ ہم تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ اب تم باہر کے نہیں رہے۔ ہمارے اپنے ہو گے ہو۔“

مجھے مسکراتا دیکھ کر‘ میری بات سن کر وہ اداس ہو گیا۔ آہستہ سے بولا۔ ”خان! پہلے کوئی اور بات تھی۔ اب غلام ہیں‘ تمہارے بندی ہیں۔ ضرورت پڑی تو تمہاری جان بچانے کو جان پہ کھیل جائیں گے۔ سمجھے؟“

تاروں سے اجلی ہوئی رات کے ہلکے اجالے میں میں نے اس کی آنکھیں چمکتی دیکھیں۔ وہ یہ سب باتیں سنجیدگی اور اخلاص سے کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اس کے ہاتھ تپ رہے تھے۔ شاید بخار ہو گیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہیں بخار ہے؟“

”نہیں بخار نہیں ہے۔ کیا بدل پیچھے ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر پڑا رہوں۔ ایک جگہ بیٹھا ہوں تو آپ ہی ٹھیک ہو جاتا ہوں۔“

”کیا بدل؟“ میں نے کسی شاگرد کی طرح سوال کیا۔ ”تم ریچھ‘ پھر ریچھ بن جانے کو کیا بد لنا کہتے ہو؟“

بولاً۔ ”آدمی ریچھ‘ پھر ریچھ سے آدمی بننا یہ کیا ہی تو بد لنا ہے اور آتما۔ روح وہی رہتی ہے جسم بدل جاتے ہیں۔ پہلے آدمی کو جانور کا جسم ملتا ہے پھر جانور کو واپس آدمی کا جسم مل جاتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ سب کیسے ہوتا ہے؟“

”بتا دوں گا۔ اپنے ہی ہو۔ تم پوچھتے ہو تو بتاؤں گا۔ پر ابھی آدمی کے قریب رات پڑی ہے۔ ہم اجاڑ میں بیٹھے ہیں۔ اپنے لیے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈ لیں جہاں دن کے اجالے میں چھپے پڑے رہیں۔ اب جہاں بھی جاتا ہے رات میں ٹکنا ہو گا۔ دن میں وہ دور تک اپنے خبر اٹھانے والے مخبر بھیجیں گے۔ ہمیں تلاش کرنے کو۔“

میں نے پوچھا۔ ”کون تلاش کر دے گا ہمیں؟“

وہ بولا۔ ”فوج کے لوگ بھی‘ جہاز والے بھی۔ دونوں۔“

دراصل مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ہمارے اسٹیئر چھوڑنے کے بعد وہاں کیا ہوا۔

دور سے یہ جگہ بے آباد لگتی تھی۔ پہلے تو میں نے اطمینان کر لیا کہ جنگلے کی حفاظت پر کتے تو نہیں چھوڑے گئے ہیں۔ جب اطمینان ہو گیا تو ایک بار ہر طرف گھوم کر دیکھا۔ آبادی کی سب سے بڑی نشانی دھواں ہوتی ہے۔ شکار جنگلے کی چمنی سے دھواں نہیں اٹھ رہا تھا۔ نہ ہی اس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کے باڑھ پھلانگی اور جنگلے کے احاطے میں پہنچ گیا۔ برآمدے میں بید کی میز کرسیاں پڑی تھیں۔ پھولوں کے خنڈوں میں کچھ جنگلی کچھ شہری پھول لگائے گئے تھے۔ میں نے چھو کر دیکھا تھا وہ خشک نہیں تھے۔ ایک دو روز پہلے پانی دیا گیا تھا۔ احاطے میں ایک طرف مرغیوں کا ڈر با بنا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ چھ آٹھ مرغیاں بند تھیں۔ ان کے لیے دانہ پانی پڑا تھا۔

تو اس کا مطلب ہے جنگل آباد ہے۔ احتیاط کرنا ضروری ہے۔ میں نے دیکھا برآمدے میں دو دروازے کھلتے تھے۔ پچھلا دروازہ رسوئی یا کچن میں کھلتا تھا۔ یہ اندر سے بند تھا۔

خوب! آباد تو ہے لیکن اس وقت جنگلے والے موجود نہیں ہیں۔ وہ اگر صبح ہی صبح شکار کو نکلے ہوتے تو عمارت میں دھوئیں کی خوشبو بھی ہوتی۔ چولہا پچھلے چند گھنٹوں میں نہیں جلایا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ لوگ آئے ہوئے ہیں مگر رات انہوں نے یہاں نہیں گزاری۔ اس وقت کہیں نچان باندھ کر یا پانی کے پاس شکار کے لیے گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔

میں نے دیکھا صبح ہونے والی تھی۔ جنگلے والے زیادہ سے زیادہ گھنٹہ بھر میں لوٹ آئیں گے پھر وہ کچھ کھائیں گے پیس گے اور دن بھر سوئیں گے۔ مجھے جلدی کرنی چاہیے۔

میں تیزی سے مصروف ہو گیا۔ تالا توڑنا غلط تھا۔ ہمیں ابھی قریب ہی بسیرا کرنا ہے۔ کچھ اس طرح کارروائی کی جائے کہ انہیں کسی چور کے آنے کا شبہ نہ ہو۔ دوسری بار آنے کا راستہ کھلا رہے۔ میں نے کچن کے روشن دان کا جائزہ لیا۔ لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ میں نے سوچا ایک سلاخ کو ذرا سا ٹیڑھا کیا جاسکتا ہے پھر کام بن جائے گا۔

دس منٹ میں سلاخ کو میں نے اپنے کام کا بنا لیا۔ روشن دان میں اتنی جگہ ہو

گیا اور ان کے افسر کو مار کے چلا گیا۔ بس یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ وہ ہمیں تلاش کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔

”ہاں نا۔ تو پھر چلو ادھر سے اٹھو۔“

ہم ساحل سے اٹھے اور ایک طرف چل پڑے۔ علاقہ مداری کا دیکھا ہوا نہیں تھا پھر رات کا وقت مگر وہ اور میں دونوں جنگلوں کا مزاج سمجھنے والے تھے۔ کوئی خاص مشکل نہیں ہوئی۔ ہم صبح کا اجالا ہونے سے پہلے زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لینا چاہتے تھے۔ اب درخت اور پہاڑیاں شروع ہو گئی تھیں۔ کہیں تالوں پر پلایاں بنی تھیں۔ انہیں دیکھ کر خیال ہوا کہ بستیاں بھی قریب ہی ہوں گی۔

ہلکا اجالا پھیلنے لگا تھا کہ پہاڑی کے دامن میں ہمیں ایک اکیلا مکان نظر آیا۔ مداری رک کر سوچنے لگا پھر بولا۔ ”اس طرف میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ جس طرح کا مکان بنا ہے خیال ہوتا ہے کوئی شکار بنگلا ہو گا۔ کیا پتا خالی پڑا ہوا ہو سکتا ہے نہ ہو۔ اس وقت شکاری آئے ہوئے ہوں۔“

پھر بتانے لگا کہ ایسے شکار جنگلے پانی کے قریب بنتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ قریب ہی کوئی چشمہ بھی ہو گا۔ پیاد چشمہ انہی چشموں کے قریب شکار جنگلے بنائے جاتے ہیں جن پر جانور پانی پینے آتے ہوں۔

میں نے مداری کی بات سے اتفاق کیا اور کہا۔ ”دن میں چھپنے کے لیے ہم پہاڑی پر کوئی کینچ، کوئی محفوظ سا غار تلاش کر لیتے ہیں۔ تم اور تمہاری پوتی چھپنے کی جگہ ڈھونڈو۔ میں شکار جنگلے میں گھسنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کچھ کھانے پینے کو مل جائے۔“ وہ بولا۔ ”میں ادھر ہی کا باسی ہوں مجھے جانے دو۔ تم اور کو سومی پہاڑی چڑھ جاؤ۔“

میں نے سوچا یہ ابھی بہت تھکا ہوا ہے۔ آرام سے کوئی جگہ تلاش کر کے پڑا رہے گا۔ جنگلے تک گیا اور آیا تو اسے اور تھکن ہو جائے گی۔

میں نے سمجھایا تو مداری مان گیا کہنے لگا۔ ”تم واپس آتے دکھائی دو گے تو ام مور کی آواز کا اشارہ دیں گے۔ اگر تم پہلے دیکھ لو تو تم اشارہ دے دینا۔“ میں دونوں کو پہاڑی پر بھیج کر خود چھپتا چھپتا شکار جنگلے کی طرف چلا۔

ایک موہوم سا خیال پیدا ہوا کہ شکاریوں میں سے ایک زخمی یا بیمار ہو گیا ہے تو یہ لوگ اب رکیں گے نہیں۔ یہ ٹل جائیں تو ہمارے لیے شکار بنگلہ اچھی پناہ گاہ بن سکتا ہے۔

مداری اور کوسومی اس کی پوتی ایک اچھا غار تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جتنی دیر میں بنگلے کا سامان چرانے، پوٹلیاں باندھنے میں لگا رہا تھا۔ دادا پوتی نے غار کو صاف کر کے گزارے کے قابل بنادیا تھا۔ میں نے ایک طرف لے جا کر مرغی صاف کی۔ ٹکڑے کیے اور اس کے پر وغیرہ گڑھا کھود کر دفن کر دیے۔ کوسومی نے آگ جلا کر چاول دال پکاتا شروع کر دیا۔ مجھے مرغی کا گوشت لاتے دیکھ کر مداری ہنسا بولا۔ ”مرغی پکانے کے لیے تمہیں تھوڑا کننا پڑے گا۔ برتن ایک ہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو ہم لوگ شام کو کھائیں گے۔ ابھی نمک مرچ لگا کر اسے رکھ دوں گا۔ شام ہونے سے پہلے کھلی آگ پر پکالیں گے۔“

مداری بولا۔ ”تم نے یہ جو کہا کہ ہم لوگ کھائیں گے تو خان! اسے تم اکیلے ہی کھاؤ گے۔ کوسومی اور میں ماس نہیں کھاتے ہمیں کسی چیز کا بھی گوشت کھانے کا حکم نہیں ہے۔ انڈا بھی نہیں۔ دال چاول پک جائے تو یہ گوشت تم چاہے ابھی بھون لینا۔ چاہے شام کو مرضی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”حیرت ہے! جنگل کے رہنے والے گوشت نہیں کھاتے۔“
 بولا۔ ”ہمارے دین دھرم نے زدکا نہیں ہے پر ہم لوگ یوگی ہیں۔ مطلب یہ جو کایا بدل اور دوسری یوگ دیا (جو گیوں کا علم) میرے گھرانے میں چلی آتی ہے اس کی وجہ سے ہمیں صرف دودھ، پھل، سبزیاں، تمباکو اور پیاز لہسن یہ سب تیز چیزیں منع ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”دوسرے یوگیوں (جو گیوں) کو تو میں نے سب کھاتے دیکھا ہے۔“

کہنے لگا۔ ”ہاں دوسرے کھاتے ہوں گے۔ ہمارا جان جو سکھ کا علم ہے ہمیں حکم نہیں۔“

میں نے نمک مرچ لگا کے مرغی کا گوشت پتوں میں لپیٹ کے درخت کی شاخ

گئی جس سے میں اندر جا سکتا تھا۔

بچن میں تازہ سبزیاں موجود تھیں۔ انڈے، چاول، آنا دال غرض جیسے اچھے آدمیوں کا اتنے ہی دن کا راشن موجود تھا۔ میں نے اپنی ضرورت کا راشن ایک فالتو تھیلے میں بھر لیا۔ شکاریوں کی ایک چادر مجھے بہت پسند آئی۔ موسم سے بچنے اور بچھانے کو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ چادر میں نے اٹھالی۔ برتن، ماچس، موم بتیاں، چائے، چینی اور ایک چھری نہ بھولا۔ بچن کا دروازہ کھول کر پہلے تو یہ سب سامان میں نے باہر برآمدے میں پہنچایا پھر دروازہ بولٹ کر تاروشن دان سے کود کر خود باہر نکل آیا۔

شکار بنگلے سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے ایک درمیانے سائز کی مرغی ذبح کر کے تھیلے میں پہنچادی تھی۔

دن نکل رہا تھا۔ جب میں خاموشی سے بنگلے کی باڑ پھلانگ کر باہر آیا اور میدان پار کرتا پہاڑیوں کی طرف چل پڑا۔

پہاڑی کی ڈھلان سے مڑ کر دیکھا ہلکی نئی نویلی سنہری دھوپ میں وادی جگمگ رہی تھی پھر میں نے پہاڑی کج سے مور کی آواز سنی۔ پہلی بار تو دھوکا کھا گیا۔ مداری نے مور کی آواز کی اتنی کامیاب نقل کی تھی کہ میں چکر اگیا۔ سمجھا یہ جنگل کا اصلی مور بولتا ہے مگر جب دوسری بار مور بولا تو میں جان گیا کہ اشارہ دیا جا رہا ہے۔

میں نے اشارے کا جواب دیا اور آواز کی سمت بڑھ گیا۔ مداری اور اس کی پوتی مجھے تھیلہ اٹھائے آتا دیکھ کر خوش ہو گئے۔

ہم جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو رہے تھے کہ مداری نے نیچے وادی میں کوئی آواز سنی یا کچھ دیکھا۔ وہ رک گیا۔ پھر درختوں کی اوٹ سے اس نے مجھے دکھایا کہ شکار بنگلے کے سامنے ایک جیب آکر رکی ہے۔ پانچ آدمی تھکے ہارے جیب گاڑی سے اتر رہے تھے۔

تھکے ہارے اور شاید زخمی یا بیمار۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک کو جو کرکٹ ٹوپی، زرد قمیص اور سیاہ تنگ پتلون یا جینز پہنے تھا ایک دوسرا ہنگ کوٹ والا کرکٹ میں ہاتھ ڈالے سہارا دے کر بنگلے میں لے جا رہا تھا۔ کٹ کی ٹوپی اور زرد قمیص والا جو بیمار یا زخمی لگتا تھا کوٹ والے کی گردن میں ہاتھ ڈالے نڈھال اور سر مہوڑائے آہستہ آہستہ بنگلے میں گیا تھا۔

بنگلے کے گیٹ سے ایک آدمی نکل کر آیا اور جیپ کی طرف بڑھا تو پچھلی سیٹ پر ہوا آدمی اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ہٹو کیسا دھوکا ہوا ہے! جیپ کی پچھلی سیٹ پر ایک نہیں دو آدمی بیٹھے تھے۔ ایک اٹھا تھا، دوسرا وہیں نیم دراز رہا تھا۔ پھر عجیب بات ہوئی بنگلے میں سے آنے والا سیٹ سے اٹھنے والے پر جھپٹ پڑا۔ دونوں دشمنوں کی طرح الجھ گئے۔ بمیل نہیں باقاعدہ لڑائی ہو رہی تھی۔

میں نے پہچانا جیپ میں جو بیٹھا رہا وہ وہی کرکٹ کیپ اور زرد قمیص والا شخص تھا جسے دوسرے کی گردن میں بائیں ڈالے سویرے آتے دیکھا تھا۔ دو کو لڑتے دیکھ کر وہ اٹھا اور بچ پھاڑ کر انے لگا۔ بچ پھاڑ کر انے والا یہ کٹ کا شوقین چھوٹے قد کا اور دبلا پتلا تھا۔ دونوں کی ہاتھ پائی میں اس کی کرکٹ کیپ گر گئی۔ سر سے کیپ گری تو لمبے سنہرے بال پیچے آزاد ہو کر اس کے کندھوں تک آ رہے تھے۔ اس نے چیخ کر کچھ کہا۔ لفظ سمجھ میں نہ آئے مگر ایک بات میں بہ خوبی سمجھ گیا۔ یہ کرکٹ کیپ والا کوئی مرد نہیں عورت یا لڑکی تھی۔

میں نے سوچا دور سے دیکھے جانے والے اس منظر کے اب تو معنی ہی بدل گئے ہیں۔ دیکھے اور پکڑے جانے کے خطرے کے باوجود مجھے اس خاموش کہانی میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔

نئی کہانی اب یوں بن رہی تھی کہ شام کے سہانے وقت میں سب سے چھپ کر دو چاہنے والے جیپ کی پچھلی سیٹ پر آ بیٹھے تھے اور راز و نیاز میں مصروف تھے۔ ایک ہال بنے لیٹے تھے یا بیٹھے تھے کہ اندر سے تیسرا نکل کر آیا اور تنہائی کی اس ملاقات میں اس نے کھنڈت ڈال دی۔

ہمیشہ کی طرح دو مردوں اور ایک عورت کی ازلی ٹکون بن گئی تھی۔

جی ہاں ایک چاہنے والا، دوسرا محبوب اور تیسرا رقیب۔ اب رقیب اور چاہنے والے میں ہاتھ پائی ہو رہی تھی اور تازک اندام محبوبہ کو اپنے بھاری بھر کم مردوں کی جنگ بند کرانے میں انہیں کا سامنا تھا۔ دونوں میں سے کوئی رکنے کو تیار نہیں تھا۔

ان کے چیخنے کی آوازیں اوپر ہماری پہاڑی تک پہنچ رہی تھیں۔ شکار بنگلے سے ہائی کے دو ساتھی بھی نکل آئے تھے۔ انہوں نے لڑنے والوں کو الگ الگ کر دیا۔ زرد

سے لٹکا دیا۔ تینوں نے دال چاول کھائے۔ میں چادر لے کر غار میں ایک طرف اندر جا لیٹا۔ سوچا سامنے رہوں گا تو لڑکی کو سوسے کو لینے بیٹھنے میں تکلف ہو گا۔

تینوں ہی تھکے ہوئے تھے، لیٹے اور فوراً سو گئے۔ دن کا وقت تھا، کیڑے کاغذ، جنگل کے جانوروں کا خوف بھی نہیں تھا۔

سو کر اٹھے تو سورج کافی اتر گیا تھا۔ میں نے سوچا یہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کا اور ہے پھر اندھیرا اور ہماری روانگی یا بڑے میاں سے مشورہ کر لوں گا۔ وہ اگر رکنے کا کہیں گے تو سوچیں گے۔

میں اپنی چادر اٹھائے غار کے بیرونی حصے میں آیا تو دیکھا بوڑھا مداری ابھی تک سو رہا ہے۔ کو سوسے اس کی پوتی سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ مجھے پریشان لگی۔ میں نے اشارے سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“ بولی۔ ”بابا کو تاپ چڑھی ہے۔“

میں نے پیشانی چھو کر دیکھا بڑے میاں کو تیز بخار تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا میں نے لڑکی سے کہا کہ کپڑا پانی میں تر کر کے اس کی پیشانی پر رکھو۔

یہ بخار کی بات انجمن کی تھی۔ پہلے ممکن تھا سورج ڈوبنے پر ہم چل پڑتے۔ اب یہ ممکن نہ ہو گا۔ ہم بچ نکلے ہیں۔ یہ صحیح ہے مگر وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں جہاں اسٹیر پر فوجی انسر کو ”قتل“ کیا گیا تھا اور قیدی لاپتہ ہوئے تھے۔ فوج والے یا جو بھی بھاگے ہوؤں کو تلاش کریں گے تو یہاں قریب ہی سے کریں گے۔ خطرہ ہمارے سر پر منڈلاتا رہے گا۔ بڑے میاں بخار میں پڑے ہیں مجبوراً اب یہاں رکنا ہو گا۔ بہر حال ایسا ہو یا دوسری طرح ہو، ہمارے اختیار میں کیا ہے۔

میں نے لڑکی سے کہا کہ دن ہی دن میں کھاپی لو۔ رات کو چولہے کی آگ دور سے نظر آئے گی جو ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے مرغی تیار کی، آدھی اسی وقت ٹھکانے لگا دی، آدھی دوسرے دن کے لیے سنبھالی اور درختوں کی اوٹ لیتا، چھپتا، چھپاتا وہاں آن بیٹھا جہاں سے شکار بنگلے کی جاسوسی ہو سکتی تھی۔

ان کی جیپ باہر کھڑی تھی۔ جیپ میں پچھلی سیٹ پر کوئی تھا۔ اتنے فاصلے سے جیپ میں بیٹھا آدمی مجھے نہ دیکھ پاتا، میں البتہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خوب پھیل کر بیٹھا ہوا بلکہ نیم دراز تھا۔

بھی ہو سکتا تھا کہ شکاری رات بھر چان پر بیٹھنے کے لیے جا رہے ہوں، صبح لوٹ آئیں۔
مجھے بڑے میاں کی طرف سے پریشانی تھی۔ دوا دارو کرنی ضروری تھی۔ میں
نے سوچا اگر اسپرین کی دو چار نکلیاں شکار بنگلے سے حاصل ہو جائیں تو یہ پریشانی دور ہو۔
عام طور پر شکاری اور پنکک کرنے والے فوری ضرورت کے لیے منگھر آبیوڈین، اسپرین،
ہام، ہانے کی دوائیں تو ساتھ رکھتے ہی ہیں۔ بنگلے سے سب شکاری جاکچے ہیں اگر میں
مداری کے لیے اسپرین اور کوئی فالٹو کمبل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو بڑے میاں
کی حالت میں کوئی بہتری ضرور آئے گی۔ ذہن سے بڑا بوجھ اتر جائے گا۔

میں نے کو سومی کو بتا دیا کہ میں اس کے بابا کے لیے کوئی دوا چرانے جا رہا ہوں۔
دوسری بار بنگلے میں گھسنا پہلی بار سے مختلف تھا۔ پہلے آیا تھا تو یہاں ٹھہرنے
والوں کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اب کئی قسم کی خوشبوئیں، پکے ہوئے
کھانوں، عطر اور سینٹ کی، پھلوں، پھولوں اور کریموں کی یہاں گردش کر رہی تھیں۔
یہاں ٹھہرے ہوئے لوگوں کے مشغلوں کی خبروں سے شکار بنگلے بسا ہوا تھا۔ انہوں نے
بھنا ہوا گوشت، پیاز اور سرکہ کھایا تھا۔ شراہیں پی تھیں۔ یہاں پھولوں کی خوشبوئیں
تھیں، ارمانون بھرے سبک ولایتی سینٹ کی مہک تھی۔ شکار بنگلے کی یہ چھوٹی سی دنیا اس
وقت دولت مندوں کے مشغلوں کی خبروں سے آباد تھی۔

میں نے باڑ پھلانگ کر اندر کا جائزہ لیا۔ وہ لوگ کہیں ایک دھیمی روشنی والا
لیپ جلا کر چھوڑ گئے تھے۔ میں فوری طور پر معلوم نہ کر سکا کہ کہاں مگر کسی ایک کمرے
میں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔

اس کا مطلب ہے وہ بالکل ہی نہیں گئے۔ شکار کھینچنے گئے ہیں۔ لوٹ آئیں گے۔
پہلے کی طرح میں کچن کے روشن دان سے داخل ہوا۔ اندر کی سٹکی کھول کر
کچن سے ملے ہوئے غسل خانے میں جا نکلا۔ غسل خانے میں دواؤں کی کوئی الماری نہیں
تھی۔ اب یہی رہ گیا تھا کہ پہلے ایک پھر دوسرے بیڈ روم میں تلاش کیا جائے۔

بیڈ روم میں جانے کے لیے میں نے غسل خانے کا دوسرا دروازہ کھولا اور دہلیز
پارک۔ میں بیڈ روم میں تھا۔ شکار پارٹی والے اسی بیڈ روم میں روشنی کر گئے تھے۔ ڈبل بیڈ
سے ملی سائڈ ٹیبل تھی جس پر اونچی چنی والا کیرو سین لیپ جل رہا تھا۔ کمرے میں سناٹا

قیص سے سیاہ جیز والی عورت اپنے سنہرے بال جھٹکتی، زمین پر پڑی کرکٹ کیپ اٹھا کر
تیز چلتی ہوئی بنگلے میں داخل ہو گئی۔ چاروں مرد باہر ہی رہے۔ یہ چاروں ہاتھ ہلا ہلا کر
کافی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔

اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ عورت نے بنگلے میں روشنی کر دی تھی اور اونچی آواز
میں ریڈیو بجانا شروع کر دیا تھا۔ بیڑی جان دار ہو گئی۔ فلمی گانوں کے پروگرام کی زوردار
آوازیں یہاں تک آرہی تھیں۔ ان کی آپس کی لڑائی اور بے زاری نے خاموش وادی کو
شہر کا شور و غل دے دیا تھا۔

میں نے سوچا اب جب کہ شکاریوں میں سے دو لڑ پڑے ہیں تو ہو سکتا ہے یہ
لوگ اپنا قیام مختصر کر کے جلد لوٹنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس میں میرے لیے ایک اور
الجھن تھی۔ ذہن میں ایک منصوبہ بن رہا تھا۔ جو یہ تھا، شکاری ابھی رات کے شکار پر
روانہ ہوں گے، سویرے تھکے ہارے آئیں گے اور حسب معمول کھاپی کر سو جائیں گے۔
یہ ایسا وقت ہو گا کہ میں ان کی جپ قبضے میں کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں سے
چل دوں گا لیکن اب جو یہ گھروں کو لوٹ رہے ہیں تو اچھی خاصی چنگل میں آئی ہو
جیپ سمجھو ہاتھ سے گئی۔

زندہ رہنے کے لیے مسلسل اور تیزی سے منصوبہ بندی کرنا ضروری ہوتا ہے۔
یہ لوگ رکیں یا چلے جائیں میرے بے تاب ذہن نے دونوں صورتوں کے لیے
منصوبے بنالئے تھے۔

کچھ دیر اور میں وہاں چھپا بیٹھا رہا پھر جب سارے شکاری اندر بنگلے میں چلے گئے
تو مداری کی حالت کا جائزہ لینے میں بھی غار کی طرف آگیا۔ بوڑھے مداری کی بے چینی
ہوئی تھی بخار شاید اتنا ہی تیز تھا۔ میں نے کو سومی سے کہا کہ وہ اسے تھوڑی چائے بنا کر
پلائے اور میں خود شکاریوں کی جاسوسی کرنے جھاڑیوں، درختوں کی اوٹ میں آبیٹھا۔

ان کا ریڈیو بجانا بند ہو گیا تھا اور بنگلے کے باہر ایک سرگرمی سی نظر آرہی تھی۔
وہ ٹارچیں اٹھائے آتے اور جیپ میں کچھ نہ کچھ رکھ کر چلے جاتے۔ آدھے گھنٹے تک وہ اسی
طرح آتے جاتے رہے پھر بنگلے کی روشنیاں بجھا دی گئیں۔ وہ ہجوم بنا کر ریڈیو بجانا
ہوئے آئے اور جیپ پر سوار ہو گئے۔ یہ ان کی واپسی کی روانگی بھی ہو سکتی تھی اور پورا

تھا۔

مگر کمرے میں سنا نہیں تھا۔ بستر پر کوئی سو رہا تھا۔

میری تو جیسے جان نکل گئی۔ بستر پر گرے رنگ کی چادر پڑی تھی۔ چادر کے نیچے کوئی آسائش کے ساتھ ہولے ہولے خرائے لے رہا تھا۔ کسی کے سنہرے گھنے بال نیچے پر ڈھیر کی طرح پڑے تھے۔ چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔
یہ یقیناً وہی کرکٹ کیپ والی لڑکی تھی جس پر دو شکاریوں میں چند گھنٹے پہلے لڑائی ہو چکی تھی۔

میں نے خاموشی سے کمرے سے نکل جانا چاہا میں مڑا ہی تھا کہ چادر میں ہلچل مچی اور کسی نے گہری مردانہ آواز میں پوچھا۔ ”کون؟“ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ تو یہ مرد کی آواز تھی۔ اور میں نے ابھی سنہری بال دیکھے تھے؟
میں نے گھوم کر بستر پر نظر ڈالی۔ مجھ سے دوسری بار وہی غلطی ہوئی تھی۔ یہاں ایک نہیں دو انسان تھے۔ سنہری بالوں والی عورت اور گہری گونجیلی آواز والا مرد۔
میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے۔“ پھر میں نے شاید دل ہی دل میں کہا تھا کہ بس مارے گئے شیر خان۔

”اب کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے دہرایا۔ میرے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لیے

تھے۔

مرد نے گھبرا کر عورت کو جھنجھوڑ ڈالا، بولا۔ ”جوہی! یورہائی نس! اٹھو! ہم پکڑے گئے۔“

”آں؟“ عورت نے جیسے سرشاری میں سوال کیا۔ وہ بیدار ہونا نہیں چاہتی

تھی۔

مرد کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ ”اٹھو ہم پکڑے گئے! وہ آگے سالے۔“
عورت ہلکی چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ وہ چادر سے باہر آئی تو مجھے شرمندگی ہوئی۔
میں نے نظریں جھکا لیں۔ مرد برابر چادر میں چھپا بیٹھا رہا۔ میں نے دیکھا اس کے کپڑے بھی بیڈ کے برابر فرش پر پڑے تھے۔ عورت پھر چادر میں چلی گئی تھی۔
”جاؤ۔ آؤٹ! چلو! نکلو! نکلو یہاں سے۔“ عورت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ بری

دل رہی تھی لیکن ایسے جیسے گورے لوگ دیسی زبانیں بولا کرتے ہیں۔

میری سمجھ کام نہیں کر رہی تھی۔ میں چوری کرنے آیا تھا، پکڑا گیا تھا مگر وہ رد نہ رہا تھا۔ ”ہم پکڑے گئے۔“ عورت گھبرا گئی ہے اور گھبرا گھبرا کر جیسے التجا کی جاتی ہے اس طرح مجھ سے نکل جانے کو کہہ رہی ہے اور وہ اونچے طبقے کی ہے۔ مرد نے اسے پہلے جوہی کہہ کر پکارا تھا پھر یورہائی نس کہا تھا، تو کیا وہ کہیں کی شہزادی یا رانی ہے؟
کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کہیں کوئی بہت زبردست گڑبڑ ہے۔ اور گڑبڑ سے نمٹنے

ایک ہی صورت تھی کہ میں ان دونوں کو اور گڑبڑا دوں۔

پہلے میں نے ایک بے معنی جملہ کہا تھا۔ دوبار کہا تھا۔ اس دفعہ میں نے وہی جملہ دھکاتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں یورہائی نس! اب کیا ہو سکتا ہے۔“ جملے میں یورہائی نس دہرائیے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

”پلیز ایک منٹ۔“ عورت نے ایک کھلی مانتہ چادر سے نکالی۔ ”ہمیں ایک منٹ دو۔ بات کرو۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ہم سے بات کرو۔ پلیز۔“

میں نے انہیں ایک منٹ دیا مگر وہیں جما کھڑا رہا۔ میں چور نہیں تھا۔ چور وہ دونوں تھے۔ وہ مجھ سے ایک منٹ مانگ رہے تھے۔ خیر ایک منٹ تو کہنے کی بات تھی۔ دو منٹ میں وہ چادر سے باہر آنے کے قابل ہوتے۔

عورت اسی زرد مردانہ قمیص اور جینز میں ملبوس ہو گئی۔ مرد جوان دو لڑنے والوں میں سے کوئی ایک تھا شکاری کپڑوں میں بھی کوئی خاص بھاری بھر کم نہیں لگتا تھا مگر ایک اندام عورت کے مقابلے میں بہر حال ایسا تھا جیسے ہرن اور چیتا ایک ساتھ پلنگ سے اتر رہے ہوں۔

وہ دونوں میرے سامنے پڑے صوفے پر ٹک گئے۔ انداز ایسا تھا جیسے ہیڈ ماسٹر کے سامنے دو شریر طالب علم بیٹھے ہوں۔

میں نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔ اپنی آنکھیں شغلہ بار تو نہیں اٹاؤں کچھ ناراض کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے گھور کر دیکھا اور کہا۔ ”ہوں۔“

یہ ”ہوں“ اور ”ہاں“ اور ”اچھا“ ایسے لفظ ہیں جو درجنوں معنی دے سکتے ہیں۔
عورت نے کھسکا کر جبرائیت ہوئے کہا۔ آل رائٹ! یہاں تم بھی ہو اور ہم بھی

میں نے نفرت سے اس کے مرد کی طرف دیکھا۔ ”گرہائی نس! مجھے یہاں ہرگز نہیں۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ آواز سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ صورتحال پر قابو پاتی جا رہی ہے۔ ”سمجھتی ہوں“ تم وفادار ہو اور پرانے روایتی خیال کے لڑکے ہو۔۔۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔ بالکل نہیں مگر یہ بھی تو دیکھو، میں یہاں کی نہیں ہوں۔ میری رہا بالکل دوسری دنیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں، صرف آپ کی دنیا میڈم اس کچوے کی نہیں۔ یہ تو اکر بدبودار دلدل سے اٹھا ہے اور ریگتتا ہوا آپ کی بانہوں میں آگیا ہے۔“ یہ فقرہ میں نے کسی انگریزی فلم میں سنا تھا، اسے یہاں آسانی سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ بس میں نے استعمال کر لیا۔

عورت نے ہاں میں سر ہلایا، اپنے مرد کی طرف دیکھ کر مسکرائی، مجھ سے کہی گئی۔ ”اس پر زیادہ سختی مت کرو لڑکے، تم نے سمجھا اور معاف کیا تو اسے بھی معاف کر دو۔“ پھر وہ ہنسی۔ بولی۔ ”بہر حال اسے میں نے چنا تھا۔۔۔ اپنے چھوٹے سے کھیل۔ لیے یہ خود سے آنے کی تو جرات نہیں کر سکتا تھا۔“

مجھے یاد آیا کہ حقیر ملازم نے۔ یہ نمک حرام ملازم ہی ہو گا۔ عورت کا نام بھول لیا تھا۔ اسے جوہی کہا تھا۔ اس نے یہ جرات تو کی تھی۔

میں نے یہی بات کہہ دی اس سے کہا۔ ”یورہائی نس! اس نے نام لیا تھا۔ آ کر جوہی کہہ کر بلایا تھا۔“

”جو۔۔۔ ہی؟ او! ایس! یہ غلط کیا تھا۔“

میں نے کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر سوال کیا۔ ”جوہی کہنے کا حق اسے کب مل گیا؟“ یہ میں نے سوال کیا تھا اور دل ہی دل میں خود اس کا جواب بھی دے دیا تھا جب سے اسے بستر پر آنے کا حق ملا۔“

وہ بولی۔ ”حق؟ ہاں اسے یہ حق نہیں ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو لڑکے!“

وہ نہ صرف رائی یا پرنس ہونے کا فائدہ اٹھا رہی تھی بلکہ مجھ پر اپنی عمر کا

ی جھاڑی تھی۔

میں نے چپک کر روکھے پن سے کہا۔ ”گرہائی نس یہ ”لڑکے لڑکے“ کی تکرار کریں تو مہربانی ہو گی۔“

”اوکے! اوکے۔ تم بتاؤ اب کیا کریں ہم؟“

”مجھے نہیں معلوم آپ کیا کریں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے کرنا ہے۔“

مرد نے جو ابھی تک منہ کھولے کبھی میری صورت اور کبھی اپنی گوری محبوبہ صورت دیکھ رہا تھا۔ میری بات سن کر کسی سزا دیے جاتے پلے کی طرح بے چارگی میں ”کی سی آواز نکالی۔ عورت نے اس کا گھٹنا تھپک کر اسے پرسکون کیا مجھ سے بولی۔

”بتاؤ تمہیں ہزہائی نس دی پر نس کیا دیں گے؟“

میں سمجھ گیا وہ رقم کی بات کر رہی ہے اور ہزہائی نس دی پر نس اس کامیاں ہو ظاہر ہے مجھے خبر نہیں تھی کہ ہزہائی نس دی پر نس وہ جہاں بھی ہے، کسی کو کیا دیتا۔ میں نے بس روایتی وفاداری کی طرح ہاتھ لہرا کر کہہ دیا۔ ”آپ پوچھتی ہیں ہزہائی ادی پر نس اپنے اس غلام کو کیا دیں گے؟ تو سنئے ہزہائی نس کے ایک بار شاباش کہہ بنے ہی مجھے دنیا جہاں مل جائیں گے۔“

مرد بڑبڑایا۔ ”مجھے بتا ہے یہ سالے اتنے ہی وفادار اور پاگل ہوتے ہیں۔“

عورت نے اسے ڈانٹا۔ ”شٹ اپ!“ مجھ سے بولی۔ ”میں تمہارے پر نس کی اتہاری دوست، تمہیں شاباش بھی کہوں گی اور یہ بھی دوں گی۔۔۔ لو۔“ اس نے جھک کر اپنی جینز کی بیک پاکٹ سے ایک مردانہ پرس نکالا اور اس میں ٹھنسی نوٹوں کی لگائی میری طرف اچھالی۔

کرکٹ کے اچھے کھلاڑی کی طرح میں نوٹوں کی اس گڈی کو ہوا ہی میں جھیل تھا مگر میں نے اسے اپنے پیروں کے پاس درمی پر گر جانے دیا۔

اس بات سے عورت اور اس کا لچر محبوب دونوں ہی حیران ہوئے۔ مرد نے ”ہار عورت کی طرف دیکھا اور مایوسی میں سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھا میں پہلے ہی تھا۔“

یہ چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔۔۔ اوکے؟“
میں نے جھک کر اپنے پیردوں کے پاس پڑی نوٹوں کی گڈی بھی اٹھالی اور
اطمینان کے ساتھ کہا، ”جی یور ہائی نس!“ اور پھر میں دروازے کی طرف چلا۔
بستر پر بیٹھے ہوئے اس ہائی نس کے پالتو نے نفرت کی سرگوشی میں ایک لفظ کہا،
”سالا!“

اور میں گھوم گیا۔ ”کیچوے! اپنا گندہ منہ بند رکھ نہیں تو پتلون کھینچ کر لے
جاؤں گا تیری۔“
عورت اس نمک حرام کی طرف غصے میں گھوی تھی، ”تاہر سین! تم اپنی چونچ
بند نہیں رکھ سکتے؟“

تاہر سین ہنٹر کھاتے ہوئے پلے کی طرح سکرسمٹ کر، سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے ہر ہائی نس کو خبردار کیا۔ کہا، ”میڈم! اس
لدھے کو میرے پیچھے مت آنے دینا۔ باہر میرا ڈرائیور کھڑا ہو گا۔ اگر اس نے اس کی
منوس شکل دیکھ لی تو آپ کا اور میرا کانٹریکٹ ختم سمجھئے۔ میرا ڈرائیور ہر ہائی نس دی
پنس کو خبر کیے بغیر نہیں رہے گا وہ میری طرح ”سمجھ دار“ نہیں ہے۔“

عورت بولی۔ ”فکر مت کرو اینڈ گڈ بائی!“

میں کمرے کی سٹکی کھول کر برآمدے میں نکل آیا۔

عورت اور اس کا یار سوچتے رہ گئے ہوں گے کہ یہ غسل خانے سے بیڈروم میں
ایسا قمار غسل خانے میں کس طرح آیا ہو گا؟

وادے کے اندھیرے سے تیز رفتار شکاری جانور کی طرح گزرتا ہوا چند ہی منٹ
لگا اپنی عارضی پناہ گاہ میں آگیا مگر میں جنگل سے اسپرین لیے بغیر آیا تھا۔
لیکن ذرا سوچنے میں جو لے کر آیا تھا وہ بھی تو دوا تھی۔ بلکہ وہی اصل دوا
تھی۔

اس وقت مجھے مداری کا بخار ہلکا لگا۔ وہ آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ میں نے حال
پوچھا تو بولا۔ ”بخار کم ہوا ہے۔“

بخار واقعی کم ہوا تھا۔ میں نے اسے ایک اور چادر اڑھا دی تاکہ خوب پسینہ

عورت مجھے رشوت دے رہی تھی۔ پہلے کسی دوسرے نے رشوت دی تھی اور
مجھے اس منوس جگہ جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا اس بے وفایا پر نس سے۔ وہ ج
بھی ہے اس سے یہ رقم لے کر میں جگہ جگہ لوگوں کو کھلاتا، خوش کرتا نکل سکتا ہوں۔ اپنی
آزادی خرید سکتا ہوں۔

دماغ نے کہا۔ ہاں اس وقت رشوت ہی کا سکہ چل رہا ہے۔ لے لو اور اپنی جان
بچاؤ۔“

عورت نے جو میری خاموشی سے بے چین ہو رہی تھی اور میری صورت ع
جاری تھی۔ التجا کے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو، نوجوان؟“
میں نے جواب میں ایک اور بے معنی جملہ کہا۔ ”تو یہ ہے!“
عورت بولی۔ ”یہ اگر کم ہے تو میں گڑھی پہنچ کر اور بھی بہت کچھ دوں گی
تمہارا عہدہ بڑھا دوں گی۔“

میں نے مشاق رشوت خوروں کی طرح کہا۔ ”میڈم! گڑھی تو بہت دور ہے۔
بولی۔ ”آئی سی! اچھا سمجھ دار آدمی ہو تم۔ تم چاہتے ہو میرا تمہارا گڑھی!
سامنا ہو تو میں تمہیں نہ پہچانوں؟ سینکڑوں ملازموں، وردی پوش نوجوانوں میں کسی ایک
میں کیسے پہچان سکتی ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو آج کے بعد میں تمہیں بھول جاؤں۔“
میں نے کہا۔ ”میں بالکل یہی چاہتا ہوں اور اس کے علاوہ بھی۔“
وہ سمجھی میں سودے بازی کر رہا ہوں۔ ان نوٹوں کے علاوہ بھی طلب کر
ہوں۔

کہنے لگی۔ ”اچھا؟ اس کے علاوہ؟۔۔۔ تو یہ لو۔“ اس نے اپنی گردن میں
جھلملاتا سبک ہار اتار کر میری طرف پھینکا۔ درجنوں چھوٹے چھوٹے ہیرے اس
جڑے تھے۔ میں نے لا پرواہی سے ایک ہاتھ بڑھا کر اسے جھیل لیا۔

عورت اٹھی۔ سائڈ ٹیبل تک گئی۔ دراز کھینچتی اور جھلملاتا ایک بھار
ہیرے جزا بریسلٹ نکالا۔ وہ ہار کے مقابلے میں سو گنا قیمتی لگتا تھا۔ اس نے وہیں
بریسلٹ میری طرف اچھال دیا۔ میں نے اسے بھی کیچ کیا۔

وہ ہنسی کہنے لگی، ”بریسلٹ ملنے کے بعد تمہیں اور تمہاری اگلی تین چار ہفتہ

یہ سب چیزیں میں نے مال غنیمت سمجھ کر چادر میں باندھیں اور غار میں آ
 گیا۔ دیکھا کہ مداری کا بخار اتر گیا ہے ناشتے کے بعد وہ کافی چاق و چوبند ہو گیا تھا۔ غار میں
 ادھر ادھر ٹھہلتا جاتا تھا اور بار بار مجھے یقین دلارہا تھا کہ وہ اب سفر کے قابل ہے مگر اسے
 کچھ اور آرام دینا ضروری تھا۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ دن کا وقت غار میں پڑے رہ کر گزارا جائے اور شام ہوتے
 ہی سفر شروع کر دیا جائے۔

مداری نے دن کا وقت آرام کرتے ہوئے اپنی طاقت بحال کرنے میں گزارا۔
 میں چادر اوڑھے پڑا رہا اور آگے کے سفر کے منصوبے بناتا رہا۔ میں نے مداری کو بتا دیا تھا
 کہ شکاریوں سے بہت بڑی رقم ہاتھ آئی ہے۔ وہ تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ
 تفصیل مت پوچھو۔ بس ہماری تقدیر اچھی ہے کیونکہ اتفاق سے مجھے وہ بات معلوم ہو گئی
 ہے جو کسی اور کو معلوم ہو جاتی تو شکاری مارے جاتے۔ انہوں نے مجھے خاموش رہنے کی
 قیمت دی ہے۔ میں ویسے بھی خاموش رہتا۔ اب انہوں نے اتنی بڑی رقم دے دی ہے تو
 بالکل خاموش رہوں گا۔ تمہیں بھی نہیں بتاؤں گا اور میں نے کہا۔ ”یہ اتنی بڑی رقم ہے
 کہ ہم کسی بڑے شہر میں پہنچ کر بہت بڑا مکان خرید کر بہت سے آدمی ملازم رکھ کے باقی
 عر دولت مند برمیوں کی طرح گزار سکتے ہیں۔ اگر برما سے باہر نکلتا چاہیں تو خود اپنا ہوائی
 جہاز خرید کر جاسکتے ہیں۔ اب سرحدوں پر پیدل بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

بڑے میاں حیران ہو کر میری صورت دیکھتے رہے۔ آخر مسکرا کر چپ
 ہو گئے۔

مداری کو یہ تو پورا یقین تھا کہ مجھے ”کچھ“ رقم ملی ہے باقی وہ سمجھا کہ میں اسے
 خوش کرنے کو مسخر اپن کر رہا ہوں۔

شام سے پہلے ہم نے کھاپی کے تیاری کر کے اپنے مختصر راشن اور سامان کے
 ساتھ سفر شروع کر دیا۔ ہم تینوں آدمی شہریوں کے کپڑے پہنے کبھی سڑک، سواری، کسی
 ہستی کی تلاش میں نکل پڑے تھے۔ اب ہم نے لوگوں کو ستانے کے لیے ایک کہانی بھی
 گولی تھی۔

آئے۔

مداری مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”کہاں گئے تھے؟“
 میں نے کہا۔ ”جائزہ لے رہا تھا۔ بیچ نکلنے کی ایک صورت سمجھ میں آئی ہے۔“
 ”بولو۔ کیسی؟“

میں نے کہا۔ ”بتا دوں گا۔ ابھی سو جاؤ۔“ وہ مطمئن ہو کر سو گیا۔
 پچھلی رات کے مقابلے میں ہم نے یہ رات زیادہ آرام سے گزاری۔ دن نکلنے
 سے کچھ دیر پہلے شکاری لوگ آئے، کچھ دیر رکے، جانے کی تیاریاں کرتے رہے اور اچالا
 پھیلے ہی سوار ہوئے اور نکل گئے۔ میں نے چار شکاریوں اور پانچویں ان کی ہر ہائی نس کو
 جیب پر سوار ہوتے وقت اچھی طرح گن لیا تھا۔ شکار بیگلے میں اب کوئی نہیں تھا۔
 میں نے شکار بیگلے کا ایک دورہ اور کیا۔ دیکھتا یہ تھا کہ وہ لوگ ہمارے مطلب کی
 کیا کیا چیزیں چھوڑ گئے ہیں۔

جاتے ہوئے انہوں نے مرغیوں کا ڈر باکھول کر بچی ہوئی مرغیاں آزاد کر دے
 تھیں۔ وہ اب کپاؤنڈ میں دوڑی دوڑی پھر رہی تھیں۔ بہت مشکل سے دو میرے ہاتھ
 میں آئیں۔ جنہیں ذبح کر کے میں نے صاف کیا اور راشن کے ساتھ باندھ لیا۔ کچھ
 بسکٹ، خشک میوے، پاؤڈر دودھ اور ایسا ہی ہلکا تیار راشن بھی ہاتھ آیا تھا۔ ایک بیڈر
 میں مجھے پرانا سا پیئڈ بیگ پڑا ملا جو پتا نہیں وہ بھول گئے تھے یا فالتو سمجھ کے پھینک گئے تھے
 پیئڈ بیگ خالی نہیں تھا۔ یہ ہمارے لیے خزانے کا تھیلہ ثابت ہوا۔

ہم تینوں کے کپڑے ایسی ابتر حالت میں تھے کہ اگر اس حلیے میں آبادی
 داخل ہونے کی کوشش کرتے تو لوگ ہمیں جیل سے بھاگا ہوا سمجھ کر پولیس کے حوالے
 کر سکتے تھے۔ شکاریوں کے چھوڑے ہوئے پیئڈ بیگ میں الم غلم کے علاوہ دو جوڑی ٹکڑا
 ٹھاک کار آمد چٹوئیں جرسیاں نکل آئیں۔ ہر ہائی نس کی ایک فالتو چیز جسے آسانی
 وہیں مرمت کیا جاسکتا تھا اور ایک نیا بلاؤزر دوسرے کپڑوں کے ساتھ اس کے بیڈر
 میں پڑے مل گئے۔ یہ کپڑے ذرا سی محنت کے بعد کو سومی کے کام آسکتے تھے۔ بس
 ڈھیلے تھے۔

کہانی یہ تھی کہ بڑے میاں برما کے بڑے جاگیردار ہیں۔ میں ان کا بیٹا اور کوسوی ان کی بہو ہے۔ ہم لوگ لڑکی کے میکے جانے کے لیے اپنی گاڑی میں نکلے تھے۔ گاڑی میں آگ لگ گئی۔ ڈرائیور زخمی ہو گیا۔ وہ جنگل میں اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کی امید کم ہے۔ ہم کسی بستی، کسی سواری کی تلاش میں نکلے اور اب بھٹک گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر جائیں۔

مجھے اور کوسوی کو میاں بیوی بتانا ضروری تھا کیوں کہ برما کے سرحدی علاقوں میں نوجوانوں کی دیر سے شادی کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں چودہ برس لڑکا اور بارہ برس کی لڑکی آئیڈیل جوڑا ہوتا ہے۔ ہم دونوں کو میاں بیوی نہ بتایا جاتا رستے میں ملنے والا ہر آدمی یاد رکھتا کہ دو ”بڑی عمر کے“ لڑکا لڑکی بیاہ شادی بغیر ایک مشق بڑھے کے ساتھ گھومتے پھر رہے ہیں۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

یہ کہانی مقامی حالات میں بہت آسانی سے باور کی جانے والی اور جلد بھلا دی جانے والی تھی۔ ظاہر ہے ہم چاہتے تھے کہ ہمارے جانے کے بعد ہمیں یاد نہ رکھا جائے۔ آدھی رات گزرنے تک ہم نے کافی رستہ طے کر لیا مگر رستہ تو وہ ہوتا ہے کہیں پہنچاتا ہے ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ہم اب تک کہاں پہنچ چکے ہیں اور آئے کہاں پہنچیں گے۔

○

ہم بھٹک گئے تھے مگر شاید خانہ بدوشوں میں ایک حس دیہاتیوں اور بریوں زیادہ ہوتی ہے۔ مداری کو پورا یقین تھا کہ صبح ہوتے ہوتے ہم کسی قصبے میں پہنچ جائیں۔ وہاں سے ہو سکتا ہے کہ کسی بڑے شہر کو سفر کریں نکلتی ہوں۔ رات آدھی ہوئی تو ہم نے درختوں سے گھری ایک کھلی جگہ میں آرام کیا۔ لہلہا پیا اور پھر چل پڑے۔

بڑے میاں کا اندازہ صبح نکلا۔ صبح ہونے والی تھی جب ہمیں کسی بستی کی نیاں دکھائی دیں۔ ساری رات چلتے گزری تھی روشنیاں دیکھ کر ہاتھ پیروں میں جیسے آگئی۔ گھٹنے بھر بعد جب دن پوری طرح نکل آیا ہم ایک قصبے میں داخل ہو گئے۔ بوڑھے نے کہیں قصبے کا نام لکھا دیکھا تو کھل اٹھا کہنے لگا۔ ”اب سمجھ میں آگیا کہ ہم کہاں ہیں۔ دارالحکومت رنگون جانے کے لئے یہاں سے ایک سڑک نکلتی۔ رنگون جانے والی کوئی پیک بس بھی یہاں سے ضرور گزرتی ہوگی۔ ویسے اس سڑک موٹر گاڑیوں کا بارہ چودہ گھنٹے سے زیادہ کا سفر نہیں ہوگا۔ کوئی بس پکڑ لیں گے اگلے رنگون میں بیٹھے ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”رنگون جانے کے لئے بے شک یہی سڑک استعمال کریں گے پیک بس کو بھول جاؤ۔ ہمارے پاس بہت پیسا ہے۔ ٹیکسی کرائے کی گاڑی کچھ کر لیں کرائے پر نہ ملی تو خرید لیں گے یہاں رکو ”آرام کرو“ دن کا وقت کھاپی کے اور سو کے اور ابھی ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرو۔“

مداری کہنے لگا کہ ہوٹل، کرائے کے کمرے، مکان یہ سب شاید یہاں نہیں۔ ہم پہلے کسی دودھ کی دکان یا چائے خانے میں رکیں گے وہاں کھاپی لیں گے اور تاچھ کر لیں گے۔

ہم نے ایسا ہی کیا۔ چھوٹے سے بازار کا واحد چائے خانہ چھوٹا ہی تھا نیا کھلا تھا

والا گھر تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ گھر میں دو باتھ روم تھے اور بری بات یہ تھی کہ ان کی خالی نہیں تھا۔ دونوں کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ ہاں دالان میں ایک بھاری پردہ اس نے ایک بستر، میز اور تین چار کرسیاں ڈال دی تھیں۔ کہنے لگا۔ ”کبھی دونوں کرائے پر اٹھ جاتے ہیں تو میں اپنے لیے یہ انتظام کر لیتا ہوں۔ اکیلا تو آدمی ہوں۔ نا بستر، میز، کرسی یہ تم سنبھالو۔ میں تو دن بھر چائے خانے میں رہوں گا۔ تم لوگ مکر۔ رات کا پھر رات میں سوچیں گے۔ کبھے آرام کرو۔ یہاں ٹھہرنے کا تم سے نہیں لوں گا۔“

ہم نے کہا۔ ”نہیں تمہیں لینا پڑے گا۔ یہی مہربانی کیا کم ہے کہ جگہ دے رہے

دونوں کمرے اندر سے بند تھے۔ اس نے بتایا چھ سات امریکن آئے ہوئے۔ شریف لوگ ہیں اور بڑھے بھی ہیں۔ یہاں سے چھ کوس پر کوئی پرانا مندر ہے۔ دن سے اس کی تصویریں کھینچ رہے ہیں، فلم بن رہے ہیں پتا نہیں اور کتنے دن ٹھہریں۔ مجھے ابھی پندرہ دن کے ایڈوانس پیسے دے دیئے ہیں پھر وہ بتانے لگا کہ یہ لوگ صرف سونے اور نہانے دھونے آتے ہیں۔ کھانا پکانا سب ایک بڑی بس جیسی ہے اٹھا کرتے ہیں۔ یہاں کاپانی بھی نہیں پیتے۔ سب کچھ بس میں بھر کے لائے ہیں۔

کہنے لگا۔ ”وہ بس ادھر ہی مندر کے پاس کھڑی ہے۔ یہاں سے وہاں جیپوں آتے جاتے ہیں۔ ٹھیکے دار کی دو جیپیں انہوں نے ہی کرائے سے لی ہیں۔ جبھی وہ لعنتی کی ترجمانی باتیں کر رہا ہے۔ ان سے خوب پیسے جو کما رہا ہے۔“

میں نے سوچا پیسے تو خیر تو بھی کما رہا ہے بھائی مگر آدمی تو ٹھیک ہے۔ چھپچھورا نہیں کر رہا۔

وہ ہم تینوں کو پردہ پڑے دالان میں چھوڑ کر اپنا چائے خانہ سنبھالنے چلا گیا۔ دوپہر تک ہم دالان میں پڑے آرام کرتے رہے۔ چار بڑھے امریکن ’دو مرد‘ اور تین تقریباً ایک جیسے پھول دار نیکر ’جرسیاں پہنے‘ انادو کمروں سے نکل کر آئے اور ہم تینوں کو ہائی ہیلو کہہ کر مسکراتے ہوئے نہانے دھونے چلے گئے پھر آئے تو ہاتھ ہلاتے بازار میں اتر گئے۔ میں نے جھانک کر دیکھا نیچے جیپوں کا وہی ٹھیکے دار بوجب لیے کھڑا تھا۔ بڑھے امریکن اترے تو وہ اونچی آواز میں انہیں گڈ مارننگ کہتا ہوا نکلتا تھا۔ وہ اس وقت اپنی پوری بیتی دکھا رہا تھا اور خوشامد میں دہرا ہوا جا رہا تھا۔

ابھی پوری طرح چلا بھی نہیں تھا۔ مالک اناڑی سا لگتا تھا۔ ہم پہنچے، ہم نے یہ ظاہر کیا جیسے کسی ہمدرد مسافر نے اپنی گاڑی میں یہاں چھوڑ دیا ہے۔ بانی کہانی وہی سائی انجن میں آگ لگنے والی۔ میں نے چائے خانے والے سے پوچھا۔ ”یار یہ بتاؤ ہمیں کچھ دیر آرام کرنا جگہ مل جائے گی؟“

کہنے لگا۔ جگہ تو مشکل ہے۔

میں نے کہا جگہ کو چھوڑو اچھا یہ کہورنگون جانے والی تیز رفتار سواری کہاں ملے گی۔

وہ کہنے لگا۔ ”بس ملتی ہے ایک دن چھوڑ کے چلتی ہے۔ شام میں آئی۔ گزرے دن آئی تھی۔ اب کل آئے گی۔“

”کوئی اور سواری؟“

وہ بولا۔ ”تم لوگ کھاپی لو گے تو میں جگہ بتا دوں گا۔ یہاں ایک ٹھیکے دار جیپیں کرائے پر چلاتا ہے اس سے بات کر لینا۔“ پھر سوچ کر کہنے لگا۔ ”گاڑی چڑھے پہلے کچھ دیر اگر آرام کرنا چاہو تو میرا اپنا گھر ہے۔ ایک فیملی تو آرام سے ٹھہر سکتی وہیں آرام کر لینا۔ تھوڑے سے پیسے دینا پڑیں گے۔“

آدمی ہنسا ہنسا ہنسا نے کہا کہ ٹھیک ہے کھانے کو تو دو۔ خیر ہم نے چار سالے دار تازہ روٹی اور صبح ہی صبح توڑی گئی فوری طور پر پکائی ہوئی سبزی کا ناشتا کیا۔ نے دودھ، کسی نے چائے پی۔ میں نے ناشتے کے پیسے اور بھر مٹھی ٹپ دیا چائے خانے خوش ہو گیا کہنے لگا۔ ”آؤ جیب والے ٹھیکیدار کے پاس میں تمہیں خود لے چلا ہوں۔ بڑے میاں اور کوسوی کو چائے خانے میں بیٹھا چھوڑ کر میں چائے والے ساتھ ٹھیکے دار کے پاس پہنچا۔ وہ کوئی بہت فضول سا آدمی تھا۔ پہلے گول مول باتیں رہا مگر جب چائے والے نے شرم دلائی لعن طعن کی تو بولا کی چار بیٹیاں ہیں میرے تین بھائے پر گئی ہوئی ہیں، ایک کا انجن کھول رکھا ہے دو روز میں تیار ہو جائے انتظار کرو، دے دوں گا۔

چائے خانے والے نے کہا۔ ”اسے چھوڑو“ آجاؤ میں کچھ اور بندوبست کراؤں گا۔“

وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ بھرے بازار میں تیسری منزل پر دو کمروں اور

ہیں۔ ایک بات بتاؤں؟ یہ امریکن میرے سے کمرہ مانگ رہے تھے میں نے کنور صاحب! نے کر دی بھلے کوئی امریکا سے آئے کہ افریکا سے آئے۔ ابھی بھی کسی نے کوئی بات کی! شکایت کی تو سرکار بول دوں گا کہ ہم پرم پرا (روایت) والے لوگ ہیں۔ ایک کمرہ کیا بڑے ٹھاکر اور کنور صاحب کے لئے، بہوجی کے لئے اپنا گھر خالی کر دیں گے۔ ہم۔ ہاں اور نہیں تو ہر جگہ کی کوئی پرم پرا ہوتی ہے۔ میں نے خبر ہے نئی جیب ادھر سامنے کیوں نہیں کھڑی کی۔ کھلی میں کس وجہ سے کھڑی کی ہے۔“

میں نے اسی بیزاری سے انکار میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ”کنور صاحب! سمجھا کر دسرکار! اگر آپ والی جیب سامنے لے آتا یہ سالے امریکن اسے دیکھ کے پھیل جاتے کہتے یہ ہم لیں گے دیئے تو مہاراج! وہ بھی کسٹر ہیں پر آپ کا یہ سیوک، آلوک تا تھ بولا، پرم پرا والا آدمی ہے۔ سب سے پہلے اپنے رانا صاحب کی سیوا میں اچھی، نویلی گاڑی دیں گے۔ پیچھے کسی اور کی سیوا ہوگی۔“

میں نے سوچا اگر اس کا سوچ بند نہیں کیا گیا تو یہ مسلسل بک بک کیے جائے گا۔ میں نے جمائی لے کر کہا۔ ”ٹھیک ہے ابھی تم جاؤ۔ رانا صاحب سرکار کو یہی جگہ پسند آئی ہے۔ اب نہ میں کچھ کہہ سکتا ہوں نہ بہوجی کچھ عرض کر سکتی ہیں۔ ہم شام تک یہاں ہیں۔ دن چھپے گاڑی تیار کر لانا۔ بارہ چودہ گھنٹے کا دن ہے۔ ٹنکی فل رکھنا۔ ایک جبری کین بھی پٹرول بھر کے ساتھ رکھ لینا۔“

وہ ہاتھ باندھ کر جھکا پھر اپنی چٹکیوں سے دونوں کانوں کی لویں تھام کر کہنے لگا۔ ”ایک غس تانخی ہو رہی ہے سرکار اسے بھی جرور شمار کریں گے۔ اپنی غریبی کے ہاتھوں زبور ہو کہہ رہا ہوں کہ سرکار سے تھوڑا سا اڈوانس مل جاتا تو فالتو پٹرول بھر دالیتا۔ کنور صاحب! آپ تو سرکار جانتے ہیں کہ چیل کے گھونسلے میں ماس بھلے ہی مل جائے گا پر ہارے وہاں۔۔۔۔۔“

میں نے ایک انگلی اٹھا کر اسے چپ ہو جانے کا اشارہ کیا اور بے زاری سے ہٹون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی وہ پوری گڈی نکالی جو ہر ہائی ٹس نے ”عطا“ کی تھی۔

ٹھیکے دار نے گڈی میرے ہاتھ میں دیکھی اور مجھے لگا جیسے وہ کھڑے سے گر جائے گا۔ میں نے سوکھے منہ سے پوچھا۔ ”کتنا دوں؟ ہزار؟ دو؟ ہاں؟ بولو؟“

ٹھیکے دار نے جھک کر سوکھے حلق سے کہا۔ ”ہزارے دے دو سرکار۔ باکی جو

امریکن اس سے چابی لے کر روانہ ہو گئے۔ ٹھیکے دار چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔

وہ آیا تو دانت نکالتے ہوئے نمش کار، نمش کار کرتا پہلے مداری کی طرف ہل میری طرف متوجہ ہوا۔ ہاتھ باندھ کر پہلے بوڑھے کے سامنے پھر میرے سامنے خوشامد کے ساتھ مجھ سے کہنے لگا۔ ”کنور صاحب! آپ کو سویرے دیکھا تھا۔ شا کرنا، بیچانا نہیں تھا۔ سرکار۔ پھر مداری کی طرف ذرا سا اپنا سر خم کر کے بولا۔ ”رانا صاحب سرکار کے آنے کا، آپ کے اور بہوجی کے آنے کا اس حرامی وکبر نے بتایا ہی نہیں تھا۔ اب میرے کو کیا پتا کہ وہ سالہا کس مہمان آدمی کو میرے پاس لے کے آیا ہے۔ معاف کرنا کنور صاحب! میں سمجھا کہ ہو گا کوئی پبلک میں سے بس میں نے کنور صاحب! ٹال دیا۔ ار سالے وکبر کے سنگ نہیں آتے آپ تو میں منہ سے بات نکالنے سے پہلے جرور پکا سوچتا۔ ہو، ہی، ہی، ہی۔ ابھی بھار میں کسی نے بات کی۔ بولا چیت پور سونیا کے بڑے ٹھاکر اپنے رانا صاحب مہراج اور کنور صاحب آئے ہیں اور بہو صاحب جی آئی ہیں اور تینوں وکبر سالے کی ٹٹاری پہ گئے ہیں تو میں نے سوچی، ہو رہے ہو۔ آپ تو آئے ہی نہ میرے پاس۔ بڑی بھول ہوئی میرے سے۔ بس سرکار! میں سب سے بڑھیا نئی نویلی جیب لے کے چلا آیا ہوں ترنت۔“

میں نے دل میں کہا جتنا اسے سمجھا تھا یہ تو اس سے کہیں زیادہ چھچھوڑا اور چالاک ہے۔ خبر مجھے کیا یہ بد معاش جیب لے آیا تھا اور خوشامد کر رہا تھا۔ چائے والے! ہم نے بتایا تھا کہ ہم چیت پور سونیا کے جاگیر دار اور اس کے بیٹے بہو ہیں۔ یہ جولا ن نے دی تھی۔ اس وقت خوب کام آئی تھی۔

میں نے خوشامدی ٹھیکے دار کی طرف بے زاری سے دیکھا۔ سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔ ”جیب لے آئے! اچھا کیا۔ ابھی سے ہمارے نام پہ چڑالو۔ چابی تم ہی رکھو۔ جب ہمیں ضرورت ہوگی آدمی بھیج کے بلوالیں گے۔ ٹھیک“

وہ خوش ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”وہ تو کنور صاحب آپ کا حکم تھا۔ جیب سرکار آپ کے نام پر پہلے ہی چڑھالی تھی۔ پر ابھی دو باتیں ارج کرنی ہیں۔ پہلی بات ہے کہ آپ میرے کو شکرو، مانی دو۔ میں اس ٹیم بیچانا نہیں تھا سرکار! دوسری بات مہاراج! کہ اس گڈی بد بودار جگہ کو چھوڑ دو آپ میرے سنگ چلو۔ ادھر آپ لوگ کے لایک کمرہ بھی ہے، جراسا کیچہ بھی ہے۔ بے فکری سے بہوجی صاحب ادھر ٹہل سکتے

نہر کس بات سے اسے ٹھک ہو جائے کہ بڑے ٹھاکر اصل میں مداری ہیں اور بہوجی صاحب ان کی پوتی نہیں ڈگدگی بجاتی ہیں۔

ٹھیکے دار بسولا نے درجنوں بار مسافروں کو اپنی قصبے سے رنگون اور رنگون سے ہارنے مندر والے اس قصبے میں پہنچایا تھا۔ اسے اندازہ تو تھا کہ میں ”کنور صاحب“ رنگون آیا ہوں تو کہاں ٹھہروں گا۔ صرف ایک بار اس نے پوچھا تھا کہ سرکار لوگ کسی کو مجوانی (ہیزبانی) کی عزت تو نہیں دیں گے؟ ہوٹل ہی میں ٹھہریں گے؟“ ہم نے سر ہلا کر ہاں کا اشارہ دیا تھا۔ اس لئے رنگون شہر میں داخل ہوتے ہی ٹھیکے دار نے جیب کا رخ ہوٹل کوئی نینٹل کی طرف موڑ دیا۔

وہ یہاں درجنوں بار آیا تھا پھر اس کا ایک رشتے دار مدن بسولا یہاں گیٹ منیجر تھا۔ تو اس نے ہم تینوں بد حال ”سرکار“ لوگوں کو جیب ہی میں ٹھہرنے کو کہا اور دوڑا دوڑا جا کر کاؤنٹر سے بسولا کو بلالیا۔ رستے میں اس نے ہماری گاڑی میں آگ لگنے کا اور ہماری زبردست دولت مندی کا ذکر کر دیا ہو گا اس لئے اس کا عزیز بھاگا بھاگا آیا اور اس نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ برابر کے دو بڑھیا کمروں میں پہنچا دیا۔

میں نے چلتے وقت ٹھیکے دار سے کہہ دیا تھا کہ رنگون پہنچ کر سب سے پہلے میں بازار جاؤں گا اور اپنے لیے بڑے ٹھاکر کے اور بہوجی صاحب کے لئے کچھ سامان خریدوں گا۔ ایک ٹیکسی تیار رکھنا۔

ٹھیکے دار ٹیکسی کیوں منگواتا۔ میں جتنی دیر میں ”نہادھو کر“ کھاپی کر تیار ہوا اور نیچے آیا ٹھیکے دار آلوک ناتھ تازہ دم ہو کر جیب کو کپڑا مار کر مجھے بازار لے جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

میں نے اپنے بڑے میاں اور کوسومی کے لئے شہر کے سب سے فیشن ایبل بازار سے اچھے کار آمد اور ٹھاکر دار کپڑوں کے بہت سے جوڑے اور جوتے وغیرہ خریدے۔ ٹھیکے دار کو سنا کہ ایک فرضی ٹیلی فون کال بھی کی جس میں میں نے اپنی ”جاگیر“ جیت پور سونیا میں اپنے ملازموں کو گاڑی کے جلنے اور ڈرائیور کے فلاں فلاں جنگل میں لے کر رہنے کی خبر دی اور انہیں حکم دیا کہ وہ فوراً ڈرائیور کی خبر لیں۔ میری فکر نہ کریں۔ میں بڑے ٹھاکر حضور اور بہوجی صاحب کے ساتھ کچھ دن کوئی نینٹل رنگون میں رکوں گا۔

ٹھیکے دار بسولا۔ بہت دور سے اور بہت دیر سے ہمارے ساتھ تھا۔ اب اسے

مرجی ہو ادھر دے دینا میں آپ کا ہوں۔ گاڑی بھی آپ کی ہے۔ غس تانخی مانف۔“ اس کی آنکھیں خوشی اور لالچ سے چھلکی پڑتی تھیں۔

ہم تینوں نے دن میں آرام کرنے کے سوا کوئی خاص کام نہیں کیا۔ رات ہونے سے پہلے ٹھیکے دار اپنی جیب کو پوری طرح لیس کر کے موجود ہوا۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ یہ شخص کسی اور کو گاڑی نہیں چلانے دے گا۔ سفر کے آخر میں اسے ہم سے بھاری رقیں جو کھینچنی تھیں۔

میں نے رخصت ہوتے ہوئے دیکر چائے والے کو اچھا خاصا بھاری انعام دیا۔ وہ اچھے انعام کی توقع کر رہا تھا لیکن یہ رقم اس کے خواب و خیال سے بھی زیادہ تھی۔ یہ بات اس نے خود مجھ سے کہی۔

دیکر چائے والا ٹھیکے دار کو اس کی ہڈیوں تک پہنچاتا تھا۔ ٹھیکے دار سے جیب نکلوانے کی یہ ترکیب خود اسی کی سوچی ہوئی تھی۔ اس نے ٹھاکر چیت پور سونیا والی بات پورے بازار میں پھیلا کر اپنے دوست ایک دکان دار کو پابند کیا تھا کہ وہ ہماری جاگیر داری اور دولت مندی کے قصے مبالغے کے ساتھ خاص طور پر ٹھیکے دار تک پہنچا دے۔

اسے یقین تھا باقی جال ٹھیکے دار خود ہی اپنے آس پاس بننا چلا جائے گا۔ دیکر اور دوسرے بازار والے ہمیں رخصت کرنے جیب کے پاس آکھڑے ہوئے تھے جس سے ٹھیکے دار آلوک ناتھ بسولا بہت جزیز ہو رہا تھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بد بدراہا تھا۔ اپنے کاروباری حریف۔ ”مس سالے دیکر“ کو گالیاں دے رہا ہو گا۔

جیب کی حالت واقعی بہت اچھی تھی۔ میں اور ٹھیکے دار اسے باری باری چلاتے رہے۔ جب میں گاڑی چلا رہا ہوتا تو ٹھیکے دار بڑے ٹھاکر اور بہوجی کے احترام میں اندر نہیں نکلتا۔ جیب کے پیچھے بندھے رسوں کے چھینکے میں جا کے لیٹ جاتا تھا۔ سڑک پر دیکھنے والے یہ عجیب منظر دیکھتے اور تالی بجاتے تھے۔ بعض گاڑیاں ہارن دیتی گزرتی تھیں۔ برما میں عام طور پر شکاری لوگ جیب سے لٹکتے اس جھولنے میں شکار کیا ہوا جانور ڈال کر لے جاتے ہیں۔

بارہ چودہ گھنٹے کا یہ طویل سفر ہمارے لئے تقریباً آرام دہ رہا۔ میں نے چلنے سے پہلے یہ احتیاط کی تھی کہ مداری اور اس کی پوتی کو خوب اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ راستے میں وہ زیادہ تر خاموش رہیں۔ مجھ سے اور آپس میں بھی بری زبان کی بجائے جگمگے میں بات کریں جو زبان آلوک ناتھ بسولا ٹھیکے دار کو نہیں آتی۔ کیا

یہ کچھ قریب کا اور جانا پہچانا سا لگا۔ میں رک کر پڑھنے لگا تو ٹھیکے دار بولا۔ ”مہارانی صاحب گوروں کے دیس سے آئی ہے سرکار! کتنی بار کبھی اکیلی کبھی مہاراج کے سنگ مندر دیکھنے آتی ہے۔ ویسے اپنی دس گاڑیاں تولاتی ہوں گی پن ہر دے میری ہی جیب منگاتی ہے مہارانی۔“

سنتا گڑھی؟ گڑھی! گڑھی اور ناہر سین! میں نے نوٹ بک ٹھیکے دار کے ہاتھ سے لے لی۔

اوپر راجا نے بری میں اپنے دستخط کئے تھے۔ ”ناہر سین“ اور نیچے رانی نے انگریزی میں ”جوئی ناہر سین“ لکھا تھا۔

”جوئی۔ جوئی۔ گوروں کے دیس سے آنے والی گڑھی کی مہارانی۔ ہاں، یہی شکار جنگل میں آئی تھی اور اس کے ساتھ ایک ناہر سین تھا مگر وہ ناہر سین ’سالا لچڑ‘ جوئی یا جوئی کا نوکر وہ جو بستر سے چیتے کی طرح اتر رہا تھا۔ وہ مہاراجا نہیں اس کا ہم نام ہو گا۔ یا ہم نام بھی نہیں ہو گا۔ وہ گوری مہارانی جوئی اسے اس نام سے پکارتی ہو گی۔ مگر کیا یہ وہی جوئی ہو گی؟ میں نے ٹھیکے دار سے کہا کہ میں نے مہارانی کو کہیں دیکھا ہے۔

بولا۔ ”ضرور دیکھا ہو گا۔ راج گدیاں ختم ہو گئیں پر آپ سرکاروں کا میل جول تو آپس میں اسی طرح کا ہے سرکار! راجوں کے سنگ راج ہی انھیں گے بیٹھیں گے۔“

میں نے کہا کہ مہارانی جوئی کو بہت پہلے دیکھا تھا وہ ایسی ایسی شکل کی دہلی پتلی، چھوٹے قد کی عورت تھی۔ کہنے لگا۔ ”ہاں سرکار! بالکل وہی آپ نے مانو تصویر کھینچ دی مہارانی صاحب کی۔“

میں نے ایسے ہی سرسری سا اس ناہر سین لچڑ کا ذکر کیا۔ اس کا حلیہ بتایا۔ وہ بولا۔ ”تاں سرکار! اپنے مہاراج ناہر سین تو کوئی ستر بہتر برس کے ہوں گے۔ موٹاپے نے ایسا کر دیا ہے کہ اب تو دو ڈھائی برس سے گڑھی سے نکلتے ہی نہیں۔“ پھر وہ آہستہ سے کہنے لگا۔ ”گور نمٹ نے باہر جانے پر پابندی بھی لگا رکھی ہے کوئی مقدمہ ہے۔“

اوہ! میں نے اس ناہر سین کو پہچاننے کی ایک آخری کوشش کی۔ پوچھا کہ ”کنپٹی پر مسابے اس جواں ناہر سین کے“ بات کرتا ہے تو لگتا ہے بہت ذرا ہوا ہے۔ وہ کون ہے؟

ٹھیکے دار ہنسا بولا۔ ”اچھا سرکار اس کا کہہ رہے ہیں۔ وہ ناہر سین نہیں نہار سنگھ

رخصت کرنے کا وقت آگیا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں بلایا تو وہ ہاتھ باندھے، جوتے اتارے قالین پر دور کھڑا رہا۔

میں نے کہا۔ ”بتا بھی تجھے کتنے دیے جائیں؟“ تو وہ بہت دیر تک ”میں بھی آپ کا گاڑی بھی آپ کی“ والی لائن چلاتا رہا پھر اس نے ایک رقم بتائی جو اس کی لالچی طبیعت دیکھتے ہوئے مجھے کچھ زیادہ نہیں لگی۔

میں نے رقم سے اوپر اسے پیسے دیے تو دہرا ہو گیا کہنے لگا۔ ”میرے کو مالوم تھا سرکار لوگ نہال کر دیں گے۔ اسی وجہ سے میں نے منہ کھول کے نہیں مانگا۔ پر سرکار اب ایک در کھاس جرور کروں گا۔“

میں نے سوچا لے بھی اب یہ پھیل رہا ہے اور بھی رقم مانگے گا مگر اس نے جیب سے ایک بڑی سی نوٹ بک نکالی کہنے لگا۔ ”کنور جی صاحب! اس نوٹ بک پر میری سیوا سروس کے بارے میں کوئی اچھی بات لکھ دو۔ سب کو دکھاؤں گا کہ دیکھو سالو کیسے کیسے مہمان لوگ نے میری جیبوں کی شو بھا بڑھائی ہے۔“

میں نے نوٹ بک لے کے انگریزی میں لکھ دیا کہ ٹھیکے دار آلوک ناتھ بسولا اچھا بزنس مین ہے۔ بہت اچھا ہم سفر بھی بن سکتا ہے اگر یہ اپنی زبان کبھی بند بھی رکھا کرے۔ ویسے یہ اپنے گاہکوں کو خوش کرنا جانتا ہے۔

میں نے یہ پڑھ کر سنایا اور کہا۔ ”دیکھ یہ لکھا ہے تیرے لیے۔“ تو ادب سے ہنسا ہاتھ باندھے کھڑا رہا پھر کہنے لگا کہ ہاں ٹھیک کہتے ہو سرکار! میں کبھی کبھی زیادہ ہی بول جاتا ہوں۔

کہنے لگا۔ ”کنور جی صاحب! انگریزی ادھر کوئی نہیں سمزتا۔ آپ بری میں یہی بات لکھ دو گے تو اس دیکبر سالے کو پڑھا پڑھا کے آدھا کر دوں گا۔“

میں نے یہی بات بری میں لکھ دی تو خوش ہو گیا۔ مجھے اور خوش کرنے کو ذرا قریب آگیا۔ اپنی نوٹ بک الٹ پلٹ کر دکھاتا رہا بولا۔ ”سرکار! راج گدیوں کے اور جاگیروں کے بڑے بڑے نام لکھے ہیں یہ دیکھو سرکار! کو چین اسٹیٹ کے مہاراج کمار آئے تھے۔ پچھلے برس میری تعریف لکھی ہے۔ ایک بار حیدر آباد دکن کے پرنس اجت جا (عزت جا) آئے تھے اور یہ دیکھو مہاراج! یہ سنتا گڑھی راج کے مہاراجا ناہر سین ادھر راج اور ان کی مہارانی نے سائن کیا ہے۔“

بسولا کو اپنے کمرے پر بلانا۔ خود کاؤنٹر پر مت جانا۔ اسی کو بل کے پیسے دے دینا۔ اسی سے ٹیکسی منگوا کر خاموشی سے نکل جانا۔“

مداری تشویش سے کہنے لگا۔ ”کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ اور یہ سن لو! میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ اب تم ہماری ہر بات میں شریک ہو گئے۔ ہمارے اپنے ہو گئے۔“ میں نے کہا۔ ”اپنے بیگانے کی بات چھوڑو ایسی کوئی مصیبت نہیں آگئی جو میں تمہیں بتاؤں۔ قصہ یہ ہے کہ شکار جنگل میں میرا جس سے جو بھی سودا ہوا ہے۔ اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اسی لیے تمہیں کچھ نہیں بتایا اور اس لیے تمہیں الگ رکھنا چاہتا ہوں۔“

میری بات مداری کی سمجھ میں آگئی۔ وہ کمرے سے چلا گیا۔ اور میں اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا۔

مداری کے جانے کے بعد میں نے مدن بسولا کے لئے ٹیلی فون کیا۔ فیجر بسولا کو بلا کر میں نہار سنگھ یا ناہر سین کو سمجھنا چاہتا تھا اور مجھے اس بسولا کی مار بھی دیکھنی تھی کہ کہاں تک ہے۔

ہم اس ملک کے سب سے بڑے، سب سے بااثر ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ یہاں کے منیجر اور معزز کارندے بین الاقوامی ارب پتیوں کی مہمان داری اور خدمت کرتے، کروڑ پتیوں سے بے تکلفی سے بات کرتے اور لکھ پتیوں کی سفارش کرتے تھے۔ اب جب کہ میرے پاس بڑی رقمیں تھیں۔ میں یہیں بیٹھ کر سب کچھ کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے دوسری تمام جگہوں سے زیادہ، یہاں صرف ایک ہی شے کی حکمرانی تھی۔ دولت کی اور یہاں ہم محفوظ تھے۔ پیسے کی طاقت ہے۔

ہوٹل کو نئی نینٹل میں سینکڑوں کی گنتی ٹپ دینے میں اور ہزار اور لاکھ کی گنتی بلوں کی تیاری میں استعمال کی جاتی تھی۔ کسی غیر معمولی کام کے لئے یقیناً کروڑ اور اس سے اوپر کی رقم خرچ ہوتی ہوگی۔ ظاہر بات ہے مجھے غیر معمولی کام کرانے تھے اس کے لئے میرے پاس غیر معمولی رقمیں موجود تھیں۔

مجھے چند گھنٹوں میں تین بری پاسپورٹ چاہئیں تھے اور یہاں سے نکلنے کے لئے پاکستان یا مشرق وسطیٰ، مشرق بعید کے کسی بھی ملک کے تین ہوائی ٹکٹ درکار تھے اور وہ بھی پہلی یا قریب ترین فلائٹ پر۔ میں ان دو کاموں کے لئے کروڑ یا اس سے زیادہ کی رقم خرچ کر سکتا تھا۔

ہے، پہلے کی طرح کون کون کرتا ہے وہ ادھر ہی گائیڈ لگا ہوا ہے۔ کوئی نینٹل میں۔ میرے کزن مدن بسولا کا چچا ہے، مکھن لگاتا رہتا ہے۔ آپ نے سرکار! پہلے کبھی اسے یہیں ہوٹل میں دیکھا ہوگا؟“

وہ یہاں ہے؟ وہ ناہر سین یا نہار سنگھ۔ میں تو سمجھا تھا شکار جنگل میں اس شخص کو میں آخری بار دیکھ رہا ہوں۔ یہ کہاں آگیا؟

ٹھیکے دار میری صورت کے جا رہا تھا۔ میں نے ٹالنے کو کچھ بھی کہہ دیا۔ ٹھیکے دار بسولا، سلام کر کے رخصت ہوا۔

میں نے صوفے کی پشت سے سر نکال دیا۔ ”ہم اس ہوٹل میں بالکل غلط موجود ہیں مجھے فوراً کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔“

پہلے تو میں نے انٹر کام پر بڑے میاں سے برابر کے کمرے میں بات کی۔ انہیں بتایا کہ جن لوگوں سے میں نے رقم لی ہے۔ ان کا ایک آدمی اسی ہوٹل میں موجود ہے اس لئے میں اپنے کمرے سے اب کم ہی باہر نکلوں گا۔ بڑے میاں اس وقت میرے پاس اکیلے آجائیں اور ضروری بات سن لیں۔

مداری بڑے میاں آئے۔ اب جب کہ ہم ایک شاندار ہوٹل میں تھے اور مداری کے بدن پر انگریز بذھوں کے پہننے کا بڑھیا لباس تھا تو واقعی وہ کہیں کا ”راجا ٹھاکر“ صاحب لگ رہا تھا۔ اپنے مزاج میں باوقار، رکھ رکھاؤ کا آدمی تو وہ پہلے ہی تھا۔

جتنا بتایا جاتا ضروری تھا میں نے اسے بتا دیا کافی رقم اس کے حوالے کی جسے اس نے انگریزی کپڑوں کے نیچے پہنے اپنے برمی شلو کے کی جیب میں رکھ کر اوپر سے سیفٹی پن لگالیا۔

میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے ہم اچانک ہچکچڑ جائیں۔ مجھے بن بتائے جانا پڑے۔“ پوچھنے لگا۔ ”کیوں؟“

میں نے کہا۔ ”اے بھی نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے کچھ بھی نہ ہو اور اگر آگے جہاں بھی جاتا ہے ہم ساتھ ہی جائیں۔ ویسے بھی مجھے تم سے بہت کچھ سمجھنا ہے۔ فکر نہ کرو یہ تو میں احتیاطی بندوبست کر رہا ہوں۔“

میرے بہت کچھ سمجھنے والی بات پر مداری جان گیا کہ میں ”اس کی کاپی بدل“ کا انسان سے رچھ بننے کا حوالہ دے رہا ہوں۔

میں نے کہا۔ ”سنو میں اگر اکیلا نکل جاؤں تو تم ایسا کرنا کہ ہوٹل کے فیجر مدن

تھا۔ مال کا نئے وقت بھی ٹھنڈے ٹھنڈے چھری چلائے گا۔
میں نے کہا۔ ”بابا ٹھاکر کے لیے، میرے لیے اور دھرم پتی بہو جی کے لئے
چار گھنٹے میں انٹرنیشنل پاسپورٹ اور اگلے بیس گھنٹوں میں باہر کی کسی فلائٹ پر تین کنفرم
نہیں۔ بولو یہ دونوں کام ہو سکتے ہیں؟“

نیجر بولا سر پکڑ جیسے گہری سوچ میں چلا گیا۔ شاید یہ بھی رقم بڑھانے کا
طریقہ ہو گا۔ یا ممکن ہے کوئی بڑی الجھن آپڑی ہو۔

میں نے کھکار کر گلا صاف کیا۔ نیجر نے سر اٹھایا، بولا ”معافی اس بات کی کہ
جناب والا کو فوری جواب نہ دے سکا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے فوری نہیں۔ تسلی بخش جواب سے دلچسپی ہے۔“
کہنے لگا۔ ”آپ راجا لوگ ہو۔ مجھ سے زیادہ چیزوں کو سمجھتے ہو گے لیکن یہ
خادم ایسے چور ہے یہ بیٹھا ہے جہاں سے حکومتیں چلانے والے صدر اور وزیراعظم اور
بادشاہ اگر نہیں تو وزیر، منتری ضرور گزرتے ہیں اور آپ جانتے ہو راج نیقی، سیاست
دزیروں کا دن رات کا کھیل ہوتا ہے۔ کسی وزیر کو قابو کرنا ہو گا۔ اس وقت جو مشکل نظر
آتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر وزیر کو خریدنا پڑا تو کتنا خرچ ہو گا؟“
بولا۔ ”وہی عرض کر رہا ہوں۔ پڑوس کے ملک بھارت اور پاکستان کے حالات
کو میں نے بستی پہ منڈلاتے ہشیار گدھ کی طرح سمجھو پر پھیلا کے اور آنکھیں کان کھول
کے دیکھا ہے ادھر دونوں ملکوں میں گڑبڑ ہے۔ کم سے کم بھارت کی طرف سے تو گڑبڑ
کے سنگل مل رہے ہیں۔ پوری پاکستان میں خاموش بلچل ہے۔ اسکول کالج بازار کارخانے
چل رہے ہیں پر اندر ہی اندر کچھ کڑوا کڑوا کھل رہا ہے۔“

میں نے دل میں کہا کہ بیٹے بولا۔ مجھ سے زیادہ کون جانتا ہو گا کہ کتنا کڑوا کھل
ہو گا۔ دیسے میں نے سر ہلاتے ہوئے نیجر کی بات سے اتفاق کیا۔

وہ کہنے لگا۔ ”ایسی گڑبڑ پھیلائی جاتی ہے۔ جاسوسوں، گھس بیسہویوں کے
ذریعے۔ جاسوس پھیلائے جاتے ہیں۔ پیسا خرچ کر کے اور آپ کو مجھ سے پہلے پتا ہو گا کہ
حکومتوں کے پاس ہر چیز کا بجٹ ہوتا ہے۔ جاسوسی کا بھی بجٹ ہوتا ہے۔ فوج کے خرچے
سے بہت کم مگر ہوتا ضرور ہے اور بڑا بھاری ہوتا ہے۔ تو آج کل کنور صاحب۔ برما میں
اس طرف سے جاسوس اور انہیں شکار کرنے والے ان کا الٹ کرنے والے چلے آ رہے

میں نے سوچا دیکھنا صرف یہ ہے کہ گیسٹ نیجر مدن بسولا کے ہاتھ کیا اتنے
لبے ہیں کہ دی ہوئی مدت میں یہ دو کام کر سکتا ہے۔ جہاں جسے وہ رقم کھلانی ہے وہ
کھلائے اپنا کمیشن اپنی جیب میں ڈالے اور بیٹھے بٹھائے خود بھی دولت مند بن جائے۔ تو
مجھے اس وقت بسولا کی مار دیکھنی تھی کہ کتنی ہے۔

اس کے آنے سے پہلے میں نے چائے منگوالی۔ بسولا آیا تو دوستوں کی طرح
میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ بیٹھے کا اشارہ کیا۔ وہ مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔ چائے بنانے لگا، بولا۔
”جناب والا نے طلب کیا۔ کوئی خدمت میرے لائق؟ حکم کیجئے؟“

میں نے کہا۔ ”بھائی! اتنے رسمی نہ بنو۔ چائے پیو میرے ساتھ۔ مجھے جو کہنا
ہے وہ سن لو۔ جواب دینے سے پہلے خوب سوچ سمجھ لینا۔ میں تمہاری ہاں بھی اور نہ بھی
ایک ہی طرح سے قبول کر لوں گا۔ تم نے نہ کیا تو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔“
بسولا کہنے لگا۔ ”درست فرمایا۔“

چائے کا پہلا گھونٹ لے کر میں نے کہا۔ ”مدن بسولا! تمہاری لیاقتوں اور
صلاحیتوں کے بارے میں تمہارے کزن آلوک ناتھ نے بہت کچھ بتایا ہے مگر تمہارے
سپر دجو کام میں کرنے والا ہوں ذرا ٹیڑھا ہے۔“

مدن بسولا بولا۔ ”یہ خادم بہت سے بہ ظاہر مشکل کام سرانجام دے چکا ہے۔“
میں نے بڑے بوڑھوں کی طرح سر ہلا کر کہا۔ ”مجھے اندازہ ہے۔ اچھا سنا۔
ہماری جاگیر، ریاست جو بھی سمجھو۔ جیت پور سونیا ہے۔ ہزاروں مربع میل میں ٹیک
کے جنگل کھڑے ہیں۔ جنگل کیا سمجھو سونے کی کانیں ہیں۔ سب آئندہ بس ایک دکھ
ہے کہ ہمارے اپنوں میں سے بعض نے ہم سے اتنا پیار نہ کیا جتنا ہمیں ان سے ہے۔ خیر
شکایت سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ انہوں نے میرے خلاف بلکہ بابا ٹھاکر کے خلاف جو ان
کے بھی بڑے ہیں۔ سازش کی ہے۔ ہم وہاں سے توفیق نکل آئے۔ آگے کی کچھ سمجھ
نہیں آتی۔ پیسا اس وقت کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مدن بابو! یہ سمجھ لو۔ جی کھول کر خرچ
کرو۔ جو ایک مانگ رہا ہے اسے سوا بھی دے ڈالو تو پروا نہیں۔ پر کام چوبیس گھنٹے میں اور
جو کھا کر اورو۔ تمہارا بھی فائدہ ہو گا۔

بسولا کی آنکھیں چپکنے لگیں بولا۔ ”جناب والا! میں خادم ہوں۔ سب سے پہلے
اپنے معزز مہمان کے فائدے کی سوچتا ہوں۔ مہمان خوش ہو جائے تو خادم کا انعام کہیں
نہیں گیا۔“ وہ اپنا جملہ کہہ کر میرا منہ تنکے لگا۔ آدمی گھاگ تھا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سن رہا

ہوٹل سے نکل کر کھلی ہوا میں آنا ہو گا جس کے لئے منصوبہ بندی ضروری تھی اور وہ میں نے کر لی تھی۔

میں نے کمرے کی صفائی کرنے والی ایک بری بی بی کو آنکھیں چلاتے نئے سامان پر لپٹائی نظریں ڈالتے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ گلڈان رکھنے آئی تھی اور مسکرا کر مجھ سے انگریزی میں کہہ گئی تھی کہ اس کا نام مورا مونگ ہے۔ وہ دن کی ڈیوٹی پر ہے۔ شام میں فری ہے اگر سر کو یعنی مجھے شام میں باہر نہیں جانا ہوٹل میں بیٹھ کر ٹیلی ویژن سے دل بہلاتا ہے تو وہ سر کو ڈسٹرب نہیں کرے گی۔ دوسری صورت میں وہ ایک بار شام کو ضرور آئے گی۔ گلڈان کے پھول بدلے۔

یہ چالاکی کی باتیں تھیں۔ پانچ ستارے والے ہوٹلوں میں اس طرح کی کھلی دعوت عیش کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہاں کیوں کہ ہر کام سلیقے سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس بد سلیقہ عورت مورا مونگ کی نوکری مجھے فوری طور پر خطرے میں نظر آرہی تھی اگر کسی مسافر نے شکایت کر دی۔ انتظامیہ کے کسی بندے نے دیکھ لیا تو یہ مونگ بی بی لگی۔

بہر حال میں نے اس کے انگریزی پیغام کے جواب میں کہا تھا کہ بی بی! میں بہت مصروف آدمی ہوں معلوم نہیں شام کو کہیں باہر جاؤں گایا کمرے میں ہی رہوں گا۔ اس نے کہا تھا۔ ”اگر آپ انٹرکام پر تیرہ نمبر ڈائل کریں گے تو میں ہی فون اٹھاؤں گی۔ ازراہ کرم بتا دیجئے گا کہ آپ باہر جارہے ہیں یا نہیں جارہے۔“ مورا مونگ نے یہ بات مسکرا کر کہی تھی۔

اب مدن بسولا کے جاتے ہی میں نے انٹرکام پر تیرہ نمبر ڈائل کیا اور فون واقعی اس نے اٹھایا چپکٹی آواز میں بولی۔ ”لکی نمبر تیرہ۔۔۔ شعبہ آرکائش۔ فرمائیے؟“ میں نے کہا۔ ”بی بی! میں سوئٹ سیون اے سے بول رہا ہوں۔ مجھے فوری طور پر جانا پڑ رہا ہے اس لئے اب آپ اگر گلڈان وغیرہ سیٹ کر سکتی ہیں۔“ اسی طرح چپک کر بولی۔ ”شکریہ سر! سمجھے میں چل پڑی۔“ ڈیڑھ دو منٹ میں وہ کمرے کا دروازہ بجا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”کھلا ہے آجاؤ۔“ اس نے اندر آکر دروازہ بند کیا اور بولی۔ ”لیجئے میں آگئی۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تمہاری جیسی یونیفارم چاہئے۔“

ہیں۔ حکومتیں بہت خرچا کر رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ میرا تو پاسپورٹ اور ٹکٹوں کا چھوٹا سا کام ہے۔ اس کا جاسوسی یا کاؤنٹر انٹیلی جنس سے کیا واسطہ؟“ وہ آنکھیں چمکا کر بولا۔ ”جاسوس لوگوں کے جانے آنے کے لئے کبھی پاسپورٹ اور ٹکٹ بھی درکار ہوتے ہیں۔“ میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ میری نظروں میں کوئی بات مدن بسولا نے ایسی دیکھی ہو گی جس سے اسے کھیل خراب ہو تا نظر آیا۔ جلدی سے بولا ”گستاخی معاف۔ میرا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ آپ کنور صاحب! جاسوسی کرنے آئے تھے اور اب لکھنا چاہتے ہو۔ نانا۔ سرکار! ایسی بات تو میں سننے میں بھی نہیں سوچ سکتا۔“

میں نے سوچا اسے تھوڑا سا رگڑا دینا پڑے گا۔ تاکہ یہ میرے کام کا ہو جائے۔ اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”مدن بسولا! تم میرے بارے میں جیسا چاہو سوچتے رہو مجھے پروا نہیں۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ تمہیں اور مجھے بے مقصد چیزوں کے بارے میں نہیں با مقصد اور ٹھوس چیزوں مثلاً کیش، نقدی، روکڑے کے بارے میں زیادہ سوچنا چاہئے ورنہ جس کے پاس کیش ہوتا ہے وہ اپنی مرضی کا سوچنے والا پیدا کر سکتا ہے۔ یہ سمجھو۔“ میں نے یہ بات بے مروتی سے کہی تھی اور ہاتھ میں پکڑی پیالی آواز کے ساتھ طشتری میں رکھی تھی۔

فیجیر نے دانت نکال دیئے۔ پوچھنے لگا۔ ”اور چائے بناؤں سرکار کے لئے؟“ میں نے انکار میں سر ہلا دیا اور اسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ”سر! آپ مجھے اور میں آپ کو سینٹ پر سینٹ سمجھ گئے ہیں۔ مجھے ابھی آدھے گھنٹے کا ٹائم دیجئے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور چائے اور ٹرائی کھینچتا ہوا کوریڈور میں لے گیا جہاں اس نے ٹرائی چھوڑ دی اور تعظیماً میری طرف جھک کر ادب سے دروازہ بند کر دیا۔ حرام زادہ واقعی بہت ہشیار تھا۔ جتنی دیر مجھے مدن کا انتظار رہا اتنا وقت میں نے اور طرح کی تیاریوں میں صرف

کیا۔

اگر مدن تسلی بخش جواب نہیں لاتا کوئی بد خبری سناتا یا دغا کرتا ہے۔ تو مجھے ٹھاکر صاحب اور میری دھرم پتی بہوجی صاحب کو اس خطرناک جگہ سے یعنی کوئی نینل

میں نے پوچھا۔ ”سائز چیک؟ دو مردانہ ایک زنانہ؟“
 بولی۔ ”دو مردانہ ایک زنانہ سائز چیک۔“
 میں نے کہا۔ ”وہ رکھے ہیں تیرے ڈھائی ہزار۔“ میری نظر کلائی کی گھڑی پر
 تھی۔

اس نے بھی گھڑی دیکھی اور میز پر پڑے نوٹ اٹھا کر تیر کی طرح نکل گئی۔
 میں نے یونیفارم سنبھال لیے۔ آدھے گھنٹے کے بجائے پونے گھنٹے میں مدن
 بولانے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کہا۔ ”آجاؤ۔“

وہ جس طرح کمرے میں گھسا اسی سے میں سمجھ گیا کہ کوئی اچھی خبر نہیں لایا
 ہے۔ بے تعلقی سے مجھے باہر کی طرف دیکھتے پاکر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ بولا۔
 ”جناب والا! غلط بات کیوں کہوں۔ خادم کو سینٹ پر سینٹ کامیابی تو نہیں ہوئی ہے۔ ہاں
 اب سے دو گھنٹے بعد میرا آدمی وزیر سے بات کرے گا۔“

”کیسی بات؟“

”پاسپورٹ کی۔“

”اور ائر ٹکٹ؟“

”وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے تین کمپنیوں سے پوچھا تھا۔ دو نے امید دلا
 دی ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا معلوم کروان دو کمپنیوں میں سے کون سی کمپنی تین بندوں کو
 لارگوے میں اسمگل کر کے برما سے باہر لے جاسکتی ہے؟“

بسولا ہنسا۔ ”یقیناً جناب والا نے یہ بات مذاق میں کہی ہوگی۔“

میں نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ”یقیناً آپ جناب والا گھاس کھا کر آرہے ہیں یا
 آپ نے شراب پی ہے۔“

فیجر نے احتجاج کیا۔ ”سر ائر کمپنیاں ائر کمپنیاں ہوتی ہیں۔ کوئی موٹر بس یا
 ہائیویٹ فیری نہیں ہوتیں۔ جہاز کے کارگو بے میں تین۔۔۔۔؟ ایک نہیں تین آدمی
 کیے اسمگل ہو سکتے ہیں؟“

میں بولا۔ ”تو پھر اس گدھے وزیر کے کمرے میں یہ لے کے گھس جاؤ۔“ میں
 نے تین لاکھ کے نوٹ پہلے سے گن رکھے تھے۔ وہ مدن بسولا کی طرف پھینکے۔ ”تین لاکھ
 ٹکٹ یہ دس پر سینٹ ایڈوانس ہے۔ وزیر سے کہو تین پاسپورٹ بنا کے ہاتھ کے ہاتھ

اس نے اپنی یونیفارم اتارنی شروع کر دی۔
 میں نے ہزبڑا کر کہا۔ ”اے اے۔ ایک منٹ۔ میری بات سنو پہلے جو میں کہہ
 رہا ہوں غور سے سنو۔“ وہ رک گئی۔
 میں نے کہا۔ ”گلدان سجانے کی فیس تمہارے خیال میں کتنی ہونی چاہئے؟“

بولی۔ ”ہزار۔“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں پانچ سو۔“

اس نے مطمئن ہو کر دوبارہ اپنی ہوٹل یونیفارم کی بیلٹ ڈھیلی کرنی شروع
 کر دی۔

میں نے کہا۔ ”رک رو۔ بالکل غلط سمجھی ہو تم۔ سنو۔ میں تمہارے اس ہوٹل
 کے کاروباری حریف کا نمائندہ ہوں۔ مجھے تین سائز میں یہاں کے یونیفارم درکار ہیں۔
 ایک یونیفارم کے پانچ سو دوں گا۔ یعنی تین کے ڈیڑھ ہزار اور تمہیں پانچ سو ٹپ الگ
 سے۔ بولو کیا کہتی ہو؟ دو ہزار یہاں سامنے میز پر رکھے ہوں گے اگر بیس منٹ میں تین
 یونیفارم نئے لے آؤ گی تو وہ دو ہزار تمہارے ہو جائیں گے۔“
 ہنس کے بولی۔ ”میں غلط سمجھی تھی مگر تم صحیح کسٹر ہو۔ سودا ہو سکتا ہے۔ تین
 ہزار لوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”ڈھائی۔“

بولی۔ ”منظور۔ تم یونیفارمز کا کیا کرو گے؟“

میں نے کہا۔ ”اس سوال کا جواب چاہئے تو پھر تمہیں ڈیڑھ ہزار دوں گا۔“

”نہیں چاہیے۔ جواب کی ایسی تیس ڈھائی ہزار منظور؟“

میں نے شعبہ آرائش کی اس چالاک فتنہ کار بی بی کو پہلے اپنا اور مداری کا سائز
 بتایا۔ کوسومی کی زنانہ یونیفارم کا سائز سن کر بولی۔ کہ اتنے چھوٹے سائز کی یونیفارم ملنا
 مشکل ہے۔ میں نے کہا کہ چھوٹی سے چھوٹی جو بھی ملے لے آنا۔ اب تمہارے پاس اٹھارہ
 منٹ رہ گئے ہیں دو منٹ تم بحث کرنے میں ضائع کر چکی ہو۔

دروازہ کھول کر چھلاوے کی طرح وہ غائب ہو گئی۔

اس کو گئے بیس منٹ اور کچھ ہی سیکنڈ ہوئے تھے اور میری بے چینی بڑھتی جا
 رہی تھی کہ اس نے دستک دیئے بغیر دروازہ کھولا اور گھس آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک
 بنڈل تھا۔

دے دے۔ تیس لاکھ ملیں گے۔“
 بسولانے نوٹ سمیٹ کر سامنے میز پر رکھ دیے۔ اس کی پیشانی کی لکیریں
 گہری ہو گئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ آہستہ سے بولا۔ ”اس میں شک
 نہیں سر! رقم بڑی ہے۔ وزیر تک کو ہلا دے گی۔“
 میں نے کہا۔ ”تو پھر جاؤ“

بولا۔ ”باقی کے ستائیس لاکھ وغیرہ؟ ظاہر ہے اس وقت کیش میں تو نہیں ہوں
 گے۔“

میں نے کہا۔ ”ظاہر ہے۔“
 نیجر نے جو ”وغیرہ“ کہا تھا اس میں اس نے اپنا کمیشن، انرٹکٹ کے پیسے بھی
 شامل کیے ہوں گے۔

میری ”ظاہر ہے“ سن کر اس نے سر کھجایا۔ جیسے خود سے سوال کیا جاتا ہے۔
 اس طرح کہنے لگا۔ ”آپ کے پاس اس رقم کے ٹریولرز چیکس نہیں ہو سکتے کہ اگر ہوتے
 تو اب تک مجھے معلوم ہو چکا ہوتا۔ سر! قصور یہ ہے کہ کرنسی مارکیٹ میں اس خادم کا
 چھوٹا سائٹریٹ ہے۔ مانو حصے داری ہے ایک آنے بھر کی۔“
 میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تم ٹھیک سمجھے ہو، باقی
 رقمیں سفری چیک کی شکل میں نہیں ہیں۔“

وہ ہنسا کہنے لگا۔ ”سر! میں بھی کیسا گھماڑ ہوں۔ راجے مہاراجے کا غذام ہی
 لے کے چلتے ہیں۔ سرکار کے پاس ظاہر ہے ہیرے ہوں گے۔“

”درست۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے ایک لفظ لکھا۔
 ”ہیروں میں تو کم از کم چار چھ گھنٹے خرچ ہو جائیں گے۔“
 وہ فکر مندی سے بڑبڑانے لگا۔ ”میں جو ہیروں کو لاؤں گا۔ وہ دیکھیں گے
 پرکھیں گے، بھاؤ دیں گے۔“

ہماری بات چیت اب خطرناک علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ مدن بسولاب
 قطعی طور پر یہ جان لینا چاہتا تھا کہ میں آخر کون ہوں۔ جاسوسوں وغیرہ کے ہاتھوں میں
 اتنی بڑی رقمیں نہیں ہوتیں۔ اس لئے میں کسی ملک کا جاسوس تو ہو نہیں سکتا۔ بسولاب
 پہلے شک سا ہوگا، اب ہیروں کا سن کر اسے یقین ہو گیا کہ میں واقعی بڑے جاگیرداروں

میں سے کوئی ہوں۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا ہوگا کہ رشتے داروں کی سازش والی بات میں کوئی
 دم نہیں ہے۔ میں حکومت کے کسی شعبے سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔ یا تو انکم ٹیکس کا کالے
 دھن کا کوئی بھگڑا ہے یا پھر میں نے ایک دو آدمی ٹھنڈے کر دیے ہیں اور اپنے بابے اور
 بی بی کے ساتھ بری قانون کے چنگل سے نکل جانا چاہتا ہوں۔

پاسپورٹ کے کام میں بے شک نیجر کے لئے اچھا کمیشن ہوگا مگر ہیروں کی کیا
 بات ہے۔ جو ہیروں کے ہاتھ آدھے کروڑ کے بھی ہیرے بیچے گئے تو بسولا کا انڈر انڈر
 کٹ تک پہنچ سکتا ہے۔

میں نے دیکھا اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنے خیال
 کی آنکھ سے لاکھوں کی گڈیاں اپنی جیبوں میں جاتی دیکھ لی تھیں۔

میں نے اسے اور لرزادیا۔ کہا۔ ”مدن! نہ میرے پاس فالتو چار چھ گھنٹے ہیں۔
 نہ جو ہیروں سے جھک جھک کرنے کا دماغ ہے۔ تم کوئی ایک آدمی پکڑ کر لاؤ وہ بریف کیس
 بھر کر آئے اور جیبوں میں کنکر ڈال کر چلا جائے۔ ایک گھنٹے میں یہ کام ہو سکتا ہے۔ آدھا
 لاکھ کم یا پورا لاکھ زیادہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

نیجر نے بہت مشکل سے تھوک نگلا۔ پچیس، پچاس ہزار کا ذکر میں اس طرح کر
 رہا تھا جیسے لوگ ریزگاری کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگا۔ ”ٹھیک ہے سر! میں یہ ایڈوانس
 دے کر وزیر کو قابو کر کے جوہری کے پاس جاتا ہوں۔ جتنی دیر میں پاسپورٹ بنیں گے
 جوہری آپ کے پاس آئے گا۔ ذیل کر کے پیسے دے کے چلا جائے گا۔ میں وزیر کے
 ستائیس لے جا کر اس کے حوالے کروں گا اور پاسپورٹ لے آؤں گا۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ
 میرے ٹیلی فون پر یہیں آجائیں گے۔ تو ٹھیک ہے سر! تھینک یو سر! بانی سر! بانی سر!“
 ہکلاتا ہوا نیجر دفعتاً ہوا تو میں نے فون کر کے مداری اور اس کی پوتی کو اپنے
 کمرے میں بلا لیا۔ زندگی میں شاید پہلی بار کو سوس کو پسند کے کپڑے پہننے کو ملے تھے۔ وہ کئی
 گھنٹے آرام کر کے آئی تھی۔ اسے پیٹ بھر غذا ملنی شروع ہو گئی تھی۔ یہ محض میرا خیال تھا
 بلمداری کی پوتی واقعی کچھ بڑی بڑی لگ رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر آسائش
 کی چمک تھی اور وہ کمرے میں مسکراتی ہوئی داخل ہوئی تھی۔

تو کیا اس کا چہرہ ہی ایسا تھا۔ مسکراتا ہوا؟ مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں نے کا کسیر
 بازار میں جب پہلی بار اسے اپنے گیٹ ہاؤس کے بچھواڑے جھونپڑی میں دیکھا تھا تو وہ
 لڑکی مجھے بسورتے چہرے والی لگی تھی۔

مدن بسولا فیجر کا ذہن پر سکون ہوا تو میں نے سوچا اب یہ نہار سنگھ کا معاملہ اٹھانا چاہئے۔

میں نے بسولا سے کہا تو وہ حیران بلکہ فکر مند ہو گیا۔ سوچتا ہو گا۔ اس قدر فضول نکلیا جو رنپ کے گائیڈ کا نام مجھے کیسے معلوم ہو گیا؟ پوچھنے لگا کہ کب اور کس سے میں نے یہ منحوس نام سنا ہے؟ اسے ڈر تھا کہ کہیں نہار سنگھ نے مجھ سے رابطہ تو قائم نہیں کر لیا؟ وہ حرامی، سونے کے انڈے دینے والی اس چڑیا پر مجھ پر کوئی جال نہ ڈال رہا ہوں۔

میں نے بسولا کو بتایا کہ نہار سنگھ بہت سور قسم کا آدمی ہے۔ حالانکہ اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کہا کہ ریاست میں جن لوگوں نے میرے خلاف سازش کی ہے۔ یہ ان کا زر خرید اور مخبر ہے۔ ظاہر ہے مجھے صورت سے پہچانتا ہے۔ میں چاہتا ہوں جب تک میں کوئی نینٹل میں ہوں نہار سنگھ سررا! کہیں اور دفع ہو جائے۔ اپنی منحوس شکل مجھے نہ دکھائے۔ فیجر نے کہا۔ ”سررا! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اب آپ کے فلائی کر جانے کے بعد ہی نہار سنگھ اس ہوٹل میں بلکہ رنگون شہر میں نظر آئے گا۔ میں فوری طور پر اسے گاڑی دے کر ایک دور دراز کے شکار بنگلے کی طرف بھیج رہا ہوں۔“

لیجئے، میں نے سوچا پھر وہی شکار بنگلا۔

خیر، نہار سنگھ سالے سے اتنی آسانی سے چھٹکارا مل گیا تو مجھے اطمینان ہوا۔ وزیر کی طرف پرواز کرنے سے پہلے مدن بسولا بھاگا بھاگا آیا اور مجھے خبر دی کہ اس مشہور سور کو گاڑی میں بیٹھا کر دفع کر دیا گیا ہے۔ سرکار بے فکر رہیں۔

شام سے پہلے بسولا ایک جوہری اور اس کے اسٹنٹ کو لے کر آگیا۔ میں اس خطرناک مرحلے کے لئے خود کو پہلے سے تیار کر چکا تھا۔

میں نے سوچا دیسی ریاستوں کی گوری بدیسی رانیاں دور تو نہیں جائیں گی اپنا زیور، جواہر یہیں اپنی ریاستوں، جاگیروں کے قریب ہی میں ریپٹر پالش کرائیں گی۔ گڑھی کی سفید فام مہارانی کو، اس کے بریسلٹ اور ہار کو رنگون کے صرافے والوں نے تو ضرور ہی دیکھا ہو گا۔ ہو سکتا ہے یہ جو دو آدمی آئے ہیں ان میں سے ایک، جسے اسٹنٹ بتایا جا رہا ہے۔ ہیروں کا ماہر پارکھ ہو۔ ممکن ہے دونوں ہی ماہر ہوں۔ یہ رنگون شہر کے ہیں۔ گڑھی کی جوہی رانی کا زیور اس کا ایک ایک پتھر ہو سکتا ہے۔ انہیں زبانی یاد ہو۔ ان دو ماہروں کی چار آنکھیں اب شکار بنگلے والی رانی جوہی تاہر سین کے بریسلٹ اور ہار پر پڑیں گی

میں نے کوئی نینٹل ہوٹل کی ملازموں کی زمانہ وردی کو سوسمی کو دی۔ اسے سمجھایا کہ یہ کس طرح پہنی جاتی ہے، بال کس طرح ٹوپی میں چھپائے جاتے ہیں اور ہلر کیسے باندھی جاتی ہے۔

یہ سب زبانی سمجھا کر میں نے اسے کمرے کے غسل خانے میں بھیج دیا کہ وہ اب جائے اور وردی پہن کر دکھائے۔ ادھر بڑے میاں کو بھی میں نے وردی کے ریزر سمجھائے۔

پوتی وردی پہن کر آئی تو دیکھا کہ اس نے نوے بلکہ پچانوے فی صد درست پہنی تھی جو کسر رہ گئی تھی اپنے سامنے پوری کرائی۔ اسے سمجھا دیا کہ وردی لے جاؤ اپنے پاس چھپا کے رکھو، ہوٹل کے اسٹاف میں سے کوئی نہ دیکھ لے۔ جب ضرورت ہوگی تمہارا دادا تمہیں بتا دے گا۔ تو پھر خیال کر کے ٹھیک ٹھیک پہن لینا۔ ہم دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ وردی شاید جان بچا سکتی ہے۔

مداری سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے بھی سیکھنے کی باتیں جلد سیکھ لیں۔ مگر وہ لڑکی کو اپنے کمرے میں بھیجنے کے بعد پوچھنے لگا کہ کیا کوئی خطرہ ہے؟ میں نے کہا۔ ”معلوم نہیں۔ ویسے تو ہم اپنے دشمنوں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ خطرہ کسی بھی وقت کہیں بھی سامنے آسکتا ہے اور ہو سکتا ہے نہ بھی آئے۔“

آدھے گھنٹے بعد ہی فیجر دوڑا دوڑا آیا۔ وہ خوشی سے جیسے پھٹا پڑتا تھا۔ ہم دستخط کرانے کے لئے وہ پاسپورٹ فارم لایا تھا۔ وزیر صاحب نے بہت خوشی سے پاسپورٹ تیار کرنا منظور کر لیا تھا بلکہ اس نے بسولا کو تاکید کی تھی کہ وقت ضائع نہ کر فوراً جائے ضرورت ہو تو جھنڈے اور سائرن والی گاڑی لے لے۔

فارم پر میں نے مداری کا اس کی پوتی کا اصل نام لکھا جو بہت لمبا اور مشکل تھا احتیاطاً میں نے ان ناموں میں مہارانا اور رانی بڑھوا دیا۔ مداری کا نام سن کر مجھے اپنا نام اچھا کرنا آسان سا ہو گیا۔ پہلی بار ہی ایک نام رانائیش پال چھترپال مہاویر جگن مہاویر میر۔ ذہن میں آیا جو مجھے بہت شان دار لگا۔ میں نے یہی لکھ دیا۔ دستخط کر دیے۔ مداری اور اس کی پوتی نے بھی دستخط کئے۔

ہر کام بہت تیزی سے ہو رہا تھا اور ہم لوگوں کے حق میں ہو رہا تھا۔ مجھے ایک بات کی پریشانی تھی وہ یہ کہ نہار سنگھ گائیڈ میرے آس پاس ہی موجود ہے۔ کہیں نہ پہچان میں نہ آجاؤں۔

پر آبیٹھا۔ گویا جوہریوں کی موجودگی سے اب مجھے اکتاہٹ ہو رہی تھی۔
تینوں آدمیوں نے باادب سرگوشی میں کچھ مشورہ کیا پھر جوہری سیٹھ نے
میری طرف گھوم کر اپنے ہاتھ باندھ دیے۔ بولا۔ ”میرے کو بولنے کا آدیش ہے؟“
”میں نے کہا۔ ہاں ہاں کہو۔“

اس نے سیاہ نخل پر پڑے دونوں زیوروں کی طرف اپنے سر سے اشارہ کیا اور
کہا۔ ”سرکار! میں نے دیکھ لیا، پر کھ لیا۔“
”اچھا۔“

پھر وہ دھیرے سے احترام کے لہجے میں بتانے لگا کہ سب کی اتنی رقم بنتی ہے۔
میں نے بیزاری اور نفرت کا ملا جلا تاثر دیتے ہوئے بسولا کی طرف دیکھا۔ گویا
کہہ رہا ہوں کہ یہ لوگ کس قدر کینے ہیں۔

بسولا نے ہاتھ جھٹک کر جوہری کے چہرے کے سامنے بے چینی کا اشارہ کیا۔
جوہری کھسیا کر اپنے ماہر کی طرف دیکھنے لگا۔ ماہر نے سر کو آگے جھکاتے ہوئے آنکھیں
بند کر کے جیسے اطاعت کرنے، ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا۔ جوہری سیٹھ نے میری طرف
مصنوعی بے بسی سے دیکھا اور پہلے بتائی ہوئی رقم بڑھا کر ایک دم سوائی کر دی۔

میں نے بیزاری اور نفرت کے ایک خاموش اشارے سے اتنی رقم بڑھوائی تھی
جو پاسپورٹوں اور ٹکٹوں پر خرچ ہونے والی کل رقم کے تقریباً برابر تھی۔
میں نے جوہری کی طرف دیکھ کر ہاں میں سر ہلایا۔ بسولا نے اطمینان کا سانس
لیا۔ ہیروں کا سودا ہو گیا تھا۔

بعد کی تفصیلات سے مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ دونوں جوہری ایک ایک بریف
کیس لائے تھے۔ وہ ایک طرف بیٹھے اس بریف کیس کے نوٹ اس بریف کیس میں منتقل
کرتے رہے۔ منیجر جو ظاہر ہے پہلے سے طے کر کے آیا ہوگا، جوہریوں سے کوئی فارم، لیٹر
ہیڈلے کر گیا اور کاغذات پر وہ رقم ٹائپ کر لایا جو طے ہوئی تھی۔ جوہریوں نے بریف
کیس میری طرف بڑھایا۔ میں نے مدد بسولا کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے مستعدی سے
ہزار ہزار والے ان بے شمار نوٹوں کو شمار کیا پھر مجھ سے کہا کہ۔ ”سر! رقم صحیح ہے۔“

میں نے نخل کا ٹکڑا میز پر ایک بالشت آگے سر کا دیا۔ اور کاغذوں پر دستخط کر
دیے۔ جوہری نے بھی دستخط کیے اور نخل کا ٹکڑا محبت سے اٹھا کر اپنے بریف کیس میں
رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اگر ایک بار بھی ان دونوں میں سے کسی نے یہ زیور دیکھے ہوں گے تو غضب ہو جائے گا۔
پس پڑ جائے گی۔ دونوں شور مچادیں گے کہ دوڑو گڑھی کے مہاراجگان کا خزانہ کوئی نکال
لے جا رہا ہے۔ مگر اس خطرے کا سامنا تو کرنا ہوگا۔ تخت ہو گیا پھر تختہ۔
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہیرے پہچان میں آجائیں اور انے پونے خریدنے کی
لاچ میں یہ دونوں جوہری دم سادھے بیٹھے رہیں۔ انمول رتن کوڑیوں کے مول خریدنے
کی کوشش کریں۔

اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو بھی دام لگیں گے انکار نہیں کروں گا۔
ہیرے دے دوں گا۔ ایسے جواہر کوڑیوں کے مول آتے دیکھ کر ہر کوئی چپ رہ سکتا ہے۔
ہاں، انہیں ہاتھ سے جاتے دیکھ کر چپ رہنا ممکن نہیں تھا۔ ایسا شور مچائیں گے یہ دونوں
کہ گڑھی کا موٹا مہاراجا بھی اپنے گوشہ تنہائی سے نکل کر بھاگا بھاگا آجائے گا۔

زیورات یا جوہریوں پر غیر ضروری توجہ دیے بغیر میں نے سیاہ نخل کے
ٹکڑے میں لیٹے جواہر جڑے دونوں زیور بسولا اور جوہریوں کے سامنے میز پر رکھ دیے۔
نخل کا یہ ٹکڑا میں سوچ سمجھ کر بازار سے لایا تھا۔ اس خزانے کے پاس سے میں ہٹ آیا اور
بے تعلقی سے اخبار دیکھنے لگا۔

بسولا نے دروازہ بند کر دیا تھا اور کمرے کی سب بتیاں جلا دی تھیں۔
بریسٹلٹ اور ہار دیکھ کر جوہریوں نے ہودووں یا ہاآںںں جیسی ہلکی آواز پید
کی تھی جس سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا اگر وہ دیکھ کر ان جواہر کو پہچان گئے تھے تو
کی اس آواز میں ایسا کوئی اشارہ نہیں تھا۔ ممکن ہے یہ پسندیدگی کی آواز ہو۔

میں نے پورے بیس منٹ تک کوئی توجہ نہ دی پھر میں جمائی لیتا میز کے پار
آبیٹھا اور یہ ظاہر کرنے لگا کہ اب مجھے ان کا کام دلچسپ لگ رہا ہے۔ وہ چڑے کے چھو۔
صندوق میں لائے ہوئے ایک آلے سے کئی طرح کے آتشیشوں کی مدد سے زیور
میں جڑا ایک ایک دانہ چپک کرتے رہے۔ اسٹنٹ یا اصل ماہر وہ جو بھی تھا۔ آہستہ
بڑبڑا کر جوہری سیٹھ سے کچھ کہتا اور وہ اپنی اشاروں کی زبان میں لکھ لیتا۔

آدھے گھنٹے کی چھان بین کے بعد ایک ساتھ انہوں نے منیجر مدد بسولا
طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا یعنی جواہر اس قابل ہیں کہ ان پر بات ہو سکتی ہے۔ ہر
کھل اٹھا مجھ سے بولا۔ ”سر! آپ کچھ فرمائیے۔“
میں نے تقریباً درشتی سے کہا۔ ”نہیں۔“ اور میز سے ہٹ کر پھر اپنے صو۔

راستے بھر وہ مجھ سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ کبھی گنگنا تا رہا۔
میں نے پوچھا۔ ”بہت خوش ہو مدن! کیا بات ہے؟“
بولا۔ ”سر! آپ بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم سرکار
اک مدن کیوں خوش ہے؟“

میں نے ویسے ہی کہہ دیا۔ ”نہیں تو مجھے کیا خبر۔“
بولا۔ ”آپ نے مجھے لکھ پتی کر دیا۔ ہم خادموں کے لئے یہی بہت بڑی بات
ہے دوسری بات یہ کہ سر! میری محبوبہ آخر کار مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی ہے۔
باتی ہی نہیں تھی۔ ٹال رہی تھی دو برس سے۔“

بولا۔ ”کہتی تھی تیرے پاس فیملی کو سپورٹ کرنے کا پیسا نہیں ہے۔“
میں ہنسا تو وہ جوش کے ساتھ کہنے لگا۔ ”سر! آپ نے میری لائف بنادی۔
جندہ باد۔“

گاڑی کو نئی نینٹل کے پورچ کی طرف بڑھی ایک ساتھ میری اور مدن کی نظر
پڑی۔ ہوٹل کی ویسی ہی ایک گاڑی ہم سے پہلے پورچ میں رکی کھڑی تھی۔ ہمیں آتے
دیکھ کر ڈرائیور کے برابر والی سیٹ سے کوئی اترنے والا تھا اور اترتے اترتے اس نے بڑی
خوشامد بڑی لچڑہاؤ سے مدن بولا کو آواز دی تھی۔ ”سر! یو لاسر!“ فیجر نے سر گھما کر
اسے دیکھا اور گالی دی۔

اس نے خوشامد میں پھر آواز لگائی۔ فیجر صاحب! سر! آدھے رستے سے واپس
آنا پڑا۔ ڈرائیور میرا بی۔ مار۔“

میں نے دیکھا یہ اترنے والا۔ فیجر کو خوشامد بھری آواز میں بیماری کی خبر دینے
والا نہار سنگھ تھا۔

نہار سنگھ! او خدا! وہ گاڑی سے اسی طرح اتر رہا تھا جیسے شکار بنگلے میں اس رات
بستر سے اتر رہا تھا۔ جیتے کی طرح اچھل کر۔

لاحول ولا قوتہ۔ یہ سر! بد معاش اس وقت کہاں سے آن مرا۔ میں نے
سر جھکا کر چہرہ چھپا کر ایک طرف نکل جانا چاہا مگر نہار سنگھ نے مجھے دیکھ لیا تھا اور پہچان لیا
تھا۔

اس نے آواز لگائی۔ ”ارے! تم! سال! میں گاڑی سے اتر کر ہوٹل کے لاؤنج
کی طرف چھپتا۔“

چہرے سے یہی پتا چل رہا تھا کہ جوہری نے بہت اچھا سودا کیا ہے۔
وہ دونوں جھکتے ہاتھ جوڑتے نمش کار، نمش کار کرتے سوئٹ نمبر سیون اس
سے نکل گئے۔

میں نے رخصت ہوتے بولا کو آنکھ کا اشارہ دیا کہ وہ انہیں دفع کر کے میرے
پاس آئے۔ بولا نے خوش ہو کر ہاتھ جوڑ دیے۔ اسے معلوم تھا میں نے اسے انعام
دینے کے لئے بلایا ہے۔

بولا کو میں نے ایک لاکھ کی رقم عطا کی۔ مجھے یقین تھا وہ اس سے دگنی رقم
انڈر کٹ میں ہتھیا چکا ہو گا۔ میری بلا سے۔

میں نے مدن بولا کو ستائیس لاکھ کی رقم دے کر بری وزیر کی طرف بھیج دیا
پونے گھنٹے میں وہ ہمارے خوبصورت پاسپورٹ لے آیا۔

رات ہو گئی تھی۔ میں نے بولا سے کہا آؤ میرا بریف کیس صبح تک کے لئے
ہوٹل کے لاکر میں رکھو ادو۔ میں اتنی بڑی رقم کمرے میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ ہوٹل
لاکر ہندسوں سے کھلتا بند ہوتا تھا۔ ایک گنتی گاگہ سوچتا تھا جو ہوٹل والوں کے علم پر
نہیں ہوتی تھی دوسری گنتی اسی وقت ہوٹل والے طے کر کے اپنے پاس لکھ لیتے تھے؛
گاگہ کو نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ گاگہ اور فیجر دونوں ایک دوسرے کے پابند تھے۔ لاکر
اس وقت تک کھل ہی نہیں سکتا تھا جب تک دونوں پارٹیاں تالوں میں اپنے اپنے ہندسوں
کی کارروائی نہ کریں۔

یہ رات میں نے دنوں بعد بڑے آئند میں گزاری۔
رات ہی میں کسی وقت ہمارے ہوٹل ٹکٹ آگئے۔ میں نے بولا کو سویر
پونے نو بجے کا پابند کیا تھا۔ ہمیں کرنسی مارکیٹ جاکر بھاری رقموں کے سفری چک
بنوانے تھے۔ اس میں فیجر بولا کا قانونی کمیشن تھا۔ روپے میں ایک آنے کا سا جھگڑا
تھا۔

صبح سویرے ہی میں نے کو سووی کو جا اٹھایا۔ ویسے اسے کیا تیاری کرنی تھی
پھر بھی بتانا ضروری تھا کہ پاسپورٹ، ٹکٹ آگئے ہیں اور آج ہم برما سے نکل رہے ہیں۔
میں نے ہوٹل کے لاکر سے بریف کیس نکالا اور بولا کے ساتھ ٹریولرز چکا
بنوانے چل پڑا۔

مدن بولا بہت خوش تھا۔ ہوٹل کی گاڑی لایا تھا۔ اور خود ڈرائیو کر رہا

بھی وقت نہیں ہے۔ دوسرا سامان میرے لئے بے کار ہو گیا تھا اس لئے کہ کمرے میں پڑا تھا۔ کسی طرح ان دونوں دادا پوتی کو اس لینڈنگ سے ہٹا دیا جائے۔ میں نے بڑھ کر مداری بڑے میاں کا ہاتھ تھاما اور کوسوی کو پیچھے آنے کا کہتے ہوئے لفٹ کو پیچھے چھوڑتا اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ اب تک تو لفٹ کے نظام پر ہمیں گھبرانے والوں کا بھہہ ہو چکا ہوگا۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے پکڑا جانا یقینی تھا۔ کچھ وقت حاصل کرنے کی بس یہی صورت تھی کہ ہم فی الحال اوپر کی منزلوں پر چڑھ جائیں۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ کم سے کم بڑے میاں اور کوسوی اوپر جا کر ہوٹل کی وردی تو پہن سکتے تھے۔ میں وردی کے بغیر ہی کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔

اوپر کی منزل پر ہوٹل والوں کا ”چادر اسٹور“ کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اسٹور میں داخل ہوا تو دیکھا شعبہ آرائش کی وہی عورت موراموگ جس سے میں نے دریاں خریدی تھیں۔ اسٹور میں کچھ اٹھا دھری کر رہی تھی۔ مجھے داخل ہوتے دیکھ کر پہلے وہ بھی میں اس کے ساتھ کھلوڑ کرنے اسٹور میں گھس رہا ہوں۔ تو اس نے بانہیں لہر کر بری زبان میں کچھ ایسا کہا جس کا مطلب نکلتا یہ تھا کہ پہلے کتوں مسافر کے پاس پہنچا تو مسافر پیاسا تھا اب کیوں مسافر بے تاب ہو کے کنویں کی تلاش میں رستے جھانکتا پھرتا ہے؟ یہ کہہ کر اس نے میرے پیچھے دیکھا تو اسے صرف کوسوی نظر آئی ہنس کے بولی۔ ”اس بار بھی غلط سمجھی۔ مسافر اپنا کتوں اپنے ساتھ لایا ہے۔ ٹھیک ہے میں چلی جاتی ہوں“ تم دونوں آجاؤ۔ ”عجب عورت تھی۔ ایک بات کے سوا اس کے دماغ میں کوئی اور بات جگہ نہیں کر پار ہی تھی۔

میں نے برابر سے گزرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تب وہ کھلکھلا کے ہنسی مگر فوراً ہی اس نے مداری بڑے میاں کو بھی دیکھا اور مسکراتا تک بند کر دیا۔

میں نے کہا۔ ”موراموگ تم یہیں رکو گی ہمارے پیچھے کچھ لوگ لگے ہوئے ہیں۔ تم ہمیں نکلنے کا رستہ بتاؤ گی۔“

وہ بولی۔ ”پہلے یہ کہو کون لوگ تمہارے پیچھے لگے ہیں؟ پولیس؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

”ہوٹل والے؟“

میں اسے نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”نہیں ہوٹل والے نہیں۔“ مگر میں نے سوچ کر جواب دیا تھا شاید میرا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔

نہار سنگھ کی منحوس پکار پھر سنائی دی۔ ”اے! سالار! کو! جاتا کدھر ہے؟“
مدن بسولا اس بد تمیزی پر بہت خفا ہوا اس کی دھاڑ سنائی دی۔ ”نہار سنگھ! تو پاگل ہو گیا ہے؟ کیا بک رہا ہے؟“
میرے پاس شاید ایک منٹ تھا اور اس ایک منٹ کے بعد مدن بسولا کی سلطنت میں ہماری ڈھنڈیا شروع ہو جانی تھی۔

میں لفٹ لے کر سیدھا اپنی لینڈنگ پر پھر مداری کے دروازے پر جا پہنچا۔ دروازہ تختہ چاکر میں نے بنگلہ میں تیز سرگوشی میں کہا۔ ”کوسوی! بابا! میں شیر علی“
کھیل ختم ہو گیا۔ چلو فوراً۔“

پہلی آواز پر کچھ نہیں ہوا۔ میرا دل بڑی دیوانگی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ”کوسوی! کھلو۔ دروازہ کھلو کوسوی! خطرہ ہے! جلدی۔“

اندر سے اس کی ڈری ہوئی آواز سنائی دی۔ ”بابا سو رہا ہے کیا بات ہے؟“
او خدا! کیسے لوگ ہیں۔ یہ سونے کا وقت ہے؟ میں نے بے دھڑک ہو کر چیخ کر بنگلہ میں کہا۔ ”کوسوی۔ دشمن آگئے۔ وردی اٹھاؤ۔ نکل چلو۔“

لمحے بھر بعد اس نے دروازہ کی ہلکی سے جھری سے جھانکا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں وردی کے ہنڈل تھے۔ میں دھکا دیتا ہوا کمرے میں جا گھسا۔ شور سن کر مداری بیدار ہو گیا تھا مگر ابھی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے شانوں پکڑ کر ہلایا۔ کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ ”اٹھو۔ منبر اور پولیس والے آرہے ہیں! دونوں میرے پیچھے پیچھے آؤ۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ آنکھیں پٹپٹائیں۔

مداری کو پیچھے میں دو چار لمحے لگے۔ اس دوران غلطی منزلوں سے بھجنھناٹ اور لوگوں کے پرہیزان ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔

ہم پکڑے گئے۔ میں نے سوچا۔ اب بچنا مشکل ہے۔
مگر میری پٹھان تربیت کا تقاضا تھا کہ مشکل میں راستہ نکالنے کی ترکیب سوچا جائے۔

میں نے تیزی سے چیزوں کی فہرست یاد کرنی شروع کر دی۔ پاسپورٹ! سفری چیک میرے ساتھ ہیں۔ برلیف کیس میں رکھے ہیں۔ نکل بھاگنے کے لئے ہوں اسٹاف کی وردیاں حاصل کی تھیں۔ وہ ان دونوں کی تو یہاں موجود ہیں۔ میری ورد میرے کمرے میں رکھی ہے اس وقت کمرے میں گھسنے کا موقع نہیں بلکہ اب تو جھانکنے

رکے میرے چہرے تک پہنچا دیا تھا اور میرا رخسار سہلانے لگی تھی۔
کیا چیز تھی وہ!

میں نے اس کے منہ پر گرفت سخت کر کے ایک بار جھٹکا سادیا۔ ”سیدھی بیٹھ
نہیں تو کڑی کی طرح گردن توڑ دوں گا۔“
اس نے غوں غوں کی۔ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی۔

میں نے اس سے آہستہ سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“ میں منہ پر سے ہاتھ ہٹا رہا
ہوں مگر سن لے اگر اب کے شور کیا تو مار دوں گا۔ خنجر ہے میرے پاس۔“ اس نے نفی
میں سر ہلایا تو میں نے اپنا ہاتھ ڈھیلا کر دیا۔

آہستہ آہستہ میری گرفت میں پھلتے پھلتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا۔
اس لڑکی سے اور بڑھے سے پیچھا چھڑا۔ میں تجھے اپنے ریٹ روم میں لے جاؤں گی۔
کچھ دیر وہاں چھپا رہنا۔ بعد میں ہوٹل سے نکال دوں گی۔ میرا ذمہ۔“ یہ کہتے ہوئے اس
نے سر گھما کر میری طرف دیکھا تھا اور وہ اسی طرح مسکرائی تھی۔

وہ بہت کچی تھی۔ میں نے اسے نرمی سے گردن سے دبوچ لیا اور خود سے دور
لے کر ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تمہارے ساتھ جو بھی پراہلم ہے وہ تم
ہارے جانے کے بعد دور کر لینا۔ ابھی بس ایک بات سمجھ لو۔ میں تمہارا ناپ نہیں
ہوں۔ اگر ہوتا بھی تو میں اس وقت بھاگ رہا ہوں۔ کوئی پاگل ہی ایسے وقت میں
بد معاشیاں کرنے کی سوچے گا۔“

وہ ہنسی۔ ”اسے بد معاشیاں سمجھتے ہو تم؟ پھر تو تم کھانا بھی نہیں کھاتے ہو گے
وہ بھی بد معاشی ہو گی؟“

میں نے کہا۔ ”سنو۔ یہ وقت علمی گفتگو کا نہیں ہے۔ تمہیں بھی کسی طرح کی
بلدی ہے۔ میں اپنا بتا چکا ہوں اپنی جان اور ہمارا پلان بچانے کے لئے خاموشی سے اسٹور
میں بیٹھی رہو۔“

اب کے وہ نشہ کی ہوئی عورت کی طرح ہاتھ لہرا کے ہنسی۔ ”تمہارا پلان اور
میری جان بس اسی طرح بچ سکتی ہے کہ میرے ساتھ ابھی ریٹ روم میں چلو۔“

اس نے جو کہا تھا وہ کوسوی نے سن اور سمجھ لیا۔ میں نے دیکھا وہ سن کر پشیمان
ہوئی تھی اور کھسیاسی گئی تھی۔ کوسوی کے ہاتھ میں اس وقت ایک نیا ڈسٹر تھا۔ جو اس نے
پنکٹ سے اٹھایا تھا وہ اس سے اپنے جوتے صاف کرنے کو بھجی تھی۔ میں نے اشارے سے

کہنے لگی۔ ”ہوٹل والے ہی ہوں گے۔ تم دوسرے ہوٹل کے ایجنٹ ہو ہماری
دردیاں لے جا رہے ہو۔ نقل کرو گے ان وردیوں کی۔ ہمارے آدمیوں نے تمہارا کھوج
لگالیا۔ اب وہ پکڑنے آ رہے ہیں۔ بولو ٹھیک کہہ رہی ہوں؟“
میں نے لمحے بھر میں سوچ لیا۔ ٹھک ہے اسے یہی سمجھنے دو۔ کیا حرج ہے۔ میں
نے ہاں میں سر ہلایا۔

اس نے بھی مسکرا کر ہاں میں سر ہلایا اور ساتھ ہی ایک دم چیختی ہوئی وہ باہر کی
طرف جھپٹی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ ”ارے یہاں ہیں۔ یہاں ہیں وہ بد معاش۔ ادھر اسٹور
میں۔“

میں نے دروازے سے نکلنے نکلنے اسے دبوچ لیا اور اندر کھینچ کر اسٹور کا دروازہ
فوراً بند کر لیا۔ اگر ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو دور کونے کے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا۔
اس مہمان نے تو سمجھو مجھے دیکھ ہی لیا تھا۔ پھر شاید اپنا وہ دروازہ بند کر لیتا اور انٹر کوم پر
ہوٹل کی انتظامیہ کو بتا دیتا کہ اس طرح تمہارے اسٹور میں کچھ شور ہوا ہے۔

میں مورا موگ کو دروازے کے عین پیچھے فرش پر دبوچ بیٹھا تھا۔ میرا ایک
ہاتھ اس کے منہ پر سختی سے جما ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ کا گھیر اس کی کمر کے گرد تنگ تھا۔
اسے بے بس کیے میں فرش پر ایک گھٹنا ٹکائے دم سادھے بیٹھا تھا۔

ہوٹل کے جس مہمان نے جائزہ لینے کو دروازہ کھولا تھا کچھ دیر تک وہ ادھر
ادھر دیکھتا رہا ہو گا۔ جب کوئی ہنگامہ، ہجان اسے نظر نہ آیا تو اس نے ”ہیلو ہیلو۔ کیا بات
ہے؟ کیا مسئلہ ہے؟“ کہہ کر کوریڈور میں دو تین آوازیں دیں پھر جب کوئی جواب نہ آیا تو
دروازہ بند کر لیا۔ وہ لمحے سے غیر ملکی، شاید امریکن لگ رہا تھا۔ بری زبان نہیں جانتا ہو گا۔
اس لئے سمجھ نہ سکا کہ کہاں کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔

میں ہوٹل کی مورا موگ کو دبوچے بیٹھا رہا۔ اس عرصے میں کوسوی نے رپک
کے پیچھے جا کر نہ صرف خود وردی پہن لی تھی بلکہ اب اپنے دادا کو بھیج دیا تھا۔ لڑکی
ہو شیار تھی۔

بڑے میاں کو وردی پہننے میں دیر لگی۔ شاید اسے پٹی لسنے میں مشکل ہو رہی
تھی۔ اس نے پوتی کو آواز دے لی۔ لڑکی کے ٹھلنے ہی لگا کہ میرے چنگل میں پھنسی ہوئی
عورت میں ایک تبدیلی آگئی ہے۔ اس کے بدن کا تناؤ ختم ہو گیا تھا اور وہ آسائش اور ڈھیلے
پن سے میری گود میں جگہ بناتی جا رہی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے ایک ہاتھ آزاد

یہ تو ہم ہفتہ گزار کر آج ہی کے دن جو سوموار ہے۔ شاہ کے مزار پر مغرب کے وقت
اگر دیکھ جائیں گے۔ اور اگر کسی حادثے کی وجہ سے بے عرصے کے لئے پھڑ گئے تو کوئی
بھی سوموار مغرب کا وقت ہمارے رابطے کا دن اور وقت ہوگا۔

میں نے کہا۔ ”جاؤ خدا حافظ۔ اب ہوٹل سے نکلنے کی کوشش کرو۔“
کوسوی اس خدا حافظ کو آخری اور قطعی الوداع سمجھی۔ وہ روہانسی ہو گئی مگر دادا
نے کہا کہ اول تو ہم ہوٹل سے ایک ساتھ نکلیں گے۔ ورنہ چوبیس گھنٹے بعد تو شیر علی
سے ملاقات ضرور ہوگی۔ تو فکر نہ کرو۔ وہ دونوں ہوٹل کے مستعد ملازموں کی طرح اپنا
وجہ اٹھائے مڑے اور زینہ اتر گئے۔

میں تیزی سے لفٹ کی طرف چلا گیا۔ صبح کے وقت یہاں ہوٹل سے نکلنے
والوں اور ہوٹل میں ملاقات اور کاروبار کے لیے ملنے آنے والوں کی ایک سرگرمی سی
نرور رہتی ہوگی۔ میں۔۔۔ لوگوں سے خاص طور پر بسولا اور نہار سنگھ سے بچتا ہوا اور ان
کے ہاؤس ڈسکیٹ کی نظروں میں آئے بغیر نیچے لابی میں پہنچ گیا تو پھر سمجھو نکل جاؤں گا۔
تیز مگر باوقار انداز میں لفٹ کے بورڈ کے پاس پہنچا اور لفٹ بلانے کے لئے
ٹپن دبا دیا۔ میں نے آتی ہوئی کیرج کی آواز سنی۔ وہ اس منزل پر رکنے والی تھی۔
میں بورڈ سے کچھ دور آرائشی گملوں، آئینوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ لفٹ کے
نلتے دروازے کی طرف میں نے پشت کر لی۔

شکر ہے، مجھے تلاش کرنے والے لفٹ میں نہیں تھے۔ لفٹ چلانے والا بھی
نہیں تھا۔ اس کا ہونا بھی خطرناک تھا۔ اسے انہوں نے خبردار کر دیا ہوگا۔
گوروں کا ایک جوڑا ہانہوں میں ہا نہیں ڈالے مجھ دیسی آدمی کو نظر انداز کرتا
لفٹ سے نکلا اور ایک طرف چلا گیا۔ میں نے خالی لفٹ میں قدم رکھ دیا اور نیچے جانے
کے لئے ٹپن دبا دیا۔

کچھ نہیں ہوا لفٹ کو کسی نے اوپری منزل سے طلب کیا تھا۔ وہ اوپر جا رہی
تھی۔ یہ خطرناک بات تھی۔ میں لفٹ کو نیچے لے جانا چاہتا تھا۔ وہ خود کار نظام کے تحت
اوپر جا رہی تھی۔ خدا معلوم اوپر کون ہو۔ فارکار استہ نیچے تھا۔ مجھے نیچے جانے کی جلدی
تھی۔

میں نے لفٹ روکنے کو اینرجنسی ٹپن دبا دیا۔ سوچا کہ اب میں کیرج کو نیچے لے
جانے کی کوشش کروں گا۔ خود کار نظام کو بے اثر کرنے کی کوئی تو صورت ہوگی۔ شاید

اس سے ڈسٹر مانگا اور اس سے پہلے کہ ہوٹل والی کچھ سمجھ سکتی، اس کا منہ کھول کر ڈسٹر
بیشتر حصہ اندر ٹھونس دیا۔ کچھ دیر اسے دبوچے رکھا پھر کوسوی سے اور کپڑالے کر موگ
کے ڈھاناکس دیا اور خود اس کی کمر کی پٹی اور ٹوائسن سے ہاتھ پیر باندھ کر اسے اسٹور کے
سب سے مضبوط ریک سے باندھ دیا۔

باندھ چکا تو میں نے پیٹھ تھپتھا کر ہوٹل والی کو شاباش دی۔ ”تعاون کا شکریہ“
اس نے بے بسی میں سر جھٹکا اور غوں غوں کی آواز نکالی۔ اب وہ یقیناً مجھے
گالیاں دے رہی ہوگی۔

نیچے کی منزل سے بہت سے شور کی آواز آئی میں سمجھ گیا وہ لوگ میرے
کمرے میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ آواز اور ہوٹل والی مورا موگ کی آواز کو اس منزل کا امریکی
مسافر لمحے بھر میں ملا کر سمجھنے کی کوشش کرے گا اور انتظامیہ سے رابطہ قائم کر لے گا۔ یہ
منزل ایک لمحے بھی ٹھہرنے کے لئے مخدوش ہو چکی ہے۔ میں نے دھلی، استری کی ہوئی
چادریں اٹھالیں اور تلے اوپر رکھ کر بڑے میاں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر جمادیں۔ اب تو
قریب سے دیکھنے پر بھی وہ دونوں ہوٹل کے صفائی کے عملے کے رکن لگ رہے تھے۔
پھر میں نے ایک مضبوط سا تکیے کا غلاف پسند کیا۔ اسی غلاف کو تھیلے کی طرح
کھول کر میں نے اپنے بریف کیس کے سب کاغذات۔ یعنی تینوں برمی پاسپورٹ اور
ارہوں کی مالیت کے سفر چیک اس غلاف میں الٹ دیے اور پہلے مدارسی بڑے میاں سے
پھر خاص طور پر کوسوی سے ان سب ”کاغذوں“ کی جان کی طرح حفاظت کرنے کا وعدہ
لیا۔ میں نے کہا آگ اور پانی اور چوروں سے ان کاغذوں کو بچاؤ گے تو ہم سب مہاراجوں
کی طرح کہیں بھی رہ سکیں گے کسی بھی جگہ بچ کے نکل جائیں گے۔

کوسوی نے وعدہ کیا کہ وہ جان سے زیادہ ان کی حفاظت کرے گی۔ مجھے اس
پورا اعتبار تھا۔ میں نے بیڈ شیٹس کے ایک گٹھے کے ساتھ یہ غلاف تھیلا کوسوی کے
حوالے کر دیا۔ میری جیب میں چھوٹے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی تھی جلدی میں جسے نئے
جگہ تقسیم کر کے دو حصے دادا پوتی کے حوالے کیے۔ ایک خود میں نے رکھا۔ بڑے میاں
سمجھایا کہ اول تو ہم تینوں ساتھ نکلنے کی کوشش کریں گے اور خدا کرے گا تو نکل بھی
جائیں گے۔ لیکن اگر ساتھ نہ نکل سکے، پھڑ گئے تو چوبیس گھنٹے بعد پھر اڑتا لیس گھنٹے بعد
پھر بہتر گھنٹے بعد رنگون شہر کے پرانے تاریخی قبرستان میں سے آخری مغل تاج دار بہادر
شاہ ظفر کے مزار پر ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہیں گے۔ بہتر گھنٹے کے بعد بھی نہ

وہ مارا! میں نے دل میں کہا۔

مدن بسولا، سیکورٹی روم میں منہ سے جھاگ اڑاتا ہوا آیا۔ کچھ دیر مجھے بیٹھا غور تارہا۔ زبان سے کچھ نہ کہا اس نے بس گھورتا رہا پھر اٹھ کر چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد آیا تو بہت پریشان تھا۔ میرا خیال ہے۔ کسی کو فون کر کے آ رہا تھا۔ میری گرفتاری کے ایک گھنٹے کے اندر انڈر مجھے کوئی نینٹل کے سیکورٹی روم سے رنگون کے مرکزی انٹیلی جنس کے دفتر میں جسے عام طور پر سی آئی ڈی ہیڈ کوارٹر کہا جاتا تھا۔ پہنچا دیا گیا۔

سی آئی ڈی ہیڈ کوارٹر میں سب سے پہلے انہوں نے مجھے چائے پلائی، اچھی خاصی چائے تھی۔ کوئی نینٹل کے معیار کی۔ پھر جو ان کے افسروں، ماتھوں نے آنا شروع کیا ہے تو سمجھو میلہ لگا دیا۔

ہر طرح کے لوگ آئے۔ حاکم بھی ماہرین بھی۔ رنگون، نئی دہلی، کلکتے، سنگاپور، بنکاک، لندن اور خدا معلوم کن کن شہروں میں تربیت پائے ہوئے جاسوس بری، تھائی، ہندوستانی، جاپانی اور انگریز تک۔

چار دن انہوں نے مجھے سونے نہیں دیا۔ اگلے تین دن بھوکا رکھا پھر خوب پر تکلف کھانا کھلایا۔ ایک دن کھونٹی سے جتھ کڑی باندھ کر کھڑا رکھا۔ دو دن رات کچھ بھی پینے کو نہ دیا۔ نہ پانی نہ دودھ نہ چائے۔ کسی قسم کا رقیق مادہ مجھے نہ ملا تو میری حالت ابتر ہوئی۔ بے ہوش ہو گیا۔ انہوں نے گلوکوز چڑھایا۔ چار گھنٹے کسی اسپتال کے اسٹیشن وارڈ میں رکھا۔ بھانت بھانت کے ڈاکٹروں نے میرا طرح طرح سے معائنہ کیا۔ پھر وہ دوبارہ مجھے سی آئی ڈی دفتر میں لے آئے۔ کوئی سنگٹل یا منگل صاحب۔ حرام زادہ، نئی دہلی کا تربیت یافتہ، ایک جلاذ صورت ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ملنے آیا۔ مجھ سے بڑی صاف اردو میں پوچھنے لگا۔ ”بھیا! تم نے کبھی ہندوستان کے کسی تھانے میں کچھ وقت گزارا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

افسوس کے ساتھ سر ہلا کر چیچ چیچ کر تارہا پھر بولا۔ ”خیر کوئی بات نہیں۔ اسے دیکھو یہ میرا ہیڈ کانسٹیبل ہندوستانی ہے۔ کوئی جگہ ہے پہلی بھیت وہاں کا جیل سپرنٹنڈنٹ تھا اس کا باپ۔ باپ نے کوشش کی یہ کچھ پڑھ لے پر اس نے پڑھ کے نہیں دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے پولیس میں اسٹنٹ سب انسپکٹر بھرتی کروادے تاکہ یہ بھی ترقی کرتے کرتے باپ کی طرح ایک دن جیل سپرنٹنڈنٹ بن جائے۔“

صورت یہی ہو۔

لفٹ رک گئی اور جب میں نے اسے گراؤنڈ فلور پر لے جانے کے لئے وہ بڑل دیا جس پر انگریزی حروف جی لکھا تھا تو نہ معلوم کس شیطانی نظام کے تحت بجلی کے سرکٹ نے میرے ساتھ خطرناک مذاق شروع کر دیا۔ رکی ہوئی لفٹ میں ایک دم خطرے کا الارام بجنے لگا۔

”لعنت ہے!“ میں نے اونچی آواز میں کہا۔ مگر الارام اتنا شور کر رہا تھا کہ خود مجھ تک میری آواز نہ پہنچ سکی۔

میں باری باری مختلف بٹنوں کو دباتا رہا۔ جھنجھلا کر میں نے بورڈ پر گھونے بھی برسائے مگر دو منزلوں کے درمیان رکی ہوئی کیرج میں مسلسل یہ بھیانک الارام بجے جا رہا تھا۔

آگے جو بھی ہوا وہ اس قدر مضحکہ خیز تھا کہ برسوں بعد اب بھی یاد کرتا ہوں تو خفت میں پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں۔

شاید دو منٹ سے بھی کم مدت میں ہوٹل کا انجینئری، میکینیکل اور اسٹاف انتظامیہ کے لوگ بہ شمول مدن بسولا اور ہوٹل میں متعین پولیس والے ہوٹل کا اپنا سیکورٹی گارڈ جاسوس وغیرہ اس منزل پر پہنچ گئے جس منزل سے میں لفٹ میں سوار ہوا تھا۔ لفٹ کی کیرج کو میکینیکل اسٹاف نے اپنی انجینئری کر کے نیچے پہنچایا۔ لفٹ کا دروازہ کھولا گیا اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔

یہ آج تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ سرکٹ میں یہ الٹ پھیر مجھے گرفتار کرنے کو کیا گیا تھا یا کہ یہ میرے ساتھ بجلی کا کوئی بھونڈا مذاق تھا۔

مجھے پکڑ دھکڑ کر تیزی سے کھینچ کر ہوٹل کے سیکورٹی روم میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں پولیس والوں نے ہوٹل والوں کی موجودگی میں میری زبردست تلاشی لی۔ میرے پاس کچھ نہ نکلا بس چند ہزار کے نوٹ اور ریزگاری تھی۔ مدن بسولا اپنے سیکورٹی چیف کے ساتھ نکل کر باہر بھاگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”بوڑھے اور ساتھ والی لڑکی کو تلاش کرو۔ سب کچھ ان کے پاس ہوگا۔“

بہت دیر بعد میجر مدن بسولا اور اس کا چیف سیکورٹی روم میں داخل ہوئے تو میں ان کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ بڑے میاں اور ان کی پوتی کامیابی کے ساتھ نکل چکے ہیں۔

”یہ لال رنگ کا سوچ دبا دو گے تو میں آجاؤں گا۔ اور اس حرام زادے ہیڈ کا ٹیبل سے نہارا پچھا چھڑا دوں گا۔ بلاوجہ یہ سوچ مت دہانا نہیں تو اور مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ جب تم یہ سمجھو کہ ہیڈ کا ٹیبل جو کچھ کر رہا ہے وہ تمہارے بس سے باہر اور تم سچ سچ صحیح اپنے پیالے دے سکتے ہو تو اس وقت یہ سوچ دہانا۔ میں آکر تمہارا بیان لے لوں گا اور اس سالے ہیڈ کا ٹیبل سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔“ یہ کہہ کر سنگل یا منگل صاحب چلا گیا۔

دراصل دس بارہ دن میں انہوں نے میرا بیان لینے کے لیے ہر طریقہ آزما کے دیکھ لیا تھا۔ یعنی ہر قانونی طریقہ۔ میرا بیان مختصر تھا اور یہی تھا کہ میں بری باشندہ ہوں۔ میرا نام رانا لیش پال چترپال مہادیو جگن مہادیو ہے۔ میرے بابا راجا چترپال دھرن پال مہادیو جگن مہادیو علاقہ جیت پور سونیا کے جاگیردار ہیں۔ جاگیر تو خیر اب نہیں رہی تاہم جیت پور سونیا کا جنگل ہماری ٹیک کی لکڑی کی اسٹیٹ ہے۔ ہم برما سے باہر سیر و سیاحت پر جانے کے لئے کوئی نیشنل میں ٹھہرے تھے۔ میں لابی میں آنے کے لئے لفٹ پر سوار ہوا۔ لفٹ درمیان میں رک گئی۔ میں نے الارم بجا دیا۔ مجھے ہوٹل کے اسٹاف نے لفٹ سے نکالا اور اس کے بعد سے ہر شخص مجھ سے بدسلوکی کر رہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ مہارانا سرکار، میرے بابا اور دھرم پتی رانی صاحبہ کہاں ہیں تو لوگ میرا مذاق اڑاتے اور مجھے دھمکاتے ہیں۔ دراصل ہمارے پاسپورٹ اور شناخت کے سارے ثبوت رانی صاحبہ کے پاس ہیں۔ حکومت کو چاہئے کہ رانی صاحبہ سے رابطہ کر کے میرے بیان کی تصدیق کر لے اور مجھے چھوڑ دے۔

ظاہر ہے اس بیان میں صرف ایک بات سچی تھی کہ ان ناموں کے تین پاسپورٹ جاری ہوئے ہیں۔ بری وزیر جس نے تین لاکھ لے کے پاسپورٹ جاری کئے تھے یا تو اب تک مصیبت میں مبتلا ہو چکا ہو گا یا پھنسنے والا ہو گا۔ اس نے اپنے طور پر بھی مجھ سے سچ اگوانے کی کوشش کی تھی اور لوگ بھیجے تھے تاکہ کسی طرح جعل سازی کے اس ہنڈے سے وہ اپنی گردن نکال سکے مگر میں نے اس کی ہر کوشش کو اپنے اٹل بیان کے ذریعے ناکام کر دیا تھا۔

سب جانتے تھے کہ جیت پور سونیا نام کی کوئی جاگیر، جنگل اسٹیٹ کہیں نہیں ہے۔ مگر وزیر کے ریکارڈ میں ہمارے نام رانا فلاں فلاں اور رانی فلاں فلاں لکھے ہوئے ہوں گے۔ جب تک وہ تین پاسپورٹ وزیر کے ہاتھ میں نہیں آجاتے۔ اس کی گردن

وہ دم لینے کو رکاوٹوں میں پوچھا۔ ”بھیا! یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا، کہنے لگا۔ ”سنو۔ جلدی مت کرو۔ بڑی مزے کی بات ہے۔ خیر جی۔ اس سالے نے پڑھ کے نہیں دیا۔ چوری چکاری، بد معاشی میں تو ہمیشہ سے لگا رہتا تھا، جی اس نے ایک قتل بھی کر دیا۔ پیلی بھیت کا ہی کوئی غنڈا تھا اسے گا گھونٹ کے مار دیا تھا کوئی ایسا ہی گندہ قصہ تھا کہ وہ بد معاش اسے اپنے قابو میں کر کے بری لائن پر ڈال دینا چاہتا تھا۔ جیسا کہ بعض غیر فطری سوچ رکھنے والے کرتے ہیں۔ اس ہیڈ کا ٹیبل کی عمر اس وقت سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ سمجھ گئے ہوں گے وہ غنڈا اسے کیوں گھیرنا چاہتا تھا؟ خیر جی باپ نے اسے پیلی بھیت سے دہلی بھیج دیا تو اس کی ساری ٹریننگ پولیس کی نہیں، بد معاشی کی۔ ساری ٹریننگ دہلی کے بد معاشوں، چوروں، لقب زنوں کے بیچ ہوئی ہے۔ یہ اب تک سولہ سترہ قتل کر چکا ہے عمر اس کی زیادہ نہیں ستائیس اٹھائیس سال کا ہو گا مگر نشوں کی زیادتی اور طرح طرح کی عورتوں کے ساتھ وقت گزار کے اس نے اپنا حلیہ ایسا کر لیا ہے۔ چالیس سے کم کا نہیں دکھتا۔ یقین کرو بھیا یہ پورے تیس برس کا بھی نہیں ہے۔“ وہ رکا، مجھے احتیاطاً ہاتھ اٹھا کر اس نے بولنے سے روک دیا تھا۔

سائنس درست کر کے سنگل یا منگل صاحب پھر شروع ہو گیا۔ مجھے تو وہ خود بھی بیمار لگتا تھا حالانکہ جو ان سا آدمی تھا۔ کہنے لگا۔ ”خیر جی بھیا تمہیں اس سالے ہیڈ کا ٹیبل کا کونا شادی تو کرانا نہیں ہے جو اس کی لائف ہسٹری پر اتنی بہت سی بات کریں۔ اس نے دس گیارہ برس جس حرام زادے پن میں گزارے ہیں بھیا جی اس کا سوچ کے مجھے تک جھرجھری آجاتی ہے۔ تم تو پھر ابھی لڑکے ہو۔ تو تم کہہ رہے ہو تم نے ہندوستان کا کوئی تھانہ نہیں دیکھا؟ آج تک؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں واقعی میں نے نہیں دیکھا۔“ سنگل صاحب اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”چلو کوئی بات نہیں، اب ہمارا ہیڈ کا ٹیبل آگیا ہے۔ یہ تمہیں چھ آٹھ گھنٹے میں سب کچھ بتا دے گا۔ مطلب اگر اس حرام زادے نے تمہیں مار نہیں ڈالا تو چھ آٹھ گھنٹے میں تم کو اچھی طرح خبر لگ جائے گی کہ ہندوستان کے تھانوں میں ملازموں سے کس طرح پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ ہاں ایک بات۔“ کہہ کے وہ رکا۔ وہ ہیڈ کو ارٹھر کے اس کمرے کے دروازے کے برابر دیوار میں لگے ایک لال سوچ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

میں نے باباں ہاتھ بیلٹ کے بھاری سرے کو روکنے کے لئے بڑھایا اور دایاں
پیر چلاتے ہوئے بڑھ کر اس پولیسے پر چھٹا۔ وہ ایسے کسی حملے کے لئے تیار تھا۔ بیلٹ کو
پیری گرفت سے بچاتے ہوئے اس نے میرے دائیں پیر کو نشانہ بنایا۔
میں نے سامیری چیخ نکل گئی تھی۔ پولیس والے کی پٹنی کا بھاری نشان سیدھا
میرے منحنے پر لگا تھا۔

پیروں میں مضبوط قیمتی جوتے ہوتے اس ضرب نے مجھے اچھال کر پھینک دیا۔
لگا تھا پیر پر کھڑے سے وار کیا گیا ہے۔ میں فرش پر پڑا تھا اور بھرپور چوٹ کھائے ہوئے
اپنے پیر کو کانپتا لرزتا دیکھ رہا تھا مگر تکلیف ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اگر جنگلوں میں
پہنچے جانے والا بھاری کیمیکل شو میرے پاؤں میں نہ ہوتا تو پنچاٹ کر گر سکتا تھا۔ منحنے کی
ہڈی کرچی کرچی ہو سکتی تھی۔ میں نے دیکھا پیتل کے بکسوں نے جوتا کاٹ دیا تھا۔ پیر
میں پہنا ہوا پیلا ادنیٰ موزا کٹے ہوئے چمڑے سے باہر نکل آیا تھا۔

پیلی بھیتی ہیڈ کا ٹیبل مجھے فرش پر بے بس پڑا دیکھ کر ہنسا۔ اپنی بھدی بھیا نک
آواز میں اپنی سرکاری پٹنی کو سر کے گرد گھمایا اور میرے شانے کو نشانہ بنایا۔ میرا دایاں
پیر ابھی تک بے حس تھا۔ ہیڈ کا ٹیبل کے وار سے بچنے کو میں فرش پر لوٹ لگا سکتا تھا
مگر اس کے لئے مجھے اپنی دائیں ٹانگ کو رول کر کے کروٹ لینی پڑتی اور دائیں ٹانگ ابھی
بے کار تھی۔ سمجھو اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس قصائی کا یہ دوسرا وار میرے شانے
کے پر گوشت حصے پر تھا۔ بری پولیس کا پیتل نشان اس نے میرے شانے پر کھڑا نہیں
لگایا تھا۔ طمانچے کی طرح چوڑائی میں مارا تھا اور یہ وار میں نے سونی صد بے بسی میں کھایا
تھا۔ اگر پہلی بھیتی چاہتا تو کھڑا نشان سیدھا میری کھوپڑی پر پڑ سکتا تھا۔ اس صورت میں
میرا زندہ بچنا محال ہوتا۔ اس کے دو حملوں ہی سے سمجھ میں آگیا تھا کہ منگل سنگل حرام
زادے نے جو کہا تھا وہ ایک دم درست تھا۔ خالی دھمکی نہیں تھی۔ ہیڈ کا ٹیبل اپنی
بولت سے جب چاہتا مجھے ختم کر سکتا تھا۔ یہ شخص اعلیٰ درجے کا جلااد اور ماہر لڑاکا تھا۔

ہم ہتکٹوں کو قدرت کی طرف سے جہاں دلیری نصیب ہوئی ہے وہاں دانش
مندى اور سوچ بوجھ بھی بہت سی دلیر قوموں کی طرح عطا ہوئی ہے۔ میں نے سوچا یہ
ہلا دیجھے آٹھ وار سوچ سمجھ کر کرے گا پھر جب دیکھے گا میں ٹس سے مس نہیں ہو رہا اور
بوجھ گچھ کا فائدہ کوئی نہیں تو یہ مجھے زندگی بھر کے لیے اپناج کر دے گا یا خرچ کر دے گا۔
بے فیصلے کا وقت تھا۔ میں نے خود سے کہا شیر علی خان! دانش مندی کے ساتھ فیصلے کرنے

پھندے میں پھنسی رہے گی۔ سب سمجھ گئے تھے کہ پاسپورٹ بوڑھے اور اس کے ساتھ
کی لڑکی کے قبضے میں ہوں گے اور تمام حیرت ناک رقصیں بھی انہی دو کے پاس ہوں گی۔
مدن بسولانے جواہر کی فروخت اور نقد رقوم کے سفری چیکوں میں تبدیل کیے جانے کی
پوری داستان مجبوراً حکام کو سنادی ہوگی اور نہار سنگھ نے مجبوراً بتا دیا ہوگا کہ جو ہیرے
کے ہیں وہ سنٹا گڑھی کی جوئی ناہر سین کے بریسلٹ اور ہار کے ہیرے ہیں۔ غرض ہر سطح
پر ایک کھلبلی مچ رہی ہوگی۔ میں نے دس دنوں میں بہت سے پوچھ گچھ کرنے والوں کو تاز
لیا تھا کہ وہ سنٹا گڑھی کے سابق راجا موٹے ناہر سین کے بھیجے ہوئے آئے ہیں اور اس
کے خاندانی زیورات یعنی اس انتہائی قیمتی بریسلٹ اور ہار کا سراغ لگانے آئے ہیں۔

مگر سب کے لئے میرا ایک ہی بیان تھا کہ میں تو رانائیش پال فلاں فلاں ہوں۔
پشت ہاپشت سے ہمارے ٹیک کی لکڑی کے جنگل چلے آ رہے ہیں۔

پولیس شاید جواہریوں کو بھی گھیر لائی تھی۔ یعنی اتنی بڑی رقصیں اور اتنی بڑی
پارٹیاں اس میں ملوث ہو چکی تھیں کہ چھوٹا موٹا پولیس افسر تو اپنی نوکری کی خیر من رہا ہوگا
اور وردی میں کانپ رہا ہوگا۔ بڑے حکام اور اہم افسران رقوم کی تفصیل سن کر منہ میں
پانی بھر بھر لاتے ہوں گے مگر مجبوری تھی۔ معاملہ بڑا تھا۔

یہ نیا آدمی منگل صاحب یا سنگل صاحب۔ اپنے قصائی ہیڈ کا ٹیبل کو انتہائی
اقدام کے طور پر لایا تھا۔ میں نے دانت پر دانت جما کر سوچا کہ شیر علی خاں تیار ہو جاؤ۔
یہ پولیس والا بالکل آخری درجے کی کارروائی کرے گا۔ چند ہی ہڈیاں بدن میں سلامت
رہنے دے گا۔ یہ حرام زادہ صورت ہی سے لگتا تھا کہ پیشہ ور قاتل ہے۔

منگل سنگل صاحب کے جاتے ہی ہیڈ کا ٹیبل نے اندر سے کمرے کے بولٹ
چڑھا دیے اور اپنی چمڑے کی پٹنی کھول لی۔ پٹنی کے ایک سرے پر پیتل میں ڈھلا بری
پولیس کا نشان بکسوں کے طور پر لگایا گیا تھا۔ ہیڈ کا ٹیبل نے پٹنی کو دوسری ہلکی طرف
سے اپنے چوڑے چکلے پنچے میں جکڑ لیا اور بیلٹ کو اپنے سر کے گرد کئی بار تیزی سے
گردش دی۔ پیتل کا نشان بھاری ہونے کے باوجود ہوا میں شاں شاں کی بھیا نک آواز پیدا
کر رہا تھا۔

وہ بیلٹ لہراتا ہوا بڑھا اور میں نے دل میں کہا کہ شیر علی! یہ نشے باز اور ادبائش
آدمی ہے اس میں اتنی جان تو نہیں رہی ہوگی کہ تمہیں قابو کر لے۔ اس کا پہلا وار تھا
کھوٹا کر دو تاکہ تمہارا پلہ شروع ہی سے بھاری رہے۔

اندرا اندر میں آپ کو اس دلدرد جگہ سے نکال کے سینٹرل جیل پہنچوا دوں گا۔ پرامز۔ یہ وعدہ ہے میرا۔“ منگل سنگل ایسے وعدہ کر رہا تھا جیسے بچوں سے مٹھائی کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ میں منگنے کی چوٹ کی وجہ سے خود اٹھ کر کرسی پر بیٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ ایک طرف سے منگل سنگل اور دوسری طرف سے اس کی سکریری نے اٹھایا۔ تکلیف سے جیسے جان نکل رہی تھی۔ منگل سنگل کی سکریری رتے بی بی ہمدرد عورت تھی اور میں نے نوٹ کیا وہ دیسی عطر کا شوق رکھتی ہوگی۔ اس نے حنا کا عطر لگا رکھا تھا جو نئی تعلیم والی عورتیں عام طور پر نہیں لگاتیں۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا تو منگل سنگل نے سنبھلنے کا بھی موقع نہیں دیا۔ بولا۔ ”نام بتاؤ، نام؟ نام اپنا؟ جلدی۔“ میں نے بتایا شیر علی خان۔ باپ کا نام صد خان بگلش، پیدائش سندربن مشرقی پاکستان۔

پوچھنے لگا۔ ”یہاں کیسے آئے؟ کیسے کیسے؟ جلدی۔“ اس کی سکریری شارٹ پنڈ میں لگھتی جا رہی تھی۔ میں نے بتا دیا کہ اس طرح کا کیمز بازار کے سلسیل چودھری نے اغوا کر کے مرضی کے خلاف برما میں اسمگل کر دیا اور بارڈر کے سرکاری اہلکاروں کو رشوت دے کر ایک فوجی افسر کی قید میں دے دیا مجھے۔ ایک چھوٹے اسٹیمپر پر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا رہا تھا تو ایک جنگلی ریچھ جسے اسٹیمپر کا مالک ادھر سے ادھر اسمگل کر رہا تھا پنجرہ توڑ کر نکل گیا۔ ریچھ نے اسٹیمپر میں تباہی مچادی۔ مجھے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ میں تیرتا ہوا کنارے پر آگیا۔ دو دن بھٹکتا رہا، تیسرے دن ایک گوری میم صاحب جوئی ناہر سین، اس کا بوڑھا برمی سکریری، سکریری کی نوجوان بیٹی جنگل میں مل گئے مجھے۔ پڑیاں حال بھٹکتا دیکھ کر ان تینوں نے میری بہت مدد کی۔“

انتابتا کر میں نے پانی مانگا۔ سکریری پانی لینے چلی گئی۔ منگل سنگل منہ پر ہاتھ رکھے کرسی میں دھنسا خاموش بیٹھا رہا۔ وہ خود بھی اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہا تھا۔

اس کو سرکار کی طرف سے جو ادھر ادھر کی تفصیلات بتائی گئی تھی۔ میرا بیان ان میں فٹ بیٹھتا جا رہا تھا۔ اسٹیمپر پر سوار کیے جانے تک کے واقعات میں نے سچ سچ بیان کر دیے تھے۔ ہاں میں نے اسٹیمپر کے بعد سے جوڑ توڑ کرنا اور کہانی بنانا شروع کی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ کوئی نینٹل کی لفٹ میں میرے پھنسنے تک کہانی کی چولیس صحیح بیٹھی ہیں یا

کا وقت آگیا ہے۔ میں گھسٹتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور تکلیف سے مگر قطعیت کے ساتھ میں نے لال رنگ کا سوچ دبا دیا۔

سوچ دبائے جانے کے پانچ چھ منٹ تک کچھ نہیں ہوا۔ میں دیوار سے ٹک لگائے بیٹھا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل ہاتھ میں اپنی ٹپلی لیے سامنے کھڑا مجھے دیکھ کر آپ ہی آپ ہنستا مسکراتا رہا۔ یعنی اگر مسکرانے نام کی کوئی کارروائی وہ اپنے بھیاک چہرے سے کر سکتا تھا تو کرتا رہا۔

پانچ چھ منٹ بعد دروازہ کھلا منگل سنگل صاحب پتلون کے سامنے کے بٹن بند کرتا ہانپتا ہوا کمرے میں آیا کہنے لگا ”سوری بمیا جی! ہاتھ روم میں تھا جب تم نے لال سوچ دبا دیا۔ میں بولا کہ لوجی لڑکے نے سمجھداری کا کام کر دیا ہے۔ اس سالے ہیڈ کانسٹیبل سے پیچھا چھڑا لیا ہے لڑکے نے۔ ہاں بھیا؟ صحیح سمجھا ہوں نا میں؟“

میں نے ہاں میں سر ہلایا تو منگل سنگل صاحب ایک دم گھوم گیا۔ غصے میں اپنے جلا سے کہنے لگا۔ ”جا بھی جا تو ادھر کیوں کھڑا ہے اب۔ سالا!“

لگتا تھا ہیڈ کانسٹیبل پر اس جھڑکی یا ابے تے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ یکسوئی سے اپنی وردی کی پتلون میں بیلٹ لگانے لگا اور جب بیلٹ لگ گئی۔ بکسوا بند ہو گیا تو کاہلی کے ساتھ تقریباً جماہی لیتا ہوا ہیڈ کانسٹیبل کمرے سے نکل گیا۔

منگل سنگل نے اس کے جاتے ہی لال سوچ دبا دیا۔ آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں ایک خوش پوش سکریری پیازی رنگ کی کلف لگی ساڑھی پہنے پیڑ اور پنسل لے کرے میں آگئی۔ اس کے پیچھے ایک وردی پوش چپرا اسی تھا جس نے دو کرسیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔

”بس دو کرسیاں لایا ہے؟“ منگل سنگل کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”برمی میں بات کر رہا تھا۔“ دو کرسیاں لایا ہے سرے۔“ رتے بی بی فرش پر بیٹھے گیا۔ ”پر؟ آں؟“ منگل سنگل نے اپنی سکریری لڑکی کے سلسلے میں نہایت گھنیا بات کہی مگر لگتا تھا چپرا اسی یا لڑکی نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔

”ہاں جناب!“ منگل سنگل نے جناب کو زنا ب کی طرح کہا تھا۔ ”تو جناب! پہلے چائے پی لو آپ ہاں بھیا پھر جم کے گھٹنے دو گھٹنے بات ہوئے گی ہماری آپ کی۔ اگر بیان میں بھیا کوئی حراہی پن نہیں ڈال دیا تم نے، سب صحیح صحیح بتا دیا تو آج بلکہ چار گھنٹے کے

ایگیا۔

حکومت کے پاس موجودہ واقعات کے چوکھٹے میں میری کہانی ایک وفادار سفید ام پوی اور وفادار دیسی سیکرٹری کے ایثار و قربانی کی کہانی فٹ بیٹھ رہی تھی۔ اور ہاں اگر وہ سالانہ سگھ گائیڈ جسے میں نے جوئی میم صاحب کے ساتھ شکار بیلے میں پکڑا تھا میری اس کہانی پر اپنے دل میں یقین نہیں کرتا تو نہ کرنے، جائے سراہم میں۔

سینٹرل جیل میں پہنچا تو مجھے بی کلاس دی گئی۔ برما کی حالت دیکھتے ہوئے اچھے اے انتظامات اور سہولتیں تھیں۔ کسی نے بتایا کہ کوئی نیشنل کانفیجر بسولا صاحب دو دہری اور ہوٹل کا ایک گائیڈ یہاں بی کلاس میں رکھے گئے تھے۔ میرے آنے سے دو گھنٹے پہلے ان سب کو کسی اور جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

جیل عجیب بے کاری جگہ ہوتی ہے۔ مجھے یہاں ڈیڑھ مہینہ کاٹنا مشکل ہو گیا۔ لڑکیا ہو سکتا تھا صبح ایک عمر قید بھگتے والا قیدی گرم پانی کی بالٹی نہانے کو لے آتا۔ چائے پڑھتا۔ کوئی دوسرا قیدی جعدار، بسکٹ یاد لیا پہنچا دیتا۔ چائے کے ساتھ میں ناشتا کر لیتا۔ پھر سے ایک دن کے باسی بری انگریزی اخبار آجاتے تھے۔ ناشتے کے بعد وہ پڑھتا رہتا یہاں تک کہ دوپہر ہو جاتی۔ دوپہر میں ایک اور عمر قیدی آ کے تازہ ساگ اور چاول پکاتا اور چلا جاتا۔ کھانا کھا کر میں کچھ دیر سوتا پھر ٹھنڈے پانی کی ایک بالٹی آجاتی تو نہادھو کر کچھ دیر جیل کے باغیچے میں ٹہلتا یا پودوں پھولوں کا کام کرتا۔ یہ شوق میں نے یہاں جیل میں آکر بڑھالیا تھا۔ شام کو میں دو گھنٹے دوسرے قیدیوں کو انگریزی کی ابتدائی تعلیم بھی دیتا تھا۔ سنگل منگل صاحب نے یہ خاص رعایت مجھے دلوار کھی تھی۔ اس طرح شام کا وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ رات کا کھانا مجھے اپنے ان انگریزی والے شاگردوں کے ساتھ ملتا تھا۔ اس میں کبھی انڈا مچھلی بھی ہوتی تھی۔ اتوار کو کوئی بیٹھا بھی ملتا تھا مگر یہ زیادہ تر کچھ فصول سا ہوتا تھا۔ میں اپنے حصے کا بیٹھا عمر قیدی کام والوں کے حوالے کر دیتا تھا۔

جیل میں آنے کے بعد ایک مرتبہ سنگل منگل صاحب دو تین افسروں کے ساتھ آیا تھا۔ انہوں نے میری تصویریں اتاری تھیں۔ ان کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ مجھے اصرار سے سنا کرنے والے بارڈر پولیس کے اہل کاروں کو گھیر چکے ہیں۔ انہوں نے اہل کاروں کی آٹھ دس تصویریں بھی دکھائیں جن میں برما کی سرحدی پولیس کے انسپکٹر اور ہمدار کی تصویر بھی تھی۔ یہ وہی تہذیب والا مسلح آدمی تھا جسے برما پاکستان بارڈر پر سلسیل

نہیں۔

پانی کا وقفہ دے کر میں یہ چاہتا تھا کہ جو کچھ بیان کیا ہے۔ اور آگے جو بیان کرتا ہے۔ اسے ذہن میں دہراؤں احتیاط ضروری ہے۔ نکراد ہوا تو میرا اعتبار جاتا رہے گا پھر منگل سنگل اسی جلا کو بلالے گا۔ دانش مندی کا تقاضا یہی تھا کہ کہانی قابل اعتبار ہو اور ان کے پاس موجود فریم میں صحیح بیٹھے۔

مجھے یاد آیا کہ کوئی نیشنل کے منیجر مدن بسولا کا کزن وہ جیپوں کا ٹھیکے دار جو اپنی جیپ میں ہمیں رنگون لایا تھا۔ گوری میم جوئی کے بوڑھے موٹے شوہر تاہر سین کے بارے میں بتا رہا تھا۔ کہ وہ دو ڈھائی برس سے اپنی سابق ریاست ستنا گڑھی سے نکلا تک نہیں ہے۔ حکومت نے اس کے باہر جانے پر پابندی لگا دی ہے کیونکہ اس پر کوئی مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے پانی پیتے پیتے بوڑھے مداری کو موٹے مہاراجا تاہر سین کے وفادار سیکرٹری کے رول میں پکا کر لیا۔

اس لیے آگے میں نے بتایا کہ ”جوئی میم صاحب اور بڈھے سکرٹری نے یہ جان کر کہ میں برما سے ہر صورت میں نکل جانا چاہتا ہوں یہ منصوبہ تیار کیا کہ مجھے اسٹیٹ چیت پور سونیا کاراج کمار بتایا جائے۔ بڈھا بری سکرٹری میرا باپ مہاراجا بنے اور اس کی نو عمر بیٹی میری رانی بنے، ہم کوئی نیشنل ہوٹل میں ٹھہریں اور لاچی منیجر مدن بسولا کو پیسے کھلا کر اس بات پر راضی کر لیں گے کہ وہ ہمیں جعلی ناموں سے تین پاسپورٹ بنوادے۔ اور ستنا گڑھی کے خاندانی جواہر بکوار رقوم کو سنی چکیوں میں تبدیل کرالے۔“ میں نے کہا۔ ”شاید جوئی میم صاحب اپنے بیمار شوہر راجا تاہر سین کو چوری چھپے برما سے نکال لے جانا چاہتی تھی وہ اس کے علاج کے لئے حکومت سے چھپ کر باہر رقم اکٹھا کر رہی تھی۔ کیونکہ مجھے ایسا لگا تھا کہ بوڑھے سکرٹری اور اس کی بیٹی کو جعلی ناموں سے ملک سے باہر بھیج کر وہ اپنے مہاراجا کے لئے انتظامات کر رہی ہے۔ آگے کا تو جناب آپ کو پتا ہے کہ میں پکڑا گیا اور میرے نقلی باپ مہاراجا صاحب اور نقلی دھرم پتی رانی صاحبہ فرار ہو گئے۔“

میرا بیان پورا ہو چکا تھا۔ منجنے کی چوٹ یاد کرتا ہوا میں کراہنے لگا۔ منگل سنگل صاحب نے اپنی اور اس کی سکرٹری نے اپنے نوٹ بک بند کی اور وہ اپنی کرسیوں کے ساتھ چلے گئے۔

مجھے پورے چھ گھنٹے بعد بھاری گارڈز کے ساتھ رنگون سینٹرل جیل منتقل کر

سنگل منگل نے ہاں میں سر ہلایا بولا۔ ”یہ ناخدا حلف اٹھا کر کہہ رہا ہے کہ اسنیر ایک برمی بوڑھا اور اس کی نو عمر پوتی بھی موجود تھے جو تیرے ساتھ ہی فرار ہوئے۔ مطلب سمجھا بھیا اس بات کا؟ مطلب یہ ہے کہ جوئی تاہر سین کے برمی سکر میٹر کی بیٹی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تم نے ہمیں جھوٹ بتایا ہے۔ یہ تمہاری پارٹی کا آدمی ہے۔ سیدھے سبھاؤ بتادو کہ بوڑھا اور اس کی پوتی کہاں ہیں اور۔ ان کے پاس جو بے گنتی ہارز چیک اور تین پاسپورٹ ہیں وہ ہمیں۔۔۔ بر میز گورنمنٹ کو کس طرح مل سکتے۔۔۔“

میں نے کہا۔ ”خدا جانتا ہے بڑھا اور وہ لڑکی کہاں ہے۔ خدا کی قسم مجھے نہیں۔۔۔“

منگل بولا۔ ”ایک تو تم خدا کی قسمیں مت کھاؤ بھیا۔ ہم مسلمان نہیں ہیں ہم دئی اثر نہیں ہوگا۔ دوسرے اب جھوٹ بکنا بھی بند کر دو نہیں تو مارے جاؤ گے۔ سچ بچے اسے جاؤ گے شیر علی کھان۔“

میں نے اسے اور وہ مجھے یعنی ہم دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے وہ کہہ رہا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میرا کہنا تھا کہ میں بالکل سچ رہا ہوں اور مجھے بوڑھے اور لڑکی کی کوئی خبر نہیں ہے۔

منگل منگل نے غصے سے گالیاں بکتے ہوئے وہ تصویر بھی میرے سامنے کر دی بیک وہ مجھ سے چپا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”اسے تو پہچانتا ہو گا بھیا تو؟“ یہ تصویر اس فوجی کی تھی جسے ریچھ نے، مطلب مداری نے مار ڈالا تھا۔ سنگل بولا۔ ”میرے ساتھ فوج جو افسر آئے ہیں اصل میں وہ تجھے لے جانے کو آئے ہیں۔ یہ کوئی دھمکی و دھمکی نہیں دیتے ہیں کہ تو نے ان کے ساتھی افسر کو اسنیر پر قتل کیا ہے وہ تجھے چھاؤنی لے گا۔“

نازیگ اسکوڈ کے سامنے کھڑا کریں گے۔ کل کا ٹائم طے ہوا ہے اس لئے آئے ہیں

میرا کچھ بھی کہنا بے سود تھا۔ پھر بھی میں نے بہت کچھ کہا۔ سب کچھ کہا۔ لاکھنا تھا کہ اگر تو تینوں پاسپورٹوں اور سفری چیکوں یعنی کروڑوں اربوں کی رقم کا پتا تپے تو ہم سول والے اوپر سے زور ڈالو کہ فوج سے تیری جان بخشی کر دیتے ہیں۔

رہا صورت میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

ہم کب تک جھک جھک کر سکتے تھے۔ آخر فوجی افسروں کا بھیجا ہوا آدمی آیا اور

چوہدری نے پیسے اور میری زنجیر پکڑائی تھی۔ میں نے انسپٹر موجددار کی تصویر پہچانی اور اس کے ایک دو بد معاش سپاہیوں کی بھی نشان دہی کی۔ وہ ہمدرد گارڈ جس نے مجھے سرحدی چیک پوسٹ پر ڈبل روٹی اور دہی کھانے کو دیا تھا پانی کو پوچھتا تھا میں نے اس کی تصویر دیکھ کر ہٹا دی کہ نہیں یہ موجددار انسپٹر کے ساتھیوں میں نہیں تھا۔ اس بھلے آدمی کو اچھے سلوک کا اتنا صلہ تو دینا چاہیے تھے۔

ایک بار کے سوانہ منگل منگل صاحب آیا نہ کوئی اور افسر۔۔۔ ڈیڑھ مہینہ گزر گیا مجھے جیل میں ڈال کر وہ لوگ بھول چکے تھے یا شاید وزیروں پانچ ستارہ ہوٹل والوں اور سابق راجاؤں، ان کی سفید قام ”باوفا“ بیویوں کے بچے کسی طرح کا معاملہ طے ہو رہا تھا۔ شاید لین دین سودے بازی چل رہی ہوگی۔

ٹھیک ڈیڑھ مہینے بعد جب میں انگریزی پڑھانے اور رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے بی کلاس کے کمپاؤنڈ میں بند ہونے کے لیے جا رہا تھا تو ایک اسٹنٹ جیلر اور پانچ گارڈ، جیل کی ٹین بلڈنگ کی طرف سے ایک جیپ میں آئے اور مجھے جیپ میں بٹھا کر مین بلڈنگ کی طرف لے چلے۔

جیل سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ سنگل منگل اور دس بارہ سول اور فوجی افسر موجود تھے۔ مجھے دروازے کے پاس ایک کرسی دے کر بٹھا دیا گیا اور وہ لوگ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو کاغذات دکھانے لگے۔ ان کے انداز نے مجھے ڈرا دیا۔ سنگل منگل ایک دم بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ غصے میں تھا اور بات بات پر اپنے ساتھ کے افسروں سے جھگڑ رہا تھا۔ آخر کچھ طے ہوا اور مجھے اور سنگل منگل کو ایک گارڈ کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ گارڈ دروازہ بند کر کے باہر کھڑا ہو گیا۔

منگل منگل یا جو بھی اس کا نام تھا مجھے خاموشی سے گھور کر دیکھتا رہا پھر بولا۔

”بھیا تم نے آخر حرامی پن کر ہی دیا اور اپنی موت بلا لی۔“

میں واقعی کچھ نہیں سمجھا تھا میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں نہیں سمجھا۔ منگل منگل نے اپنے کاغذوں میں سے دو تصویریں نکالیں، ایک چھپالی دوسری میری طرف بڑھادی۔ یہ تصویر برمی اسنیر کے ناخدا کی تھی۔ کہنے لگا۔ ”اسے پہچانتا؟“

میں نے بتا دیا کہ ہاں یہ اسی اسنیر کا ناخدا ہے جس پر سے میں نے پانی میں چھانک لگا کر اپنی جان بچائی تھی۔

شاید فوج اور جیل والوں کی بحث ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

جہاں جیپ کھڑی تھی وہاں دیوار کا سایہ پڑ رہا تھا۔ اس لیے اندھیرا سا تھا۔ دفتر کے سامنے تو بہت تیز روشنی پڑتی تھی۔ ذرا سایہ ملا تو میں نے جیپ کی باڈی پر سر نکالیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مرنے سے پہلے نیند کیوں خراب کروں کچھ دیر سولوں۔

خبر نہیں آدھے گھنٹے یا دو گھنٹے کھڑے کھڑے نیند لی ہوگی کہ دائیں طرف اندھیرے میں کسی نے سرگوشی میں میرا نام لیا۔ یہ میرا وہم ہو گیا یا ابھی تک میں نیند میں ہوں۔ میں نے آنکھیں اور بھیچ لیں اور پھر نیند میں جانے کی کوشش کی۔

”شیر علی۔ اے شیر علی۔ ہشیار ہو جا۔“ اب کے آواز بہت واضح تھی اور میں نے پہچان لیا۔ یہ بوڑھے مداری کی آواز تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

جیپ اور دیوار کے سائے کے بیچ مداری دبکا بیٹھا تھا۔

نہیں۔ مداری یہاں کیسے ہو سکتا ہے؟ یقیناً میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

موت کے سامنے دیکھ کر میرے بیجان زدہ ذہن نے یہ کیسی کرشمہ سازی کی ہے۔ مداری کو لا کھڑا کیا ہے۔ ٹھیک تو ہے۔ یہاں میرا اپنا کوئی نہیں جو نجات دہندہ بن کر آگے آئے۔ برما میں اس وقت ایک یہی جاننے والا ہے تو نیند میں۔ یا شاید جاگتے میں خواب دیکھتے ہوئے میں مداری کو دیکھ رہا ہوں۔ آواز تک سن رہا ہوں اس کی۔

مگر اس میرے واسطے نے۔۔۔۔۔ مداری نے۔۔۔۔۔ ہاتھ بڑھایا اور جیپ کی باڈی سے جھکڑی کے ساتھ جڑا ہوا میرا ہاتھ چھو لیا۔ یوں لگا جیسے برف کی سوکھی قاش مجھے چھو گئی ہے۔

واہمہ سرد یا گرم نہیں ہوتا۔ اس نے میرا ہاتھ تھپکا تھا اور اس کے لمس میں برف کی ٹھنڈک تھی۔

”شیر علی!“ ہشیار ہو جاؤ شیر علی۔“

”آں؟ بابا؟“ میں نے پہلی بار اسے بابا کہہ کر بلایا تھا۔

مداری نے کہا۔ ”شیر علی! گھوم کے دیکھو۔ وہ دوسرا سپاہی ادھر تمہاری طرف زہنیں دیکھ رہا؟“

میں نے سر گھمایا۔ جیل کا گارڈ اپنی رائفل کو لاٹھی کی طرح تھامے ہوئے جیپ کے پمپر سے ٹکا کھڑا تھا۔ میری طرف اس کی پیٹھ تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ بہت اُسے فرش کی طرف دیکھ رہا ہے۔ سو رہا ہوگا۔

میری سٹنگل کی ملاقات ختم ہو گئی۔

سٹنگل منگل نے آخری بات کہی۔ ”لے بھی جا۔ اپنے حرامی پن سے بھیا تو نے آپ اپنی موت بلائی ہے۔“

گارڈوں نے پھر مجھے دروازے کے برابر کرسی پر لا بیٹھایا۔ جیل والوں اور فوج کے افسروں میں کسی بات پر زوروں کی بحث چل رہی تھی۔ میں نے سننے سمجھنے کی کوشش کی مگر آہستہ بات ہو رہی تھی سمجھ میں نہ آیا۔ آخر فوجیوں میں سے ایک اٹھا۔ اس نے تیزی سے آگے مجھے کالر سے پکڑا اور کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ سپرنٹنڈنٹ اور دوسرے سوا افسر ”ہیں ہیں“ کرتے رہے مگر فوجی اتنے غصے میں تھا کہ میں نے کہا۔ ”بس اب خاتہ ہے شیر علی خان۔“ جیل میں آفس کے سامنے ان کی کاریں اور جیپیں کھڑی تھیں۔ فوجی افسر نے اشارے سے اپنے حوالدار کو بلایا۔ اس کو حکم دیا کہ اس قیدی کو مجھے ہتھ کڑی کر فوجی جیپ پر چڑھا دیا جائے۔ مجھے جیپ سے منتقل کر دیا گیا تو فوجی نے میرے کان پر ریو اور رکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔ ”میں اس بحث کو اسی وقت ختم کر رہا ہوں۔ تم اتھارٹی اس لاش پر چلاتے رہنا۔“

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب تک کی پوری زندگی، مشرقی پاکستان میں والوں کے درمیان توجہ اور محبت کے ماحول میں گزارا ہوا وقت، اسکول، سیر و شکار، کے دوستوں کی شفقت پھر کاسکیمز بازار کے ساتھیوں کے چہرے اور سلسیل چوہدری بازار کا سب کچھ درہم برہم کر دینا تیز رفتار منظروں کی طرح آکر گزر گیا۔ افسوس زون میں ایک محبت بھری دلچسپ محفل سے مجھے اٹھالیا گیا۔

خدا معلوم کب تک اس نیم بے ہوشی نیم بیداری کی حالت میں رہا۔ کہیں فون بجنے کی آواز سنائی دی پھر کسی نے بری میں کہا۔ ”سر! جی ایچ کیو سے فون آیا ہے میں نے کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا، جی ایچ کیو تو جنرل ہیڈ کوارٹر کو کہتے ہیں۔ یہ فون کا دم مرکزی دفتر ہوتا ہے۔ پھر میں نے محسوس کیا میرے آس پاس سے لوگ ہٹ رہے ہیں۔ بس جیپ کے پاس کھڑا وہی حوالدار رہ گیا ہے۔ حوالدار نے اب کہیں سے اپنی مشین گن نکال لی تھی جسے تیار کر کے وہ کمرے لگائے روشنی میں کھڑا تھا۔

آدھی رات تک اسی طرح جیپ پر ہتھ کڑی لگا کر مسلح حوالدار کے ساتھ روکے رکھا گیا۔ آدھی رات کے بعد جیپ کو دفتر کے سامنے سے ہٹا کر دیوار کے پارک کر دیا گیا اور فوجی حوالدار کے علاوہ جیل کا ایک مسلح گارڈ بھی لگا دیا گیا۔

مداری مجھے تنکے جا رہا تھا۔ پکڑے جانے کے خوف نے اس جیسے پکے کو بھی ہلاکے رکھ دیا تھا۔

گارڈ نے مجھ سے اس طرح باتیں کر کے شائد اپنے دل میں بیٹھے جلاو کو تسکین دے لی ہوگی۔ اس لیے اب وہ باقاعدہ پشت کر کے دیوار سے ٹک گیا۔ اس نے اپنی ہلکی مشین گن کا پٹا کندھے سے اتار کر بازوؤں میں الجھا لیا تھا۔ ہتھیار ہلکا ہو گا مگر شاید کندھے پر مسلسل بوجھ پڑنے سے اسے الجھن ہو رہی تھی۔

مداری نے ہاتھ تھپک کر آہستہ سے کہا۔ ”چلو“ اور آرام سے ہتھ کڑی کھول کر اس نے مجھے آزاد کر دیا۔

سخت نیچے میں میرا بازو جکڑے وہ اندھیرے ہی اندھیرے میں مجھے جیب کے عقب میں کھینچ لایا۔ یہاں رانقل پر اپنا بوجھ ڈالے جیل کا گارڈ کھڑا سو رہا تھا۔ مجھے گارڈ کی ہاک کے نیچے سے نکالتا ہوا مداری جیل کے دفتر کے پچھواڑے پہنچ گیا۔

اس نے دیوار کے ساتھ بنے سیمنٹ کے ایک بڑے چوترے کی طرف اشارہ کیا۔ چوترے پر سیمنٹ ہی کے بہت سے چوکور ڈھکنے رکھے ہوئے تھے۔ ایک ڈھکنا ایک طرف ایسے پڑا تھا جیسے وہ پوری طرح اپنی جگہ پر نہ ہو۔ کیونکہ وہاں دو بالشت چوڑا۔ اس سے ذرا لمبا تاریک خلا نظر آ رہا تھا۔

میں جگہ کو ابھی پورا سمجھ نہیں پایا تھا۔ کہ مداری نے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”اوپر نیچے لوہے کی سیڑھی ہے۔ یہاں اترتا ہے“ بس کر کر پانی ہے۔“

تو یہ جیل کے پانی کا ذخیرہ تھا جس میں مداری خود اتر رہا ہے اور مجھے اترنے کو کہہ رہا ہے۔ آگے کیا ہو گا؟ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مداری کے پیچھے پیچھے میں بھی تنگ جگہ میں کھس کر بیروں سے لوہے کے پائپ ٹٹولتا ہوا اترتا۔ نیچے کھڑے ہونے کی جگہ تھی اور سانس لی جاسکتی تھی۔ ظاہر ہے ڈھکنا پوری طرح ڈھکا ہوا نہیں تھا۔ یہی ہمارے فرار کا راستہ تھا۔ اندر پہنچ کر مداری نے اشارہ کیا اور میں نے ڈھکنے کو نیچے سے دھیرے دھیرے رکاتے ہوئے یہ خلا بند کر دیا گویا ہمارے فرار کا راستہ چھپا دیا گیا تھا۔ سیمنٹ کا ڈھکنا ہلکی آواز کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھا تھا اور اس آواز کے ساتھ ہی تسلسل میں مشین گن کا فائر ٹپکیا دیا تھا۔

میں نے سوچا یہ فوج کا حوالدار ہو گا۔ اس نے ہمیں اترتے دیکھ لیا ہے اور فردار کرنے کو مشین گن کا برسٹ مارا ہے۔

میں نے کہا۔ ”وہ کھڑے کھڑے سو رہا ہے۔“

دوسری طرف فوج کا حوالدار دیوار سے ٹکا کھڑا تھا اس نے میری مخالف سمت میں دیکھتے ہوئے جمائی لی تھی۔ مداری جہاں دبکا بیٹھا تھا وہاں سے حوالدار کو دیکھ سکتا تھا۔ ”ہوں۔“ اس نے مطمئن ہوں کر سر ہلایا۔ دونوں میں سے کوئی بھی گارڈ چوکنہ نہیں تھا۔ یہ اطمینان کی بات تھی۔

مداری نے اپنے برمی شلو کے کی جیب میں ہاتھ پہنچا کر ایک چابی نکالی اور میری ہتھ کڑی کے تالے میں گھمائی۔ کچھ نہیں ہوا۔ حوالدار دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ مداری نے دوسری جیب سے دوسری چابی نکالی، گھمائی، کچھ ہوا۔ مگر وہ ہمارے حق میں نہیں تھا۔ لگتا تھا چابی پھنس گئی ہے۔ میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ میں نے دھڑکتے دل سے سوچا کہ حوالدار اگر ادھر گھوم جائے تو یقیناً وہ مداری کو دیکھ لے گا۔ دونوں مارے جائیں گے۔

مداری کی نظریں اور ہاتھ میری ہتھ کھڑی پر تھے اور میری نظریں حوالدار پر گڑی تھیں۔ مداری اپنی بوڑھی انگلیوں کے ساتھ چابی اور ہتھ کڑی سے جھوجھ رہا تھا اور اس وقت میں نے محسوس کیا کہ حوالدار ہماری طرف مڑ کر دیکھنے والا ہے۔ میرے حلق سے بے اختیارانہ خوف کی آواز نکلی اور ٹھیک اسی وقت کلک کر کے چابی گھوم گئی۔ مجھے یقین تھا یہ آواز حوالدار نے سن لی ہے۔ وہ میری طرف مڑا۔ اس کا ہاتھ ایل ایم جی پر جما ہوا تھا۔

حوالدار نے مجھے دیکھا۔ میں نے کانپتے لرزتے دل کے ساتھ اس سے آنکھیں ملائیں۔

وہ بولا۔ ”اوادھر کیا دیکھتا ہے؟“

مداری پھر اندھیرے میں دبک گیا ہو گا ورنہ حوالدار میرے ساتھ ساتھ اسے بھی دیکھ لیتا۔

”کیا دیکھتا ہے ادھر؟“ حوالدار نے پھر پوچھا۔

آواز میں مسکینی ڈال کر میں نے کہا۔ ”کیا دیکھوں گا“ دیکھنے کو اب رکھا کیا ہے؟“

”آرام سے دو تین گھنٹا گزار لے پھر تو بیڑا ہی پار ہے تیرا۔“

میں نے اداسی سے ہاں میں سر ہلایا اور گردن جھکالی۔ اندھیرے میں اکڑوں بیٹھا

”کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

مداری بولا۔ ”یہ جیل کی دیوار آگئی ہے۔ یہاں لوہے کا بڑا بھاری جال لگا ہے۔ میں نے۔ مطلب ہے کیا بدل کر کے ریچھ بنے بنے اس جال کو ایک جگہ سے ٹیڑھا کر دیا تھا۔ اندر آنے کی جگہ بنائی تھی۔ میں وہ جگہ ڈھونڈتا ہوں۔“

اندھیرے میں پانی کے ہولے ہولے بہنے کی آواز مداری کے ادھر ادھر ہاتھ چلانے کی شپ شپ کے سوا سنا تھا۔ جیل کی آوازیں یہاں نہیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بوڑھا آدمی تھا۔ ابھی کیا بدل سے گزرا ہے۔ میں کئی بار اسے دیکھ چکا ہوں کہ آدمی سے ریچھ اور ریچھ سے وہ دوبارہ آدمی کے قالب میں آچکتا ہے۔ تو اس قدر کم زور اور نڈھال ہو جاتا ہے کہ لگتا ہے دل کے دورے سے گزرا ہے۔ مگر اس وقت اس میں اتنا دم کیسے ہے کہ میری رہ نمائی کر رہا ہے۔ پانی کے ریلے میں ڈبکی لگا لگا کر جال تلاش کرتا ہے۔ یہ کیا قصہ ہے؟

مداری ایک بار شاید پانی میں جھکا پھر نکلا تو پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ ”مل گئی۔ یہی جگہ ہے۔ پر تم ہشیاری سے آنا۔ ہاتھ پیر نہ پھنسا لینا۔“

میرا ہاتھ تھا جسے مداری جھکا۔ پانی میں بیٹھ کر ٹیڑھا ترچھا ہو کر اس نے خود کو جال کے باہر کی طرف نکال لیا۔ میں ابھی اندر کے رخ تھا۔ ہاتھ کم سے کم ایک انچ موٹی لوہے کی سلاخ سے مس ہوا۔ میں نے اس سلاخ اور دوسری کے درمیان چھو کر فاصلے کا تعین کیا۔ سلاخوں کو ویلڈ کر کے چو خانہ بنادیا گیا تھا جس میں کوئی ہوشیار بلی ہی اگر اسے غوطہ لگانا آتا ہو تو گزر سکتی تھی۔ بلی سے بڑا کوئی جانور اس فولادی چو خانے سے نہیں گزر سکتا تھا۔

مداری نے جال کی دوسری طرف سے میرا ہاتھ ٹٹول کر دیکھا بولا۔ ”وہاں کدھر تلاش کر رہے ہو؟ نکلنے کا راستہ ادھر ہے۔“ اور اس نے میرے ہاتھ کا ہی چڑھی چکنی دیوار اور فولادی جال کے بیچ بنائے گئے رخنے تک پہنچا دیے۔ آتے ہوئے ریچھ مداری نے زبردست حیوانی طاقت سے مضبوط سلاخوں کو موڑ کر دیوار سے ہٹا دیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا۔ مشکل سے۔۔ بہت مشکل سے ترچھا ہو کر بدن کو سیڑھ سمنا کر اس رخنے سے نکلا جاسکتا ہے۔ لیکن ادھر ادھر زیادہ ہاتھ پیر چلانے، ڈھونڈنے تلاش کرنے میں خطرہ یہ تھا کہ خاص انداز سے مڑی ہوئی سلاخیں ہانہوں، بازوؤں، پیروں کو ایک ایسے گورکھ دھندے میں الجھا سکتی تھیں کہ جن سے مرنے کے بعد اس وقت نجات ملتی جب

مگر شاید ایسا نہیں تھا۔ کسی نے ہمیں دیکھا نہیں تھا۔ ابھی صرف میری غیر حاضری محسوس کی گئی تھی۔ دور کسی کے پکارنے کی آواز آئی اور جیل کا سائرن بھونڈی آواز میں چیخنے لگا۔

ہم مکمل تاریکی میں اور لا علمی کے احساس تحفظ میں تھے۔ مداری نے کمر کرپانی میں کھڑے کھڑے کہا۔ ”میرا ہاتھ پکڑ کر ہشیاری سے چلے آؤ۔ وقت نہیں ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مداری کا ہاتھ برف ہو رہا تھا۔ وہ اچھی خاصی رفتار سے بڑھ رہا تھا۔ اسے شاید گھپ اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہا ہوگا۔ میرے حساب سے سو سو اسو قدم چل کر وہ بائیں ہاتھ گھوم گیا۔ یہاں میں نے محسوس کیا سامنے سے بہر کر آتے پانی کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔

مداری بولا۔ ”جیل والے اپنے کھیت باغیچوں کے لئے باہر سے یہ نہر لائے ہیں۔“

میں نے ہوں کہہ کر مداری کی بات کی رسید دے دی مگر میرا ذہن کہیں اور تھا۔ صرف مداری ہی کو تو اس ہڈ کی موجودگی کا علم نہیں تھا جیل والوں کو اب تک معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہم کس جگہ سے غائب ہوئے ہیں اور کہاں نکلنے والے ہیں کیا عجب ہے کہ باہر زیر زمین نہر کے داخلے پر جیل گارڈز کی ایک استقبالیہ کمیٹی ہمارا انتظار کر رہی ہو۔

مداری شاید میرے خیال کی رو کے ساتھ ساتھ بھی چل رہا تھا کہنے لگا۔ ”جیل کا سب سے بڑا افسر آتے آتے دس منٹ تو لے لے گا۔ اس کے حکم سے ہی جیل کا بڑا پھانک کھلے گا۔ اور گارڈ لوگ نہر کے منہ پر پہرہ دینے کو آئیں گے۔ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ ہیں۔ اتنی دیر میں اگر ہم اپنی سواری تک پہنچ گئے تو سمجھو بچ کے نکل جائیں گے۔ نہیں جوا تو کھیل ہی رہے ہیں۔“

یہ اطمینان کی بات تھی کہ کہیں کوئی سواری آگے فرار کرانے کے لئے موجود تھی۔

ہمیں نہر کے داخلے کی جگہ تک پہنچنے میں تین چار منٹ لگ گئے۔ وقت پانی بن کر بہہ رہا تھا۔ اس اندھیرے میں ابھی اور کتنا چلنا ہوگا۔ اتنی دیر میں جیل والے کہیں باہر نہ پہنچ گئے ہوں۔

مداری رک گیا۔ اس کے یکایک رک جانے سے مجھے فکر ہو گئی۔ وہ آگے پانی میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

وہ میرے شانے پر اپنا بازو پھیلا کر جھول گیا۔ بہت کمزور آواز میں بڑبڑایا۔
”میرا بدن اب گرم ہوتا جائے گا شیر علی۔ کم زوری بڑھتی جائے گی۔ اتار شروع ہو رہا ہے۔ خیال کرنا۔“ وہ شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔

یہ اس نے کیا کہا تھا کہ اتار شروع ہو رہا ہے؟ کایا بدلنے کے بعد اس کی حالت جو ابتر ہو جاتی ہے وہ یہی اتار ہوتا ہو گا۔ میں نے اسے پوری طرح سنبھال لیا۔ مجھے معلوم تھا اب بہت دیر تک وہ کسی قابل نہیں رہے گا اور مجھے معلوم تھا اس تمام عرصے میں اس کا بدن آگ ہوتا رہے گا۔ میں نے سوچا۔ یہ عجیب طرح کی کیفیات تھیں کبھی وہ برف ہو جاتا ہے۔ کبھی آگ۔

میں مداری کو سنبھالے ہوئے کچھ دور نہر نہر چلتا رہا۔
میں نے سر اٹھا کر دیکھا تاروں کی ہلکی روشنی میں نہر کے ساتھ ساتھ چلتی ایک پگ ڈنڈی دکھائی دے رہی تھی۔ دائیں بائیں درختوں کے جھنڈ تھے۔

مداری کو سہارا دیے ہوئے بلکہ تقریباً گھسٹتا ہوا میں نہر سے نکلا اور پگ ڈنڈی پر آگیا۔ میں تیزی سے پگ ڈنڈی پر چلتا رہا۔ مداری نے بے ہوش بے حال ہونے سے پہلے جو کہا تھا میں نے وہ یاد کیا۔ اس نے کہا تھا۔ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ ہیں اتنی دیر میں اگر ہم سواری تک پہنچ گئے۔ اگر پہنچ گئے اس نے کہا تھا۔ اور یہ بات کہے ہوئے کتنی دیر ہو گئی؟ دس بارہ منٹ یا کچھ کم؟ اور وہ سواری کیا ہے؟ کہاں ہے؟
میں نے گزرتے وقت کی دہشت میں مداری کو اپنی پیٹھ پر لا دیا اور دوڑنا شروع کر دیا۔

دو تین پانچ سات منٹ گزرے ہوں گے یا اس سے کم یا زیادہ کیونکہ میں وقت کا اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا۔ ہم جیل سے زیادہ دور نہیں تھے۔ میں نے غور کیا اس عرصے میں سائرن کی آواز ہلکی مگر بے رکے سنائی دیتی رہی تھی۔ بہت ہوئے تو ہم میل بھر دوڑ ہو گئے۔ ایک میل کیا ہوتا ہے ان کے پاس تیز رفتار گاڑیاں ہیں اور مجھے معلوم تھا کہ ان کے پاس۔ پولیس کے تربیت یافتہ جرمن نسل کے کتے جن کا کام ہی فراریوں کا کھوج لگانا ہے۔

میں نے بھاگتے ہوئے بے حد تھکن اور مایوسی میں سوچا۔ یہ سب کچھ بے نتیجہ رہے گا۔ وہ میرے فرار کی اطلاع پاتے ہی میری کوٹھری میں پہنچے ہوں گے اور میرے پہنچے ہوئے کپڑے جوتے انہوں نے اپنے تربیت یافتہ کتوں کو سنکھائے ہوں گے تاکہ وہ

گوشت گل سڑ جاتا اور پانی کا ریلا ہڈی کو ہڈی سے الگ کر دیتا۔
مداری بولا۔ ”اب دیر مت کرو۔“

میں نے ڈبکی لگا کر سلاخوں کے بیچ سے نکلنے کو ایک بازو اور شانہ بڑھایا۔ دوسرا بازو ترچھا ہوا اور سلاخوں کے ٹیڑھے میڑھے جال میں الجھنے لگا۔ مداری کو ادھر خطرے کا احساس ہوا۔ کہنے لگا اگر ایک بازو ڈال دیا ہے تو فوراً نکالو۔ نہیں تو پھنس جاؤ گے۔“
میں نے بازو اور شانہ نکالتے ہوئے گھبرا کر پانی سے سر باہر کر لیا۔ مداری کی آواز آئی۔ ”دونوں بازوؤں کو پہلو سے چپکا کر مچھلی کی طرح اس جگہ سے پہلے آدھا بدن نکالو۔“

میں نے اس کی ہدایت کے مطابق کیا تو میں آدھا جال کے دوسری طرف تھا مگر نچلا دھڑا بھی باہر نہیں آیا تھا۔ بہت مخدوش زاویے پر جھکا ہوا تھا۔ میں ایک بار خوف سے لرز گیا۔ ”دونوں پیر اس پھندے سے کس طرح نکالوں؟ ادھر آگے تو کوئی گرفت کوئی ٹکاؤ نہیں ہے۔“

مداری میرے برابر آکھڑا ہوا۔ ”میں تمہیں اپنی پیٹھ پر لے کر آگے بڑھ جاؤں گا۔ خود سے کوشش مت کرنا۔ سمجھے؟ بدن کو ترچھا کر لو۔“

وہ آدھا پانی میں ڈوبا ہوا میرے سامنے آکر جم گیا۔ اس نے نرمی سے مجھے اپنی پشت پر لیا اور کہنے لگا۔ ”اپنا نچلا دھڑ مچھلی جیسا سمجھو یا اسے ڈھیلا چھوڑ دو۔ میں تمہیں نکال لوں گا۔“

اس کی پیٹھ پر چھو کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں برف کی سل پر آگیا ہوں۔ مداری کا پورا بدن انتہائی ٹھنڈا کیوں ہے۔ مداری نے بڑی مہارت اور مضبوطی سے مجھے اٹھائے ہوئے دو قدم آگے کی طرف لیے۔ میرے پیروں پنڈلیوں سے فولادی جال مس ہوتا ہوا پیچھے رہ گیا۔ مداری کی طرح میں پورا کا پورا جال سے نکل چکا تھا۔

اس نے آہستگی سے مجھے اتار دیا۔ ہم ابھی تک کمر کر پانی میں تھے۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ کہنے لگا۔ ”بس۔ یہ میری آخری حد تھی۔ آگے مجھے سہارا دے کر نلے جانا۔“ اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ ہاتھ اب برف جیسا سرد نہیں تھا۔ میں نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر اسے سہارا دیا۔ پیشانی چھو کر دیکھی۔ نہر کے فولادی جال سے مجھے ایک برف کے آدمی نے نکالا تھا اور اب مداری کا پیشانی گرم ہوتی جا رہی تھی۔ نہیں بلکہ تپنے لگی تھی۔

ی پر اس طرح لٹا دیا کہ اس کا اوپری دھڑ ایک طرف اور نچلا دھڑ ایک طرف ہو گیا۔
 نے کسی زندہ کو اس طرح گھوڑے پر لے جاتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بے
 شمداری کو کپڑا بھی اڑھا دیا تھا۔ دونوں گھوڑے سنبالے پگ ڈنڈی چھوڑ کر درختوں
 باڑیوں میں رستہ نکالتا میری رہ نمائی کرتا وہ تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔
 گھوڑے خوب آرام کیے ہوئے اور اچھی تربیت لیے ہوئے تھے۔ میرا رہنما وہ
 جوان تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کو چمکارتا ان سے بات کرتا چلا تھا۔
 میں نے سوچا اسے یہ بتا دینا ضروری ہے جیل والوں کے پاس کھوج لگانے
 لے کتے ہیں۔

میری بات سن کر وہ بولا۔ ”ہاں مجھے پتا ہے۔“

بڑے میاں کی طرف سے میں تشویش میں تھا۔ اسے اتنی خراب دختہ حالت
 میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے تشویش ظاہر کی تو گھوڑا میرے برابر لے
 یا کہنے لگا۔ ”بابا کی طرف سے مجھے بھی فکر ہے۔ اتنی محنت کا کام اس عمر میں اس کے لئے
 یک نہیں ہے۔ میں نے سمجھایا اور بھی لوگوں نے کہا پر وہ خود آنے پر تلا ہوا تھا۔ آگیا۔
 بدیکھو کیا ہوتا ہے۔“

وہ کہہ رہا تھا کہ ”دوسرے لوگوں“ نے بھی کہا تو میرا جی چاہا کہ پوچھوں
 دوسرے لوگ کون مگر سوچا ابھی تو میں خود اس شخص کو نہیں جانتا۔ دوسروں کے بارے
 میں پوچھنا مناسب نہ ہوگا۔

میں کو سومی کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر یہی کچھ سوچ کر چپ ہو رہا۔
 جنگل میں ہم کچھ دور نکل آئے تو ایک پہاڑی چشمہ سامنے دکھائی دیا۔ نوجوان
 نے مجھے اشارہ کیا اور اپنا گھوڑا اور بڑے میاں والا گھوڑا جس کی راسیں وہ خود تھامے ہوئے
 تھابڑھا کر چشمے میں چلانے لگا۔ میں نے اس کے کہنے پر اپنا گھوڑا بھی پانی میں چلانا شروع
 کر دیا۔

وہ اپنا جانور قریب لے آیا۔ مجھ سے بولا۔ ”میں نے تمہیں بتایا نہیں ویسے تم
 نو کچھ گئے ہو گے کہ ہم پانی میں اپنے جانور کیوں چلا رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔ اگر جیل والوں نے میرے پیچھے کتے لگا دیے تو اس طرح
 ہانی میں رہتے ہوئے ہم انہیں دھوکا دے کے نکل سکتے ہیں۔“
 بولا۔ ”ہوں۔ یہ ٹھیک کہا۔ کتے پانی میں ہماری بو نہیں اٹھاپائیں گے۔ ان سے

میری بو پہچان لیں پھر دو تین مسلح گارڈز کو کتوں کے ساتھ جیل کے گرد و پیش میں بھیج
 کر وہ لوگ آرام سے بیٹھ گئے ہوں گے۔ باقی کام ان کے نہ ہوتے بھی بڑی سرعت سے
 انجام پا جائے گا۔ ان کے کتے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں اپنی تلاش پوری کر لیں گے۔
 میں نے دور سے آتی سائرن کی بھیاںک ہو ہو اور جنگل کی سنسناہٹ پر حاوی
 کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی۔ یا یہ میرا وہ تھا؟
 نا۔ یہ کتے نہیں بھونکے تھے۔ کہیں قریب ہی گھوڑوں نے پھوں پھوں کر کے
 جیسے بیزاری کی آواز نکالی تھی۔

میں نے آواز کے رخ سرگھا کر دیکھا۔ گھنے نیم قد درختوں اور جھاڑیوں میں
 گھوڑے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک گھوڑے نے بے زاری سے پھر سانس لی تھی۔
 کیا فائدہ؟ ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔ میں رک گیا۔ یہ یقیناً جیل کے گرد پتھر و لنگ
 کرنے والی گھڑ سوار پولیس ہوگی۔
 مجھے رکا ہوا دیکھ کر گھوڑوں کے برابر سے کسی نے جیسے تصدیق کرنے کو پوچھا۔
 ”شیر کھال۔“ پوچھنے والے کا لہجہ رازدارانہ تھا۔ یہ پولیس نہیں ہو سکتی۔
 میں نے کہا۔ ”ہاں۔“

”یہ تو نے بابا کو اٹھایا ہوا ہے۔“ یہ سوال سن کر مجھے اطمینان ہوا۔ یہ مداری کا
 آدمی ہے۔

”ہاں۔ بابا ہے۔ پر اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”وہ زخمی تو نہیں ہے۔“ پوچھنے والا بے تابانہ آگے آیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ
 گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو گھوڑے اور تھے۔
 میں نے بتایا کہ نہیں مداری زخمی نہیں ہے۔ غشی میں ہے۔ اس کا بدن بہت
 تپ رہا ہے۔

گھڑ سوار ظاہر ہے سمجھتا تھا۔ اس نے بے فکر ہو کر کہا۔ ”اچھا۔ وہ سب ٹھیک
 ہے۔“

وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ تینوں گھوڑوں کی راسیں تھامے ہوئے درختوں کی اوٹ
 سے نکل کر پگ ڈنڈی پر آیا۔ اس نے گھوڑوں کو تھپک کر اپنی بولی میں کچھ کہا اور انہیں
 کھڑا چھوڑ کر تیزی سے میرے پاس آگیا۔ نوجوان آدمی تھا۔ اس نے مہارت سے مداری
 کو سنبھالا اور قریب والے گھوڑے کی راسیں تھامنے کا کہہ کر مداری کو گھوڑے پر بچھی

میں نے کہا۔ ”میں نہیں سمجھا۔“
 ”تمہیں نہیں خبر کہ بابا اس وقت سمجھو آدھا مر گیا ہے؟ اس بار دو گھنٹے تک ایسا ہی رہے گا؟“

میں نے کہا کہ ہاں مجھے خوب علم ہے۔ ایسا کوئی پہلی بار نہیں ہوا ہے سوا اس کے کہ بے ہوشی بے حالی اس دفعہ کہیں زیادہ گہری ہے اور یہ کہ یہ حالت میری دیکھی ہوئی ہے۔

کہنے لگا۔ ”بابا ارڈی کے سب سے بھاری قبیلے کا سردار ہے۔ یہ خبر ہے تمہیں؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں تو۔“ مجھے حیرت ہو رہی تھی جس بے نوامداری کو میں نے اپنے دانست میں بہت چالاکی سے کوئی نیشنل ہوٹل میں مہاراجہ بنا کر بٹھایا تھا وہ تو خود پیدا انٹی سردار تھا۔ مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ کاکیز بازار میں ہمارے گیسٹ ہاؤس کے بچے کچھ کھانے سے انکار کرنے والا یہ مفلس اور باوقار مدداری کسی بڑے بھاری قبیلے کا سربراہ ہے۔

میری رہبری کرنے والے نوجوان نے ٹھنڈی سانس بھری بولا۔ ”یہ سارے کھٹ راگ سے سرداری ورداری سے بابا اکتا گیا تھا۔ جیسے برس ہوتے ہیں ادھر مانگ یان میں۔ چھوٹا سا ہی شہر ہے۔ بابا نے کالج کھولا تھا۔“
 ”کالج؟“ میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔
 ”ہاں۔ بابا اس کا پرنسپل تھا۔ آکسفورڈ نام کی کوئی جگہ ہے بابا ادھر کا پڑھا ہوا ہے۔“

میں نے بے خیالی میں اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ آکسفورڈ؟ حد ہو گئی!
 نوجوان نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“
 ”کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آکسفورڈ تو بہت بڑی جگہ ہے۔“

”ہاں یہی تو میں بولتا ہوں۔“ وہ پوری بات نہیں سن پایا تھا آگے اپنی رو میں کہنے لگا۔ ”ادھر مانگ یان کے کالج میں بڑا پیسا لگا دیا ہے بابا نے۔ سب لگا دیا۔ وہ ادھر ہی رہتا تھا۔ قبیلے کے بہت سے نوجوانوں کو ادھر لے گیا ہے۔ ہم سب جنوں کو دھیرے دھیرے کر کے مانگ یان میں روکنا چاہتا تھا۔ پر بیٹا مر گیا تو اپنے پوتا پوتی کا اور قبیلے کا کھٹ راگ پھر ہاتھ میں لے لیا۔ لینا پڑا۔ کیا کرتا۔ خبر نہیں مانگ یان میں کالج ابھی چل

جان چھڑانے کی ایک ترکیب یہ بھی ہوتی ہے مگر تم نے یہ کیا کہا کہ اگر کتے پیچھے لگا دیے تو۔ اگر کیوں؟ کتے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“
 ”کیا؟“ میں پریشان ہو گیا۔

وہ بولا۔ ”ہاں میل بھر پہلے میں نے آوازیں سنی تھیں۔ وہ ٹھیک ہمارے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ اس وقت تک تو ٹھیک ہی آ رہے تھے۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کتے ہمارے پیچھے ہیں؟
 وہ ہلکے سے ہنسا بولا۔ ”حیران ہو گئے؟ ایسی کیا بات ہے؟ میں جنگل ہی میں پیدا ہوا ہوں۔ یہیں رہتا ہوں۔ اس لیے آواز نشان، بو اور ایسے دوسرے سب اشارے تم شہر والوں سے پہلے اٹھالیتا ہوں۔“

میں اسے کیا بتاتا کہ میری اب تک کی عمر جنگلوں میں گزری ہے مگر وہ ہر حال میں زیادہ با علم تھا۔ میں چپ ہو گیا اور اس فوری مصیبت کے بارے میں سوچنے لگا۔
 وہ بولا۔ ”بابا کو اب تو آرام کے پورے دو گھنٹے ملنا چاہئیں تبھی وہ زندوں کی دنیا میں واپس آئے گا۔ اس کے بعد ہی ہم ساتھیوں سے ملیں گے۔ دو گھنٹے سے پہلے اپنے ساتھیوں سے نہیں مل سکتے۔“
 ”ساتھی؟“

کہنے لگا۔ ”ہاں پورا قبیلہ ساتھ چل رہا ہے۔“
 ”ساتھ؟ کس کے؟ ہمارے ساتھ؟“
 وہ ہنسا۔ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ہاں اور کیا۔ آوازیں نہیں سن رہے؟ بکریوں کے ریوڑ سب سے زیادہ شور کرتے ہیں۔“
 میں نے خفیف سا ہو کر بکریوں کی آوازیں سننے کی کوشش کی پھر اسے کوشش فضول سمجھ کر ترک کر دیا۔

نوجوان قبائلی نے زیادہ شرمندہ نہ کیا۔ بولا۔ ”تم گھبرا کے بھاگے ہوئے آئے ہو۔ اگر آرام آرام سے چل رہے ہوتے تو میری طرح یہ آوازیں بھی سن لیتے۔“
 میں جاننا چاہتا تھا اس لئے پوچھا کہ مدداری کے ہوش بحال ہونے سے پہلے ہم کیوں قبیلے والوں سے نہیں مل سکتے؟
 بولا۔ ”سردار کو کم زور، کچا دیکھ کے لنگڑے گیڈر بھی سردار بننے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اس لیے۔“

ہمی سڑک منڈالے جاتی ہے پھر وہ اوپر دو شاخوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک شاخ بڑھے ہاتھ مڑ کر چین کی طرف نکلتی ہے دوسری بائیں ہاتھ گھوم کر اوپر ہندوستان کے رے آسام میں اہمال شہر سے جالمتی ہے۔ ہمیں پہلے برما کے شہر منڈالے میں رکنا ہے۔ برسات کا موسم ہم ادھر ہی منڈالے میں گزارتے ہیں۔ جاڑوں میں اور اوپر چلے گئے ہیں۔ اہمال کی طرف ہندوستان میں نہیں جاتے۔ ادھر بارڈر کے پاس میلہ بھرتا ہے۔ دو مہینے وہیں کاٹتے ہیں۔ ہر سال ایسا ہی کرتے ہیں۔“

کوئی دس منٹ تک بڑے میاں مٹی پر بے سدھ پڑے رہے، پھر کسمساکر، رٹ بدل کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں، قبائلی نے جھک کر تاروں کی روشنی میں ہاتھ کاچرہ دیکھا۔ دھیرے سے کچھ کہا تو بڑے میاں نے ہوں کہہ کر جواب دیا۔

نوجوان نے سہارا دے کر اٹھا کر بٹھا دیا۔

میں نے پوچھا ”کیسے ہو بابا؟“ انہوں نے ہاں میں سر ہلایا۔

بڑے میاں ٹھیک ہوتے جا رہے تھے۔

نوجوان نے زین سے بندھی پانی کی بوتل سے پانی دیا۔ جیب سے پکے خرے یا بخرے کی طرح کا کوئی پھل نکالا، کھانے کو دیا۔ بڑے میاں اسے منہ میں گھولتے ہیں۔ نوجوان نے ان کی پیشانی چھو کر اور نبض پر انگلیاں رکھ کر اپنا اطمینان کیا اور کہنے لگے ”اب چل سکتے ہیں۔“

بڑے میاں سہارے سے گھوڑے پر سوار ہوئے لیکن آگے اپنی ہمت سے نہ رہے۔

ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ ہم نے تیز رفتاری سے طے کیا۔

قافلے کی آوازیں مجھے آدھے میل سے سنائی دینے لگی تھیں۔ موسیقیوں کا شور لگایاں ہانکنے والوں کی آوازیں، کبھی بچوں کے بیدار ہو کر فیل مچانے کا شور اور کبھی لڑائیوں پر فلمی گیتوں کے بول بھی سنائی دے جاتے۔ فلمی گیت سن کر میں دل ہی دھڑکنے لگا۔ ایشیا کا کوئی سالک گھوم دیکھو۔ ہندوستان کی گانے والیوں اور گانے والی آوازیں تمہارا پیچھا کرتی رہیں گی۔ گیتوں کی زبان چاہے سمجھ میں نہ آئے دھنیں لہر لہند کی جاتی ہیں۔

ہم قافلے سے چند فرلانگ دور تھے تو گھوڑوں پر سوار دو قبائلی نظر آئے۔

انہوں نے تاروں کی ہلکی روشنی میں بھی پڑے میاں اور اپنے ہم قبیلہ نوجوان کو پہچان لیا

بھی رہا ہے کہ نہیں۔ تو اس لئے کہتا ہوں اسے اس کمزوری میں لے کے میں قبیلے میں نہیں جاسکتا۔ قبیلے کے دو چار گھر، ٹھکانے لوگوں کے، پہلے ہی سے بک کر رہے ہیں۔ کالج کھولنے پر ناراض ہیں کہتے ہیں ہزار برس سے ہمارا قبیلہ ارادوی دریا کی ترائی میں ہزار میل اوپر ہزار میل نیچے راج کرتا تھا اور اب اس بڑھے نے مانگ یان کے لعنتی قصبے میں پاٹھ شالا کھول کے ہمارے پاؤں میں بیڑی ڈالنے کا جتن کیا ہے۔

”دیکھو نا، بابا کو ہماری بہت فکر ہے اس کا بیٹا نہیں رہا تو ہمیں بے سردار نہیں رہنے دیا۔ دوڑا دوڑا آگیا۔ اس بات سے وہ ٹھکانے تین چار گھرانے اور جل گئے ہیں۔ سمجھ رہے تھے۔ یہ اب نہیں آئے گا بلکہ پوتا پوتی کو بلا لے گا۔ مانگ یان ہی میں رہے گا۔ تو یہ قصہ ہے! میں اسے ان دلالوں، بد معاشرین کے سامنے اس حالت میں نہیں لے جاسکتا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔

مداری کی بے ہوشی کو۔ مگر میں ایسے بھاری قبیلے کے زبردست سردار کو ابھی تک مداری کیوں کہہ رہا ہوں؟ تو ”بڑے میاں“ کی بے ہوشی کو ایک گھنٹا ہو چکا تھا کہ نوجوان قبائلی نے اچانک اندھیرے میں ایک جانب اشارہ کیا اور مجھ سے کہا۔ ”شیر کھانا! وہ اب تک ٹھیک آرہے تھے۔ کتے والے، پر وہ اب بھٹک گئے۔ ادھر دوسری طرف چل پڑے ہیں۔ پانی میں اتر کے اچھا کیا ہم نے پیچھا چھڑا لیا آؤ تیز چلنے کا وقت آگیا۔“ اور چشمے سے اپنا گھوڑا نکال کر دوسرے گھوڑے کی راہیں تھامے ہوئے وہ ہموار میدان کی طرف ڈیٹ پڑا۔

کوئی آدھے گھنٹے ہم نے تیز رفتاری سے راستہ طے کیا پھر ایک پہاڑی کا کناؤ دیکھ کر اس نے گھوڑے روک دیے۔ اپنے گھوڑے سے کود کر اترا، مجھے مدد کا اشارہ کیا اور بڑے میاں کو جواب تک جانور کی پشت پر بے سدھ پڑے تھے سنبھال کر اتار لیا۔ اس نے انہیں مٹی پر سیدھا لٹا دیا تھا۔ میں نے پیشانی کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ بڑے میاں کی بدن کی حرارت معمول پر آتی جا رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ کراہے بھی تھے۔

قبائلی مطمئن تھا کہنے لگا۔ ”پاؤ گھنٹے میں ایسا ہو جائے گا کہ ہم بابا کو گھوڑے پر بٹھا کے لے چلیں گے۔ قافلہ بہت ہوا تو ادھر سے دو میل دوری پر ہوگا۔ دن اوگنے سے پہلے ہم کو بڑی سڑک پر آجائے۔“

”بڑی سڑک“ میں نے پوچھا۔

کہنے لگا ”رنگوں سے دوسرے نمبر کا شہر ہے منڈالے۔ راج دھانی رنگوں سے

جیوں گا آپ کا یہ احسان نہیں بھولوں گا مجھے جیل سے نکال کر آپ نے نئی زندگی دی تو کہنے لگے۔ ”سوچ رہا تھا تمہیں کسی دھوکے میں نہ رکھوں۔ سب کچھ بتا دوں۔ یہ جو نے کیا ہے اور کرنا چاہتا ہوں یہ بے غرضی میں نہیں تھا۔ میری اپنی بہت بڑی غرض می ہوئی ہے تم سے۔ وقت آنے پر پوری بات خود ہی سمجھ میں آجائے گی۔ اس وقت اور الجھن آپڑی ہے۔ قبیلے کے کچھ لوگ ہیں۔ بہت تھوڑے ہیں مگر مضبوط اور بااثر۔ وہ برسوں سے میری مخالفت کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”جی۔ معلوم ہے۔“

بڑے میاں بولے۔ ”میں تین روز سے ان کے ساتھ نہیں ہوں۔ تمہارا کھوج نے، جیل سے نکالنے میں لگا ہوا تھا۔“

تین دن! میں کیا کہتا احسان مندی میں سر جھکائے چلتا رہا۔

کہنے لگے ”ان تین دنوں میں میرے مخالفوں نے قبیلے کے لوگوں میں بے چینی بے اعتمادی بہت بڑھا دی ہے۔ بڑی عمر کے لوگ پہلے ہی شکوہ کرتے رہتے ہیں۔ اس ت لگتا ہے میرے خلاف بغاوت کی سی فضا بن گئی ہے۔ نوجوان سب میرے ساتھ بڑھے اور درمیانی عمر کے باغی ہو گئے ہیں۔“

”کیا کیا ہے انہوں نے؟“

”ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا ہے۔ دو گاڑیاں ہیں جن میں رائل، میگزین اور ایسی چیزیں چھپائی گئی ہیں۔ دونوں مخالفوں کے ”سپرے“ میں آگئی ہیں۔“

میں اس نئی افتاد کے لئے تیار نہیں تھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

میں نے پوچھا۔

مجھے بہت پریشان دیکھ کر بڑے میاں نے تسلی دی کہنے لگے۔ ”دنیا ہے یہی ب چلتا رہتا ہے۔ یہ جھوٹی موٹی جنگ ہے۔ دوسرے طاقت اور قبضے کے لئے مجھ سے لگاڑا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور مجھے اپنے بچوں کے لئے نیا راستہ بنانا ہے۔ قبیلے کی راری پر کسی اور وجہ سے قبضہ نہیں رکھنا چاہتا۔ میں نئی عمر کے لوگوں کو ان بد معاشوں گرفت سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔ وہ بچوں کو خانہ بدوش اور جاہل رکھنا چاہتے ہیں تاکہ لٹکریوں کی طرح ہنکاتے رہیں، ان کی محنت کے پھل خود سمیٹتے رہیں۔ میں یہ نہیں اسنے دوں گا۔ جب تک زندہ ہوں۔ جب تک بھی ہوں۔ پر کوئی زیادہ وقت نہیں ہے۔ اسے پاس۔“

تھا۔

قریب پہنچے تو میں نے دیکھا دونوں نو عمر لڑکیاں تھیں۔ دونوں نے کانڈھے پر رائفلیں ٹانگ رکھی تھیں۔ وہ سیدھی بڑے میاں کے پاس پہنچیں۔ ایک نے اپنے سردار سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ بڑے میاں نے غور سے سنا اور ساتھ آنے والے قبائلی کو کچھ ہدایتیں دیں۔ وہ اندھیرے میں گھوڑا دوڑاتا ایک لڑکی کے ساتھ چلا گیا۔ دوسری ہمارے ساتھ چلنے لگی۔

بڑے میاں اپنا گھوڑا میرے قریب لے آئے۔ لڑکی ہم سے آگے ہو گئی۔ اتنی دور چلی گئی کہ ہم دونوں کی باتیں نہ سن سکے۔

بڑے میاں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”شیر علی! لڑکے نے تمہیں بتا دیا ہوا

میں کون ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔ اگر آپ خود سے بتاتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔“

کہنے لگے۔ ”تم اچھے دنوں میں ملتے تو میں خود سے مانگ یاں کالج کا ذکر کرنا کرتا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر سب کچھ دکھاتا بھی۔ اپنے ساتھ رکھتا۔ بڑی محنت سے ہم سب نے اپنے لیے ایک جگہ بنائی ہے۔ میرے ساتھ تم جیسے بہت سے نوجوان ہیں۔ کوسوی اس وقت وہیں ہے مانگ یاں کالج کی لڑکیوں کے ہاسٹل میں ٹھہری ہو ہے۔ تمہاری امانتیں سب محفوظ ہیں۔ وہ خیال سے سنبھالے ہوئے ہے سب کچھ۔ یا کے معاملوں سے فارغ ہو کے وہیں جائیں گے۔ مانگ یاں۔ سمجھ؟ اپنی چیزیں تم سنبھال لینا۔“

میں نے کہا۔ ”چیزوں کا ذکر آپ کیا لے بیٹھے۔ میں تو چاہتا تھا ہم تینوں آ کوسوی اور میں کسی طرح خطرے سے دور ہو جائیں۔ وہ سب مال دولت جو بھی ہے وسیلہ بن گیا تھا۔ یہاں سے نکلنے کا۔ اب دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔“

بڑے میاں بولے۔ ”میں نے تمہیں جیل سے نکال کر ایک خاص مقصد اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر اب لگتا ہے مجھے کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ اور وقت میرے پاس اب بالکل نہیں ہے۔ تم نے دیکھا کایا بدل پیچھے اس بار میری حالت کیا ہے۔ سمجھو تلواریں دھار جیسی باریک سرحد سے لوٹ کے آیا ہوں۔ ایک قدم آگے جاتا تو اس بار زندہ نہیں لوٹتا۔ یہ سب کچھ اب زیادہ چل نہیں سکتا۔“

میں نے کہا زیادہ پریشان نہ ہو۔ انہیں تسلی دی اور شکر گزاری میں کہا کہ

اتار اور فرش پر بیٹھالیا۔
میں نے دیکھا یہ قبیلے کے سیاہ شلو کے اور تہہ جیسے سیر ونگ یا لاپے میں ملبوس لڑکی تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں معذرت کی۔ ”ما بچی کرنا۔ ادھر نہیں تھری جاگہ ادھر۔۔۔ ہے۔“

میں نے بری میں کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ نیچے اوپر جہاں بٹھاؤ گی بیٹھ جاؤں گا۔“
وہ ہلکی آواز میں ہنسی۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی ٹھیک ٹھاک بری بولوں گا۔

باہر گھوڑوں کے سر پٹ دوڑ جانے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے ایک آواز اور سنی۔ یہ کتوں کے بھونکنے کی آواز تھی۔ کتوں کی آواز دور سے آرہی تھی مگر اس فاصلے سے بھی میں پہچان سکتا تھا۔ کھوج اٹھانے والے جرمن نسل کے کتے بھونکتے آرہے تھے۔

بڑے میاں کے جلدی کرنے کی وجہ سمجھ میں آگئی اور یہ کہ انہوں نے سوار ہونے کو کیوں کہا تھا۔

ہم سفر بری لڑکی میرا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کے فرش سے اٹھی سرگوشی میں بولی۔
”اس گاڑی کے فرش میں چھپنے کی جگہ ہے۔ ایک منٹ کے لئے سیٹ پر بیٹھو میں جگہ تیار کر دوں۔“

میں سیٹ پر جا بیٹھا اور اسے بہت مستعدی اور تیزی سے کام کرتے دیکھنے لگا۔
اس نے فرش پر بچھا قالین کا ٹکڑا اٹھلایا۔ قالین کے نیچے ایک تختہ جو فرش میں خوب جڑا ہوا دکھائی دیتا تھا اس نے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ نیچے محفل بچھی ایک پر تکلف قبر سی دکھائی دی اس میں ایک تکیہ بھی پڑا تھا۔

لڑکی نے اشارہ کیا۔ ”یہ تمہارا بستر ہے۔ آؤ لیٹ جاؤ۔“
میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”میں لیٹ جاؤں گا تو تم اوپر تختہ جما کر قالین بچھا دو

کہنے لگی۔ ”ہاں۔“
”میرا دم نہیں گھٹ جائے گا؟“
وہ ہنسی۔ قبر میں نیچے ہاتھ پہنچا کر اس نے ایک قیف سی نکالی۔ قیف کے سرے

میں نے تاسف کے ساتھ کہا۔ ”میری وجہ سے آپ کی مشکل اور بڑھ گئی۔“
بڑے میاں بولے۔ ”ہم پہلے ہی سے بڑی مشکل میں تھے۔ اگر میرا حساب ٹھیک بیٹھا تو ہو سکتا ہے تمہاری وجہ سے ہماری مشکلیں حل ہو جائیں۔“
میں نے دھیرے سے کہا۔ ”جو کچھ میرے لائق ہو بتائیے۔“

اور اس وقت میں نے سامنے اندھیرے میں ایک بھاری بھر کم ہیولا سا بے آواز اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کے آگے آگے دو سائے مشقت کی سانسوں کے ساتھ اسے آہستہ آہستہ کھینچے لارہے تھے۔

میں نے اندھیرے میں نظریں گڑا کر خاموشی کے ساتھ آنے والی اس چیز کو پہچاننے کی کوشش کی۔

ایک بے ڈھب اونچی سی پہنے لگی کشتی جیسی گاڑی کو دو قوی بھینسے کھینچے ہوئے لارہے تھے۔ موٹر کے ٹائروں کی وجہ سے اس کے چلنے کی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ صرف بھینسوں کی پر مشقت سانسیں اڑدھے کی پھنکار کی طرح سنائی دیتی تھیں۔

بڑے میاں نے کہا۔ ”لڑکے گاڑی لے آئے ہیں۔ تم یہ گھوڑا چھوڑ دو گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ جلدی!“ ان کا لہجہ سردار قبیلہ کا لہجہ تھا۔ میں نے اس کشتی نما بھینسا گاڑی کے سامنے گھوڑا روک دیا اور اتر پڑا۔

گاڑی لانے والا نوجوان اچھل کر میرے گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے سر پٹ دوڑاتا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

بڑے میاں نے تازیانے کی طرح چٹخے لہجے میں مجھ سے کہا۔ ”کھڑے کیا؟“
”بیٹھو۔“

وہ نرم خود آدمی تھے۔ اس لہجے میں مجھ سے ابھی تک بات نہیں کی تھی انہوں نے۔

کچھ الجھن کچھ شکوہ سادل میں لیے میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اونچی چٹنی کا مٹی کے تیل سے جلنے والا ایک لیپ اندر گاڑی کی چھت سے لٹک رہا تھا۔ بھینسا گاڑی اندر بہت فراخ اور کشادہ لگتی تھی۔ یہاں ریل گاڑی کی بنجوں جیسی سیٹیں اور سامان رکھنے کے خانے تھے اور گاڑی کی دیواروں میں بنی الماریاں تھیں۔ اندر کی روشنی ذرا بھی گاڑی سے باہر نہیں جاسکتی تھی کمالے رنگ کے پردے کھینچے ہوئے تھے۔
میں تو اندر پہنچتے ہی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا مگر کسی نے ہاتھ بڑھا کر مجھے سیٹ سے

ہیں گاڑی کو چھوڑ کر اب وہ نہیں بیٹیں گے۔ یہ لوگ مجھے فرش میں کب تک بند رکھیں گے۔ جیل والے اور کتے اس گاڑی کو دن نکلنے تک گھیرے رکھیں گے۔ پھر دن میں وہ ہڑی کو ادھیڑ کے رکھ دیں گے۔ میں نہیں بچ سکتا۔ کوئی نہیں بچ سکتا۔

پانچ چھ منٹ یا دس منٹ کتوں کا یہ دیوانہ کرنے والا شور جاری رہا۔ سرد موسم کے باوجود اور پائپ سے آتی سرد ہوا میں سانس لیتے ہوئے بھی میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ آخر مجھے پکڑا جانا ہے اور اب جب کہ یہ لوگ مجھ تک اور قافلے تک پہنچ گئے ہیں تو بڑے ہاں بھی کس طرح ان کے چنگل سے بچ سکتے ہیں۔ ان کے دشمن جو قافلے میں ہیں کیا وہ نہیں سرکاری لوگوں کے حوالے نہیں کر دیں گے؟ ٹھیک ہے بڑے میاں اس وقت گھوڑا رہت بھگا کر نکل گئے۔ کچھ ہی دیر میں انہیں گھیر لیا جائے گا۔

مگر میں نے ایک آواز سنی اور میں جان گیا کہ بڑے میاں، قبیلے کے سردار ہیں گئے نہیں۔ اپنے مہمان اور اپنے لوگوں کے ساتھ ہیں۔

گاڑی کے پچھلے حصے سے ریچھ کے انتہائی غیظ و غضب میں چیخنے کی آواز آئی۔

بڑے میاں کا یا بدل کر ہماری گاڑی کے ساتھ چل رہے تھے۔ پھر گاڑی والے نے کتوں کے بھیاک شور سے بلند کرتے ہوئے اپنی آواز جیل کے اہل کاروں تک پہنچائی۔ وہ بہت غصے میں لگتا تھا۔ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”ارے اپنے ذل کو ہٹاؤ۔ یہ ریچھ کو زخمی کر دیں گے۔ ہٹاؤ انہیں۔ غریب تماشے والے کی اڑی ختم کرو گے کیا؟ ریچھ بے کار ہو گیا تو ہم بے کار ہو جائیں گے۔ کیوں ہماری اڑی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو رہے۔ ہٹاؤ انہیں۔“

کافی دیر تک کچھ نہیں ہوا۔ کتے اسی طرح گاڑی کو گھیرے رہے۔ گاڑی بان لڑا طرح فریاد کرتا، غصہ دکھاتا رہا۔

پھر کسی باختیار کی آواز نے مختلف احکام دیے اور پاگلوں کی طرح بھونکتے اے کتوں کو کھینچ کر گاڑی سے دور لے جایا گیا۔ وہاں سے بھی ان کے چیخ پکار کرنے، باتاب ہونے کی آوازیں آتی رہیں۔

کسی نے بلکہ، یہ اسی باختیار کی آواز معلوم ہوتی تھی کہا۔

”گاڑی سے اتر آ رہے۔“

یہ حکم گاڑی بان کو دیا گیا تھا۔ وہ اتر گیا ہو گا، حکم نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں

پر ربر کا پائپ لگا تھا۔ یہ قیف اس نے میرے چہرے کے سامنے کر دی۔ ”دم نہیں گھٹ سکتا۔ اس میں سے تازہ ہوا آتی ہے۔“ فر فر ہوا چلی آرہی تھی۔ اس نے اپنی لمبی بانہ پھیلا کر گاڑی کی دیواروں سے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ بولی۔ ”یہ ربر کا پائپ یہاں سے ہوتا ہوا گاڑی کی چھت سے باہر نکلا ہے۔ روشنی میں دیکھنا بالکل چینی کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ بنا بھی چینی کی طرح ہے اگر بارش ہونے لگے تو ایک قطرہ اندر نہیں آئے گا۔ ہوا آتی رہے گی۔ چلو بس جلدی لیٹ جاؤ۔“

میں کیا کرتا۔ مسکراتا ہوا اس آرام دہ مگر پریشان کر دینے والے کھانچے میں جا بیٹا۔

تختہ بند کرنے سے پہلے وہ آہستہ سے مسکرا کر بولی۔ ”تم اندھیرے سے تو نہیں گھبراتے، بس اندھیرا ہو گا اندر مگر اندھیرا تو باہر سب جگہ ہے دن نکلے گا تو کچھ روشنی ہو جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”کیا اتنی دیر چھپنا پڑے گا، دن نکلنے تک؟“

”کیا پتا؟“ اس نے قیف میرے منہ پر ڈھک دی، پھر تختہ رکھ دیا۔ اندر مکمل اندھیرا ہو گیا۔

مگر باہر کی آوازیں برابر سنائی دے رہی تھیں۔

گاڑی ہانکنے والے نے اونچی آواز میں کوئی برمی دیہاتی گیت گانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے ہمارا تعاقب کرنے والے قریب آگئے ہیں۔ گاڑی۔ انہیں سنانے کو گارہا ہے مگر جلد ہی گانے پر حاوی ہوتی ہوئی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سن کر گاڑی والے نے گانا بند کیا۔

اور اگلے ہی لمحے جیسے جہنم کے دروازے کھول دیئے گئے۔ جیپ گاڑیوں کے زلیں کرتے انجن، ہوائی فائر اور لوگوں کے خبردار کرنے کے آوازے، گاڑی والے کی فریاد اور ان سب سے بلند جیل سے کھوجی کتوں کی شیطانی آوازیں۔

میں نے سوچا، بڑے میاں فرار ہو چکے ہیں۔ گاڑی پر میرے سوار ہونے کے بعد میں نے گھوڑوں کے سر پٹ دوڑنے کی جو آواز سنی تھی تو یہ بڑے میاں اور ان کی باڈی گارڈ اس راسفل والی نوجوان لڑکی کے گھوڑے ہوں گے۔

کتوں نے اور جیل کے گارڈز نے ہماری بھینسا گاڑی کو پوری طرح گھیر لیا تھا۔

یہ بڑے میاں نے کس طرح کا انتظام کیا ہے؟ کھوجی کتے تو میری بو پر آئے

بااختیار آواز نے سوال کیا۔ ”ہاں رے کہاں چارہا ہے؟
کون کون ہے گاڑی میں؟“

گاڑی والے نے بتایا کہ سال کے سال اس کا قافلہ ہندوستان کے سرحدی علاقے امپھال کے قریب برمی سرحد تک جاتا ہے۔ میلے میں شریک ہوتا ہے۔ اس وقت وہیں جارہے ہیں اور گاڑی میں وہ خود ہے اس کی بہن ہے اور باہر یہ رچھہ ہے۔

انفر نے کہا۔ ”بہن کو اپنی نکال گاڑی سے، بلا اسے باہر۔“

گاڑی بان نے لڑکی کو آواز دی وہ ”ہاں رے ہاں“ کہتی ہوئی گاڑی سے اتر گئی۔ اترنے سے پہلے اس نے مجھے حوصلہ دینے کو فرش پر پیچھلی دی تھی۔

باہر سے اسی انفر کی تعریف کرتی ہوئی لیچر بزاری سی آواز آئی۔ ”آہا۔ ہا۔ یہاں چھپا کے رکھا ہے اپنی بہن کو۔ اوہو ہوہو۔ کھوب چیز ہے!“

گاڑی بان کی مسکین سی مگر ڈنک مارتی ہوئی آواز آئی۔ ”ہاں دوسرے کی چیز ہوتی ہیں یہ، بہنوں کو تو اسی طرح چھپا کے رکھنا ہوتا ہے صاحب! آپ بھی چھپا کے ہی رکھتے ہو گے۔ چوبارے بٹھا کے تو نہیں تارکتے ہو گے اپنی بہنوں کو۔“

”کیا بکتا ہے!“ جیل کے انفر نے یا تو اسے پھپھڑ مارا تھا یا چابک۔ زبردست کڑک سی سنائی دی تھی۔

گاڑی بان نوجوان کی مسکین آواز سنائی دی۔ ”ناراض کیوں ہو گئے؟ کیا کچھ غلط

کہہ دیا؟“

”پکڑ لو اس۔۔ کو۔“ جیل انفر نے گاڑی بان کو گالی دیتے ہوئے حکم دیا۔

وہ زیادہ سے زیادہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ گاڑی بان جیسے اس کی نادانی پر ہنستے ہوئے بولا۔ ”آپ دردی والے ادھیکاری (بااختیار انفر) لوگ ہو۔ سرکار کے لئے کام کرتے ہو ہماری جان اور عزت کو آپ سے تو کوئی خطرہ نہیں۔“

”مارو سالے کو۔“

کسی نے شاید بید سے ضرب لگائی تھی اس کی آواز کے ساتھ ہی رچھہ کے بہت غصے میں چیخنے کی آواز آئی۔ وہ گاڑی بان پر ہونے والی زیادتی پر سخت برہم ہوا تھا۔

گاڑی بان بولا۔ ”رچھہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ مارنا پینٹا ہے تو مجھے دوسرا طرف لے جا کے مارو پیٹو بھیا۔ نہیں یہ بلبلا تا، آپ لوگ پر غصہ کرتا رہے گا۔ کھلا

ماکھاں۔“

لڑکی نے کہا۔ ”ایسا کیا قصور ہوا ہے جو آپ لوگ بھیا کو مار رہے ہو؟ خواہ

خواہ!“

”تو چپ رہ!“ انفر نے کڑک کے کہا۔

گاڑی بان کی آواز آئی۔ ”ہاں ہاں ری چپ رہ! ادھیکاری لوگ ہیں ذرا اوپر غصہ کر کے بک جھک کے چلے جائیں گے۔“

”جائیں گے نہیں بیٹا۔ تجھے اور تیری اس۔ بہین کو لے کے جائیں گے۔“

”کیوں جی۔ کیوں لے کے جائیں گے؟“ دور کے اندھیرے سے یہ آواز آئی ہوگی۔ میں نے لکڑی اور ٹخمل کی اس پناہ گاہ میں لیٹے لیٹے محسوس کیا جیسے اس آواز کا رنگ مہر اسرخ ہے۔ یہ نیا بولنے والا، گاڑی بان کی طرح مسکینی سے نہیں بولا تھا۔ اس نے زیادتی کرنے والے کو جیسے اندھیرے کے پھیلاؤ سے ٹوکا تھا، چلیج کیا تھا۔

”تو کون ہے رے۔ سامنے آ۔“

”سامنے ہی ہوں صاحب!“ آواز اور ٹیکھی ہو گئی تھی اور قریب آگئی تھی۔

”ارے سامنے آ۔“ انفر جھنجھلاتے ہوئے جیسے ایک طرح کی بے بسی میں چینا۔

”یہ لو صاحب! آگیا سامنے۔“

”آہ! فوجی ہے۔ جب ہی ٹیڑھی طرح بات کرتا ہے۔ ایک بات یاد رکھ بھئی۔

ہم بھی باننے کے نوکر نہیں ہیں۔ سرکاری لوگ ہیں اور آفیسر ہیں۔“

”ہاں جی برابر آفیسر ہو۔ یہ لوگ آپ کا سلوٹ۔“ فوجی نے ہنستی آواز میں بات کی تھی اور کھڑک کر کے جیل انفر کو سیلوٹ مارا تھا۔

”چل سیلوٹ فلوٹ کو رہنے دے۔ یہ بتا ہمارے آڈر پر سوال کیسے کیا تو نے؟ تو اپنے کام سے کام رکھ ہمیں اپنا کام کرنے دے سمجھا بھئی؟“

”سوال نہیں کیا آپ کے آڈر پر۔۔۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب! اپنی ڈیوٹی بچائی ہے۔“

”تیری ڈیوٹی؟ ادھر؟ جنگل میں؟“

”ہاں جی۔ جنگل بیڑے، دلدل ٹیلے، جدھر بھی یہ لوگ قافلے والے جائیں گے ادھر ادھر ہم ڈیوٹی بجاتے چلیں گے۔“

جیل والے کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”قافلے کی ڈیوٹی؟ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے صاحب کہ بارڈر تک ساتھ جائیں گے۔ اس لئے کہ کوئی ان

”بورے ہیں۔ بھیا جی! سوکھی مچھلی کا شکاری جانور کا سوکھا گوشت ہے بھیا۔“
پہاڑی بان کی آواز تھی۔

”خ تیری تو! تھو سال! کیسا باس مارتا ہے۔“

اب گاڑی بان کے خوش مزاجی سے ہنسنے کی آواز آئی۔ ”راشن پانی ہے بھیا، ہم لوگ کا۔۔۔ اور کیا۔“

”اندر کوئی نہیں ہے، تو پھر کیوں کتے پاگل ہوئے جارہے ہیں؟ ایں رے؟“
انہر کسی ماتحت سے سوال کر رہا ہوگا۔ اس نے یہ سوال خود سے بھی پوچھا ہوگا۔
”صاحب یہ گوس مچھلی باس مارتا ہے۔ اس کے کارن دماغ کھراب ہو رہا ہوئے گا۔ سالوں کا۔“

”نہیں رے۔“ اب کوئی دوسرا سپاہی تھا۔ ”ارے ریچھ پر چڑھے آرہے ہیں کتے، دیکھا نہیں ہے۔ گاؤں میں مداری آتا ہے تو گاؤں بھر کے کتے بھونکتے ہوئے ریچھ کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔“

”بکواس کم کیا کرو تاں تک۔ چھابے جی! چلو اترو۔ ان کتوں کے منہ بند کرو۔ تو بڑے چڑھا دو۔ خوا مخواہ رات بھر سے دوڑائے پھر رہے ہیں۔ ڈیم اٹ!“
پریشان ہو کر سب لوگ گاڑی سے اتر گئے۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ ڈی ایس پی نے یہ اس فوجی سے کہا۔

اس نے فرماں بردار ماتحت کی طرح پوچھا۔ ”گاڑی کو جانے کوں صاحب؟“
”ہوں۔“

پھر کچھ دیر بعد جیپ کے ریس کرنے اور کتوں کے دیوانہ وار بھونکنے کی آوازیں آئیں۔ مخالف سمت میں جاتے ہوئے کتوں نے جنگل سر پر اٹھالیا تھا۔ یہ سب آوازیں دور ہوتی گئیں۔ جنگل کا سناٹا لوٹ آیا۔

میں نے اپنی ٹمبل کی پناہ گاہ میں مسکراتے ہوئے سوچا کہ ایک بار پھر میں بچا لیا گیا ہوں۔

اگر بڑے میاں ریچھ کی صورت میں اس گاڑی کے ساتھ ساتھ نہ ہو لیتے تو ان احمق جیل والوں کو مداری کے ریچھ اور گاؤں کے کتوں کی دلیل نہ سو جھتی اور وہ یقیناً گاڑی کو ادھیڑ کے رکھ دیتے۔ ظاہر ہے کتوں کا ٹرینز اپنے کتوں کو جانتا ہوگا اس نے ان جیل والے دیہاتیوں کو بے کار سمجھانے کی کوشش کی ہوگی کہ گاؤں کے کتوں اور اس

لوگ کو ستائے نہیں۔ ادھر میلے میں ساتھ رہیں گے۔ واپسی میں رنگون منڈالے روڈ پر لگا کے ہماری پلائٹون اپنی چھاؤنی کو لوٹ جائے گی۔“

”پلائٹون؟ تم بولتے ہو؟ پوری ایک پلائٹون ساتھ ہے۔“ جیل والا اب تو سے تم کرنے لگا تھا۔

”ہاں جی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ پوری جائے گی۔ آدھی پلائٹون تو کمین نہیں جائے گی۔“ فوجی نے جیل افسر کے احمقانہ سوال کا جیسے مذاق اڑایا تھا۔

”اچ چھا!“ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اس بات سے بھی پریشان ہو گیا کہ جیل میں فوج والوں سے جھک جھک تو ہو ہی رہی تھی اب ادھر جنگل میں بھی ہونے لگی۔

جیل والے نے جیسے پھر ”دم پکڑا“ سنو جی ایک قیدی جیل سے بھاگا ہے۔ ہمارے کھوجی کتوں نے یہاں تک کا کھوج اٹھایا ہے۔ کتے سیدھے اس گاڑی پر آئے ہیں۔ قیدی اسی گاڑی میں ہے۔ ہمیں تلاشی لینی ہے۔“

”نوجی صاحب! ضرور تلاشی لو، اور کوئی حکم؟ اصل میں صاحب! پلائٹون کمانڈر آگے آگے چلتا ہے۔ کوئی بات ہوئے تو پلائٹون کمانڈر کو وائز لیس کر کے پوچھتا ہوتا ہے۔ پر آپ سرکاری کام پر آئے ہو۔ آپ تلاشی لو آرام سے۔ چل بھئی ریچھ کو ہٹا ادھر سے صاحب کے آدمی گاڑی کی تلاشی لیں گے۔“ یہ آخری جملہ فوجی نے گاڑی بان سے کہا ہوگا۔

دونوں طرف ایک ہلکی پھلکی خیر سگالی کی سی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ گاڑی کی تلاشی میرے اور قبیلے والوں کے لئے کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ گاڑی بان کی آواز آئی۔ ”ریچھ ایک طرف بندھا ہے۔ آپ لوگ چڑھ جاؤ گاڑی پر۔ میں کھڑا ہوں ادھر۔“ کھڑ پڑ کر کے بہت سے آدمی گاڑی پر چڑھ گئے۔ گاڑی کے اندر بھلا کون تھا؟ انہوں نے سامان رکھنے کے ریک اور الماریاں کھول کھول کر دیکھیں۔ یہ آوازیں میں دم سادھے پڑا سنتا رہا۔

کسی نے یہ شاید ان کا وہی افسر ہو گا کہا ”گدیاں ہٹاؤ۔“ پھر سیٹوں کے قبضے لگے ڈھکنے اٹھا کر اندر جھانکا گیا ہوگا۔

ایک سپاہی نے اندر سے اونچی آواز میں پوچھا۔ ”او گاڑی والا۔ یہ کیا بھرا ہوا ہے سیٹوں کے اندر؟“

کے جرمن کھوجیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ٹریز کو یقین ہو گا کہ کتوں کے بھونکنے، مشتعل ہونے کی وجہ رچھہ یا سوکھے گوشت کے بورے نہیں ہو سکتے۔ وجہ کچھ اور ہی ہے بلکہ وجہ کچھ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے فراری کی بو اٹھائی ہے۔ اور بس۔

لڑکی اندر آن بیٹھی۔ گاڑی چل پڑی باہر گاڑی بان کسی سے دھیرے دھیرے بات کر رہا تھا۔ ایک بار کسی کے ہنسنے کی آواز بھی آئی۔ لڑکی نے مجھ پر کھنچے ہوئے تخنے کو ٹھکی دی اور ہٹا لیا۔ گاڑی کی ہلکی روشنی میں وہ مسکرا رہی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے اس آرام دہ قبر سے کھینچ کر باہر نکالا اور اپنے برابر سیٹ پر بٹھالیا پھر پرانے دوستوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے میرا شانہ پکڑ کر جھول گئی۔ وہ راز دارانہ ہنسنے جا رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس کے اس طرح ہنسنے جانے پر مجھے حیرت تھی۔

”چمکا دیا۔ پولیس والوں کو چلا دیا۔“

”اوہ! تو وہ سب چالاکی تھی۔ جو آیا تھا وہ فوجی نہیں ہے؟“

اسی طرح ہنسنے ہوئے بولی۔ ”بڑا بھائی ہے میرا۔ اسے فوجی وردی پہن کے رات میں قافلے کے آگے پیچھے گھومنے کا شوق ہے۔ کبھی اس طرح سب کی جان چھوٹ جاتی ہے۔ ایک بار پھنس بھی گیا تھا۔“

میں بھی ہنس پڑا۔

گاڑی آدھے گھنٹے اور چلتی رہی میزبان لڑکی نے بتایا کہ صبح ہونے والی ہے۔ سایہ دار درختوں تلے گاڑی روک دی گئی۔

لڑکی نے کہا کہ آجائو باہر کچھ دیر بابا کے پاس بیٹھیں گے۔ ہم باہر آئے تو دیکھا انہوں نے صاف ستھری جگہ کمبل ڈال کر بڑے میاں کو لٹا دیا ہے اور دونوں نوجوان آہستہ آہستہ بدن دباتے اور ان کے سر کی مالش کر رہے ہیں۔

مجھے اترتے دیکھ کر بڑے میاں نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تھا۔

میں نے کہا آپ نے ایک بار مجھے پھر بجالایا ہے۔ مہربانی ہے آپ کی۔ وہ دھیمے سے مسکرائے۔ کمزوری صورت سے عیاں تھی۔ ابھی اتنے بڑے جھینکے سے وہ سنبھلے ہی تھے کہ دوبارہ کایا بدلنے کے ہلا دینے والے تجربے سے گزرتا پڑا۔ تو اب بحال ہونے پھر کچھ دیر لگے گی۔

روشنی ہوتے ہوتے بڑے میاں کی قوت اتنی بحال ہو گئی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

لڑکی نے گاڑی سے سامان نکال کر قبوہ بنالیا تھا۔ تھوڑا کچھ کھا کر قبوہ پی کر قبیلے کے دونوں نوجوان اور لڑکی ہٹ گئے۔ بڑے میاں نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں کبل کے فرش پر آ بیٹھا تو کہنے لگا۔ ”یہ لڑکا۔ لڑکی تمہاری جتنی عمر کے یا تم سے کچھ بڑے ہیں۔ انہوں نے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ قبیلے کے آدمیوں سے منسنے کے لئے ان کا مشورہ اور مدد مجھے کافی ہو گی مگر اپنے آپس کے معاملے نمٹا کے ہمیں۔ مطلب مجھے نہیں کو سوچی کو آگے کا بھی کچھ سوچنا ہو گا۔ اس وقت میں چاہتا ہوں۔ ہم دونوں بیٹھ کر آگے کا سوچ لیں۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، مگر آگے شاید میرا آپ کا زیادہ دن کا ساتھ نہ رہے۔“

”کیسے؟“ بڑے میاں نے پوچھا۔

”یوں کہ اب جیسے ہی مجھے موقع ملا میں پاکستان کی طرف نکلنے کی کوشش کروں گا۔“

وہ بولے۔ ”یہ تو مجھے معلوم ہے۔“

”پھر؟“

بڑے میاں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھاتے ہوئے کہنا شروع کیا ”شیر علی! جو بات تمہیں نہیں معلوم۔ اور اب معلوم ہو جانا چاہئے وہ یہ ہے کہ میں دو تین دن کا مہمان ہوں۔ نہیں، نہیں پوری بات سن لو، بیچ میں مت ٹوکو۔ یہ بات میرے قبیلے کے ان لڑکوں لڑکیوں کے بھی علم میں ہے، کو سومی بھی یہ بات جانتی ہے۔ میں نے یہ سب باتیں جو اس وقت تم سے کہہ رہا ہوں کو سومی کو سمجھا دی ہیں۔ اس کی مرضی معلوم کر لی ہے۔ تمہیں جیل سے نکالنے سے پہلے ایک ایک بات اس لڑکی کو سومی سے کہہ سن لی ہے۔ میں جو کچھ کرنے والا ہوں اس پر کو سومی رضامند ہے مگر اصل رضامندی اور منظوری تمہاری ہے۔ تم نے اگر ہماری امیدوں کے خلاف فیصلہ کیا۔ تم رضامند نہ ہوئے تو اس صورت میں ہم کیا کریں گے ہم نے وہ بھی سوچ لیا ہے۔“

بڑے میاں دم لینے کو رکے۔ میں سوچنے لگا یا الہی مجھے بتائے بغیر میرے بارے میں کیا کیا سوچ لیا ہے ان داد پوتی نے؟

دم لے کر بڑے میاں نے بولنا شروع کیا۔ ”یہ کو سومی میرے اکلوتے بیٹے کی اولاد ہے۔ اب اکیلی بیوی رہ گئی ہے اسے اگر میں قافلے کے پاس چھوڑ کے رخصت ہوتا

ہے۔

بڑے میاں ہلکے سے مسکرائے۔ ”اچھا“ یہ تو تمہاری پہلی بات ہوئی۔ دوسری بات کہو کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”اگر کچھ ہو گیا آپ کو تو میں کو سوسے کو اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں گا۔ یہ وعدہ ہے میرا۔ میری ماں اس کی دیکھ بھال کر لے گی۔“

بڑے میاں کا چہرہ روشن ہو گیا۔ بولے، بڑی عمر ہو تمہاری۔ تمہاری ماں سلامت رہے بس مجھے یہی سننا تھا۔“

بڑے میاں نڈھال ہو کر پڑ رہے، دور سے نوجوانوں میں سے ایک نے جھانکا۔ بڑے میاں نے اسے دیکھ کر کمزوری سے اپنا ہاتھ اٹھا کر گرا دیا۔ لڑکا دوڑا دوڑا آیا۔ وہ کہنے لگے۔ ”اب چلنے کی کرو۔ ہمارے لوگ دور نہ نکل گئے ہوں۔“

قبائلی دوڑا دوڑا گیا۔ گاڑی لے آیا۔ لڑکی نے اور اس نے سہارا دے کر بڑے میاں کو سوار کر لیا۔ فرش میں بنے ختمل کے آرام دہ کھانچے میں لٹا دیا وہ دونوں لڑکے اور لڑکی باہر جا بیٹھے۔

میں ان کے قریب فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگے۔ ”باتیں کرو۔ کچھ اپنی اپنے لوگوں کی۔ یہ بتاؤ تم زندگی میں آگے کیا بننا چاہتے ہو؟“

مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ آگے کیا ہو گا، کیا بنوں گا۔ پاکستان کا مشرقی صوبہ بنے میں نے پیدائش سے اب تک اپنا گھر سمجھا، دشمنوں کی کارروائی کے بعد اب میرے لئے بد خانے سے بدتر ہو چکا تھا۔ صوبہ سرحد کا کوئی بھی شہر یا پنڈی، لاہور میرے وطن کے ہر تھے۔ یہ پانچ جیسے شہر میرے دیکھے ہوئے بھی تھے۔ مگر میں انہیں اس طرح یاد کرتا جیسے کوئی نورسٹ خوب صورت سیر گاہوں، ہل اسٹیشنوں کو یاد کرتا ہے۔ خوش ہو کر۔ رابہ تعلقی کے ساتھ۔ گھر کی طرح نہیں، گھر تو میرا سندرن بن میں تھا۔ یہ الگ بات کہ لدرین اور بہن بھائیوں کی وجہ سے میرا دل مجھے مالا کنڈ ڈویژن میں، صوبہ سرحد کے اس بولے خوب صورت گاؤں کی طرف بار بار کھینچتا تھا جہاں وہ سب، میرے پیارے جا بے غم۔ یہ وہ گاؤں تھا جسے یاد کر کے میرا پٹھنڈی سانس بھرتا تھا اور کہتا تھا کہ یار ایک لڑ جانا ادھر ہی ہے۔ میں نے یہی سب باتیں کہیں تو بڑے میاں اداسی سے مسکرائے بنے لگے۔ ”وطن، گھر، یادیں انسانوں کے ساتھ یہی قصہ ہے۔ ہاں تمہارے مسلمان لیوں نے اس بھید بھاد سے آدمیوں کو نکالنے کا کہیں کہیں جتن ضرور کیا ہے۔ تم نے

ہوں تو یہ سب لوگ۔ اسے قبیلے کی سرداری دینا چاہیں گے۔ بہت زور ڈالیں گے اور یہ بات اسے۔۔۔ میری پوتی کو پسند نہیں۔ سمجھو۔ یہ اس کے بس کا کام نہیں ہے۔ میں اگر اسے مانگ یاں میں رہنے دیتا ہوں تو بھی وہی بات ہے۔ سب مانگ یاں میں ڈیرا ڈال دیں گے۔ اس سے ہاں کر کے چھوڑیں گے، پھر ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ میرا برسوں کا کام مانگ یاں کالج سمجھوا کھاڑا بن جائے گا۔ سارے بھگڑے ادھر ہی اٹھیں گے۔ ادھر ہی نمٹا کر نا چاہیں گے۔ سب کے سب نئے گا کچھ نہیں میرا کالج ختم ہو جائے گا۔ یا تو پڑھنے والے، ہاسٹل میں رہنے والے بھاگ جائیں گے یا بری حکومت ادھر اپنے آدمی بٹھا دے گی، قبضہ کر لے گی۔ ہر صورت میں میرا کام برباد ہو جائے گا۔“

میں نے پریشانی میں سر کھٹانا شروع کر دیا۔ یہ بڑے میاں چاہتے کیا ہیں؟ اگر یہ ویسا چاہتے ہیں جس کا مجھے شک سا ہو رہا ہے تو وہ ممکن نہیں ہے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ تو سب میں سمجھ گیا۔ اب یہ بتائیے آپ نے سوچا کیا ہے؟“

بڑے میاں نے شکاری پرندوں کے پنچے جیسا اپنا ہاتھ میرے شانے میں مس کیا۔ ”شیر علی! میں چاہتا ہوں تم اسے، کو سوسے کو اپنے ساتھ نکال لے جاؤ۔“

”نکال لے جاؤ؟ کہاں؟“

”جہاں تم جا رہے ہو، وہاں لے جاؤ۔“

”مگر۔۔۔ میں۔۔۔“ میں گڑبڑا کر بڑے میاں کی صورت دیکھنے لگا۔

”میں تو پاکستان جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ صوبہ سرحد جاؤں گا۔ جہاں میرے گھر والے ہیں۔“

”ہاں تو ٹھیک ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ وقت آنے پر یہ اگر کہے، جہاں کہے، اس کا گھر بسا دینا۔ نہیں تو یہ تم لوگوں کے قریب کہیں رہ لے گی۔ آپ اپنی دیکھ رکھ کر لے گی۔ لڑکی ہشیار ہے۔“

بڑے میاں کی بات سن کر ایک بوجھ سا اتر گیا۔ یہ وہ نہیں چاہتے جس کا مجھے خدشہ ہونے لگا تھا۔

میں نے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ اتنے یقین سے آپ کیوں کچھ کہہ رہے ہو؟ اس وقت طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آرام کرو گے، دوا دارو کرو گے ٹھیک ہو جاؤ

سنا، پڑھا ہو گا۔ انہوں نے کئی کئی طرح کہا ہے۔ ایک مرشد گرو کہتا ہے کہ ہر ملک ہمارا ملک ہے کیوں کہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔ بڑی بات ہے۔ اگر آدمی سمجھ لے تو۔ چڑیوں کو دیکھا ہے تم نے سال بھر میں دنیا کا طواف کر لیتی ہیں۔ ہر نیا موسم نئے خطے میں گزرتی ہیں۔ ہزاروں ہزار میل پر مارتی نکل جاتی ہیں۔ ہر ملک ان کا ملک ہے۔ اس لئے کہ ان کے مالک کا ملک ہے۔“

میں نے سر ہلا کر ان کی بات سے اتفاق کیا تو وہ اچانک پوچھ بیٹھے ”شیر علی! تمہیں جانور کیسے لگتے ہیں؟“

”جانور؟“ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے دہرایا۔

”ہاں، ہرن، چیتے، شیر، ریچھ، باز، گدھ اور چڑیا۔ سب جانور لومڑی، سور، اژدھے، کتے۔ سب ہی۔“

میں نے کہا۔ ”مخلوق ہے خدا کی۔ یہ زمین ہم سب انسانوں، چوپایوں، پرندوں، کیڑوں کا ہم سب کا مشترکہ گھر ہے۔“

خوش ہو کر بولے۔ ”ٹھیک! اور جانوروں میں سب سے بھلا جانور کون سا ہے؟“

”سب ہی بھلے ہیں۔ مخلوق ہیں خدا کی۔“

”نہیں۔ اس طرح نہ کہو۔ یہ تو ہم پہلے طے کر چکے کہ سب کی زمین ہے کس لیے کہ اس ملک کی زمین ہے اور سب اپنے اس مالک کا مال ہیں۔ اب یہ کہو ان سب میں۔ سب ہی میں، ایک سب سے بھلا، من موہنا کون سا جانور ہے؟“

میں نے ایک دم کہا ”شیر۔“

بڑے میاں نے دہرایا ”شیر“ پھر بولے۔ ”شیر تو پھر شیر ہی شیر۔ تیرے مقدر میں شیر۔ بچ کے کہاں جائے گا۔ کون اپنے مقدر سے بچا ہے۔“

میرے بدن سے سردی کی لہر گزر گئی۔ کیا یہ کوئی پیش گوئی ہے؟ کیا کوئی شیر مجھے مار دے گا؟ ایک عجیب سے خوف نے مجھے گھیر لیا تھا۔ میں نے کچھ پڑھنا چاہا اس وقت کوئی دعا یاد نہ آئی۔



ایک آدھے منٹ گاڑی میں سنا رہا، پھر بڑے میاں کے دھیرے سے ہنسنے اور بڑبڑانے کی آواز آئی۔ ”واہ تیری قدرت! کیا تیری لیلیا ہے، بے ہو، میں پہلے ہی جانتا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا جانتے تھے؟“
بولے۔ ”یہی کہ جانوروں میں تجھے شیر سب سے بھلا لگتا ہو گا۔ تیرے مزاج میں شیر ہے۔“
”کیسے؟“

”دلیری، غصہ، سرداری..... یہ تیرے مزاج میں ہے۔“
”اچھا؟“

”جو جس کے مزاج ہیں، جس کے گھٹ میں بیٹھا ہوتا ہے، وہی اس کی کیا میں ہوتا ہے۔ جیسے میرے انتر میں، میری کایا میں ریچھ اترتا ہوا ہے۔“

”ریچھ؟“ میں بڑے میاں کی باتوں سے خوف محسوس کرنے لگا تھا۔

”ہاں ریچھ۔ طاقتور، ضدی، بے چین، مٹھاس کا لو بھی۔“

”بابا یہ مٹھاس کی کیا بات کہی؟“

”جنگل میں رہتے رہے اور جان نہ پائے یا بھول رہے ہو؟“

”ہاں۔“ مجھے یاد آیا۔ ”ریچھ شہد کے چتے ڈھونڈتا ہے۔ جانتا ہوں میں۔“

وہ گہری جاندار آواز میں بولے۔ ”پر تمہاری کایا میں شیر ہے۔ کچے سونے اور نارنجی رنگ کا کالی کا جل دھاری سے سجا۔ طاقتور، غصے میں بھرا، عزت دار، مغرور، سردار، آرام طلب، دلیر اور دلیر اور ایک بار اور بھی دلیر۔“

بڑے میاں نے یہ جو کچھ کہا، بہت جوش سے بلکہ شاید ایک طرح کی دیوانگی سے کہا تھا۔

کی آواز آئی۔

بڑے میاں نے آنکھیں کھول دیں۔ گاڑی چلانے والے نے راسیں کھینچ لی تھیں اور بھینسوں کا رخ موڑ کر گاڑی درختوں کے جھنڈ میں لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک اور فائر ہوا اور پچھلے سیدھے پیسے نے دھماکہ کیا۔ گاڑی اسی طرف جھک گئی۔ گولی نے ناز بھاڑ دیا تھا۔

بڑے میاں نے دھیرے سے کہا۔ ”اتنا سچا نشانہ جسکے کا ہی ہو گا۔ یہ پولیس والے نہیں ہیں۔ جسکے وہی بد معاش ہے جو کہتا ہے، میں نے کالج کھول کے برا کیا ہے۔ وہ لوگ تھہیاریوں پر قبضے کر چکے، اب دھماکے آئیں گے۔ شیر علی خان! مجھے باہر پہنچا دو۔ میں نہیں چاہتا اپنے گندے جوتوں کے ساتھ وہ میری اس گاڑی میں آئیں۔“

میں نے ہاتھ پکڑ کر سہارا دیتے ہوئے انہیں فرش کے کھانچے سے نکالا۔ اس وقت ہماری طرف سے دو فائر کیے گئے۔

بڑے میاں ہنسے۔ ”یہ میرے بچے جواب دے رہے ہیں۔ تمہیں ایک عجیب بات بتاؤں۔ جو لڑکا گاڑی ہانک رہا ہے، وہ جسکے کا بیٹا ہے۔ ابھی جو دو فائر ہوئے ہیں، ایک تو اسی نے کیا ہو گا، باپ کو ڈرا رہا ہے۔“

میں بڑے میاں کو سہارا دے کر گاڑی سے اتارنے ہی والا تھا کہ لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور رستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنی بری میں تیز تیز بولتے ہوئے بڑے میاں کو گاڑی سے اترنے کو منع کر رہی تھی۔ بڑے میاں نے ہاتھ کے بے چین اشارے سے اسے سامنے سے ہٹ جانے کو کہا۔ نوجوان اپنے سردار کی سلامتی کی طرف سے فکر مند تھے۔ لڑکی کہنے لگی کہ جسکے کے بیٹے کا خیال ہے، وہ بات کرنے نہیں آئیں گے اور انہوں نے یہ فائر ڈرانے کو نہیں کیے ہیں۔ باہر آنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں گاڑی سے ہی اڑ کر تے رہنا چاہیے۔

لڑکی یہ باتیں کر رہی تھی کہ اس کا بھائی دو رانگلیں اور میگزین اٹھائے جھکا جھکا باہر۔ وہ ہمیں دروازے میں کھڑا دیکھ کر سمجھ گیا کہ بڑے میاں گاڑی سے اترنا چاہتے ہیں۔ لانے بھی وہی کہنا شروع کیا جو اس کی بہن کہہ رہی تھی۔

بڑے میاں نے مجھے اشارہ کیا۔ ایک رانگل اور اضافی میگزین میں نے لے لی۔ سری رانگل لڑکی کی تھی۔ میں سنا سڑک کی طرف سے فائر تیز ہو گیا تھا۔ یہ اچھی امت نہیں تھی۔ میں نے بڑے میاں سے کہا۔ ”گاڑی میں ہی رہیے۔ یہ لوگ ٹھیک

کچھ دیر سکون سے پڑے رہے پھر بولے۔ ”کچھ جان کھینچ لیتا ہے، اس لیے برابر حرکت میں رہتا ہے اور ضدی ہے۔“

میں نے بے سمجھے ہاں میں سر ہلا دیا۔ وہ بولے۔ ”شیر جو بیس گھنٹے میں سو سو لہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے پڑا سوتا ہے۔ اپنی بھی دوسرے کی بھی جان روکے رکھتا ہے۔ بڑے بہت دن جیسے گا۔ بہت دن زندہ رکھے گا۔“

وہ ایک طرح کی آدمی بیداری میں خود سے باتیں کیے جا رہے تھے۔ میں چاہتا تھا، کچھ دیر وہ سولیں۔ وہاں سے اٹھنے لگا تو ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا، میں بیٹھا رہا۔

دھیرے سے بہت کمزور آواز میں بولے۔ ”سب پیسہ پورا اثاثہ مانینگ یاں کار میں لگا دیا۔ اب جو تمہیں کو سوئی کا سر پرست بنا کر اسے تمہارے سپرد کر رہا ہوں تو دیکھا ہوں میرے پاس دینے لائق کچھ نہیں۔ سونا، جواہر، جائیداد..... کچھ نہیں۔ بینک میں کچھ نہیں رکھا۔ سب کالج کے نام کر دیا۔“

میں نے تسلی دی۔ ”آپ نے خود دیکھا ہے کو سوئی کو جو دولت سنبھالنے کو دیا گئی ہے، وہ کتنی ہے۔ وہ میرے اپنے لوگوں کے کام آئے گی اور کو سوئی اب میرے اپنے لوگوں میں شامل ہے۔ میں اس کے لیے الگ سے بھی کچھ رکھ دوں گا۔ پھر کسی کا کوئی نقص نہیں رہے گا۔ کبھی بھی اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

کہنے لگے۔ ”پھر بھی۔ تمہارے پاس میرا دیا کچھ نہیں ہو گا۔ بس ایک ذمہ دار ہوگی اس لڑکی کی شکل میں۔ اس لیے میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔ کہو میں جو دوں؟ قبول کرو گے؟ بولو، لے لو گے مجھ سے؟“

میں نے مطمئن کرنے کو کہا۔ ”ہاں، لے لوں گا۔“

بڑے میاں کھل اٹھے۔ ”جیتے رہو مگر یہ بات، یہی بات کہ لے لوں گا، تمہیں ایک بار اور کہنی ہوگی۔ جس وقت میں ”ارپن“ کر رہا ہوں گا۔ دے رہا ہوں گا، تمہیں پورے سب کرنا ہو گا۔ کہنا ہو گا کہ میں نے وہ عطیہ لے لیا، خوشی سے لیا سمجھے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں کہہ دوں گا۔“

بڑے میاں نے اس کھانچے مٹھل کی اس ”قبر“ میں سے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تلاش کیا۔ وہ کچھ دیر اسے تھکتے رہے، پھر سو گئے یا یہ غشی تھی؟

ہماری بھینسا گاڑی کھلی ہوئی دھوپ میں ایک خشک برساتی نالے سے گزر کر جیسے ہی درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچی، اچانک بڑی سڑک کے رخ سے گولی چلے

مسکرا کر بولے۔ ”بد معاش قسم کے بوڑھے..... اصل میں وہ بگڑ گئے ہیں۔ میں نے میرے بیٹے نے وہ نہیں کیا جو ہم سے پہلے گزرنے والے سردار کرتے رہتے تھے۔“
”وہ کیا کرتے تھے؟“

”مخالفت کرنے والوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کے ارواڑی دریا میں بہا دیتے تھے۔“
”اوہ!“

”یہ دوسر داروں کے بچ کی گئی نرمی ہے جس نے ان نا سمجھ لوگوں کو سخت بنا دیا۔ وہ نرمی کا بدلہ نرمی سے دینا نہ سیکھ سکے۔ خیر شکوہ بیکار ہے۔ شیر علی! کچھ دیر پہلے میں نے کہا تھا، میں دو تین دن کا اور ہوں..... وہ بات غلط تھی۔ میں آج..... ابھی نہیں تو رات پڑنے سے پہلے مارا جاؤں گا۔“

میں نے کہا۔ ”ہنہ! یہ عجیب بات کہی آپ نے..... آپ ابھی بہت دن جنیں گے۔“

”سنو۔“ وہ لمحے بھر خاموش رہے، پھر بولے۔ ”میں جو ابھی گاڑی میں بات کرتے کرتے چپ ہوا تھا تو میں سو گیا تھا اور سوتے ہوئے خواب دیکھا تھا، تم نئی عمر کے، نئی سوچ کے آدمی ہو، خواب کو خواب میں دیئے گئے اشاروں کو نہیں مانتے ہو گے۔ ٹھیک ہے، ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میں تم سے کچھ بھی ماننے کو نہیں کہتا۔ صرف ایک خبر دے رہا ہوں۔ خبر یہ ہے کہ ایسے ہی درختوں..... شاید اسی درختوں کے جھنڈ میں ایک ریچھ، سر سے پیر تک کالا ریچھ آخری سانس لے گا اور کچے سونے کا اور نارنجی رنگ کا کالی کا جل دھاری سے سجا ایک دلیر، طاقتور، مغرور شیر غصے میں بھرا یہیں سے اٹھے گا۔ یہیں سے پہلی جست لے گا اور خوب چلے گا۔ جیتا رہے گا۔ یہ خبر مجھے خواب میں ملی ہے اور یہ خبر مجھے تمہیں سنائی تھی جو میں نے سنا دی۔“

یہ یقیناً ایک ہیجان زدہ بیمار اور تھکے ہوئے آدمی کی باتیں تھیں۔ پوری طرح بے ربط نہ سہی مگر خواب اور پیش گوئی اور یہ سب اشارے کہ میں کیونکہ شیر کو سب سے اچھا اپنا پسندیدہ جانور سمجھتا ہوں تو ایک شیر، دلیر، مغرور وغیرہ یہاں ان درختوں کی سایہ سے جست لگا کر نکلے گا..... شیر یہاں کہاں سے آئے گا؟“

میں نے بڑے میاں سے کہا۔ ”آپ تھوڑی دیر لیٹ کر آرام کر لیں۔ دیر سے انہوں نے فائر نہیں کیا ہے۔“

کہتے ہیں۔ ہمیں بلا ضرورت گاڑی نہیں چھوڑنی چاہیے۔“

وہ بولے۔ ”ہم بے ضرورت گاڑی نہیں چھوڑ رہے۔ شیر علی! تم اور اے لڑکی! تم مجھے کورنگ فائر دو۔ میں گاڑی چھوڑ کر سامنے درخت کی اوٹ میں جا رہا ہوں۔“
وہ ٹھیک کہتے تھے، واقعی بہت ضدی آدمی تھے۔ سب کے منع کرنے کے باوجود بڑے میاں لڑکھڑاتے ہوئے درخت کی طرف بڑھے۔ میں نے گاڑی کی اوٹ سے نکل کر ایک گھٹنا ٹیک دیا اور سڑک کے رخ فائر کرنا شروع کر دیئے۔ لڑکی میرے برابر سرک آئی تھی۔ اس نے بھی تیزی سے فائر کیے۔ پھر جب دیکھا کہ بڑے میاں درخت کی اوٹ میں پہنچ گئے ہیں تو ہم نے فائر روک لیا۔ لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ گاڑی کی اوٹ میں پوزیشن لے کر بیٹھ گئی۔ میں بابا کے پاس چلا آیا۔

وہ تنے سے ٹیک لگائے اس طرح بیٹھے تھے کہ سڑک سے آنے والے فائر کے اور ان کے بچ تین فٹ موٹا زندہ درخت کا تاتا تھا۔ میں ان کے برابر آ بیٹھا تو ہنس کر کہنے لگے۔ ”بچے سمجھتے ہیں، میں ان بد بختوں کے ارادے سمجھ نہیں پایا ہوں۔ میں جان گیا ہوں، وہ اب بات کرنے نہیں، گولی مارنے آئیں گے۔“

میں حیران رہ گیا۔ اگر ایسا تھا تو ہم گاڑی میں زیادہ محفوظ تھے۔ کیوں نکل آئے اور بڑے میاں نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں نہیں چاہتا، وہ بد معاش گندے جوتے لے کر گاڑی میں آئیں۔

میں نے یہی بات کہہ دی تو بولے۔ ”اس گاڑی میں، میں اپنے بیٹے کی ماں کو بچا کے لایا تھا۔ میں نہیں چاہتا، میرے اور ان بد معاشوں کے خون سے یہ گاڑی ناپاک ہو۔“
اپنے خون کا وہ اس طرح ذکر رہے تھے جیسے انہیں پورا یقین ہو کہ وہ خون ہے گا۔

میں نے پوچھا۔ ”اگر یہ صحیح ہے کہ مخالفت تین چار گھروں کے بڑھے اور ادبیلر عمر کے لوگ ہی کر رہے ہیں اور نوجوان سب آپ کے ساتھ ہیں تو یہ کیسے ہوا کہ وہ بد معاش لوگ اکثریت پر غالب آ گئے؟“

کہنے لگے۔ ”ہتھیاروں کے بل پر، ان بد معاشوں نے بچوں کو اچانک گھیر لیا ہو گا..... بے بس کر دیا ہو گا۔“

میں نے دھیرے سے کہا۔ ”یقین نہیں آتا۔ آدمی جیسے جیسے بوڑھا ہوتا جاتا ہے، نرم خو ہوتا جاتا ہے۔ آپ کے قبیلے میں یہ کس قسم کے بوڑھے ہیں؟“

”ہم گھر گئے ہیں شیر علی۔ وہ لوگ انہیں، تمہیں، ہمیں، کوسوی کو سب کو ماریں گے۔ ہم گھر لیے گئے ہیں۔ اب نکلنے کی کرو سردار، نکلنے کی کرو شیر علی سردار۔“

میرے سامنے سے ایک فائر ہوا اور بڑے میاں کا دایاں شانہ اور آدھا رخسار کے قدھاری اتار کی طرح پھوٹ کر میرے پیروں میں آگرا۔ ایک اور فائر ہوا۔ گولی ہرے چہرے سے تین انگلی دور سے نکل گئی۔ میں بیٹھا رہا۔ میرے پیروں کے پاس گرا ہوا خون میں نہلیا جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہوا بوڑھا لاغر بدن آخری جی وٹ کے ساتھ اٹھا، ہندی بڑے میاں نے کمزور مگر صاف لفظوں میں کہا۔ ”میں تمہیں شیر ارپن کرتا ہوں۔“

اور تب میں نے ہنکسوں کے غیرت مند خون کے ابال میں خدا کی قسم کھائی اور دہلیز میں نہائے اس دلیر بوڑھے کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے اور چیخ کر کہا۔ ”میں نے مرشد کے اپنے اتر کا شیر لے لیا۔“

یہ میرا وہم تھا یا میں نے دیکھا کہ بڑے میاں کے خونم خون چہرے پر گر جانے کے پہلے ایک مسکراہٹ آئی تھی۔

پھر وہ شاید میری میزبان لڑکی تھی جس نے دھکا دے کر مجھے درختوں تلے اگلی درگاہ پر گرادیا۔

میں نے ایک سیاہ غبار کو اپنے گرد گرد پھیلے اور غالب آتے محسوس کیا اور یوں دوس کیا جیسے ہزاروں بجلیاں ایک ساتھ میرے بدن میں چٹک کر تھیں۔ بجلیوں کی سنسنیہ زندگی بخش اور ساتھ ہی ناقابل برداشت تھی۔ میں چیخا۔

میں چیخا اور میں نے شیر کو دہاتے سنا۔ شیر بالکل قریب سے، میرے پہلو سے۔ نہیں میرے اندر سے دہاتا تھا۔

میں نے پھر ایک چیخ ماری۔ یہ ز شیر کی دھاڑ تھی۔ سندربن کاروئل بنگال بڑا دہاتا تھا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے مٹی سے اٹھتے ہوئے خود سے سوال کیا۔ میں ہاتھوں کے بل اٹھا تھا اور میری نظر اپنے ہی بچوں پر پڑی تھی۔

میرے بچے ادونوں بچے اب سنہرے اور نارنجی فرسے ڈھکے ہوئے تھے جس پر شیر دھاریاں تھیں۔ فر کے جیسے دو دستانے تھے اور اسٹیل کے چاقو جیسی دھاڑ والے سے ہوئے شیر تاخن ان بچوں سے نکل کر مٹی میں گڑتے جاتے رہے تھے۔ میں نے سر اگرایا پورا آپ دیکھا۔ میں تار شیر ہو چکا تھا۔

وہ کہنے لگے۔ ”اور کیا کرتا ہے۔ اب آرام ہی کرتا ہے۔ تم کہہ رہے ہو ان بد معاشوں نے دیر سے فائر نہیں کیا تو ابھی سن لینا۔ وہ گاڑیوں کو دھکا دیتے ہوئے خاموشی سے ادھر لارہے ہوں گے۔ ہمارے قریب آ کے چڑھ دوڑیں گے۔۔۔۔۔ خیر ان کی بات رہنے دو۔ یہ کہو میری بات سن لی اور سمجھ لی تم نے؟۔۔۔۔۔ نہیں شاید ابھی نہیں سمجھ پائے۔“

”کون سی بات؟“ میں نے ٹالنے کو پوچھا۔

”یہ بات کہ میرے جانے میں کم ہی وقت ہے شیر علی! بہت کم وقت۔ اب جو میں دینے والا تھا، تمہیں ارپن کرنے کو تھا، وہ سنبھالنے کا وقت آگیا ہے، لے لو۔ تمہاری امانت جانے سے پہلے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔“

”کیسی امانت؟“ مجھے ان کی باتوں سے خوف آرہا تھا۔

بڑے میاں نے گھور کے مجھے دیکھا۔ روکھے پن سے بولے۔ ”ٹالو مت۔۔۔۔۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ میں جو عطا کروں گا، جو بھی تمہیں بخشوں گا، تم اسے خوشی سے قبول کر لو گے۔“

وہ اب غصے سے کانپ رہے تھے۔ ”تم نے وعدہ کیا تھا، تو لو میں تمہیں تمہارے اپنے گھٹ میں بیٹھے تمہاری اپنی کیا میں اترے شیر کو، میں تمہارے شیر کو تمہیں ارپن کرتا ہوں۔ کہو شیر علی! کہو میں نے لیا، کہو لے لیا اور مٹی پر گر کر ایک بار شیر بن کر اٹھ کھڑے ہو شیر علی! کہو یہ کہو، میں نے لے لیا اور اٹھ کھڑے ہو شیر!“

”نہیں!“ میں نے اتنے ہی غصے سے کہا۔ ”نہیں۔“

بڑے میاں کی تمام تر قوت ان کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ اپنی آنکھوں کو پورے غیظ و غضب سے انگارہ کر کے انہوں نے چیخ کر حکم دیا۔ ”کہو کہ میں نے مرشد سے اپنے گرد سے اپنے اتر کا شیر لے لیا۔ کہو اور مٹی پر گر کے جن نی دھرنی پر گر کے شیر بن جاؤ۔ شیر نصیبوں والے۔“

”نہیں۔“

مجھے لگا جیسے بڑے میاں کسی اندرونی ضرب سے گھائل ہو گئے اور اب گرنے والے ہیں۔

میرے عقب سے ایک لڑکی کی تاسف اور خوف سے سسکاری سنائی دی۔ یہ وہی میزبان لڑکی تھی، وہ رو رہی تھی۔

میں نے سرت کا ایک نعرہ ایک دھاڑ ماری۔

میں اب شیر تھا۔

سامنے سے رائفلیں اٹھائے دوڑے آتے درمیانی عمر کے دو آدمیوں نے مجھے مجھ شیر کو درخت کے نیچے پورے قد سے کھڑے ہوتے دیکھا اور دھاڑتے سنا۔ وہ دونوں جیسے پتھر ہو گئے۔

ان سے رائفلیں الگ کرنا ضروری تھا۔ میں ان کی طرف چلا، قدم قدم چلا۔ وہ سانس روکے، آنکھیں کھولے تگے جارہے تھے جیسے مسمریزم کے اثر میں آئے معمول سب کچھ دیکھ بھی رہے ہوں اور کچھ کچھ دیکھ بھی نہ سکتے ہوں۔

میرا اٹھا ہوا پتھان سے ابھی چھ فٹ دور ہو گا کہ دونوں کے ہاتھ سے رائفلیں چھوٹ کر زمین پر گر گئیں اور وہ غیر انسانی دہشت میں اپنے حلق سے ہو اداو ادا کی آوازیں پیدا کرتے اٹے پیروں بھاگے۔

میں نے ایک اور دھاڑ لگائی۔ ان میں سے ایک گرا، دوسرا اس پر پیر رکھتا ڈنگا، سنبھلتا سڑک کی طرف دوڑ گیا۔ وہ دوڑنے والا اب چیخنے کے قابل ہوا تھا اور بے رکے چیخے جارہا تھا۔ شیر، شیر، شیر، شیر۔

میں نے سڑک اس گرے ہوئے کو دیکھا۔ اس کے یا دوسرے کے فائر نے بڑے میاں کی جان لی تھی۔ میرا جی چاہا ایک پتھان چلا کر اسے ختم کر دوں مگر وہ گرا ہوا تھا۔ میں جانور نہیں تھا، انسان تھا اور انسانوں میں دشمنی تک کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔

ہمارے ساتھ کی لڑکی پاس پڑی دونوں رائفلیں اٹھا رہی تھی۔ اس کے بھائی نے گرے ہوئے بد معاش کو جو بے ہوشی میں تھا، رسی سے باندھنا شروع کر دیا۔

میں سب دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔ یہ اطمینان دلانے والی بات تھی۔ میں فرار ہونے والے کے پیچھے جانا چاہتا تھا مگر لڑکی نے دیکھا اور گڑبڑا کر اپنے گبڑی ہوئی آواز میں پکارنے لگی۔ ”سردار، سردار، واپس، واپس۔ آگے نہیں جانے ہے۔ تاتا، واپس۔“

مجھے یاد آیا، اس طرح لوگ اپنے پالتو جانوروں سے کتوں وغیرہ سے بات کرتے ہیں۔

میں اگر ہنس سکتا تو ضرور ہنستا۔

میں واپس درخت کی اوٹ میں آ گیا۔ یہاں بڑے میاں کا جسد خاکی پڑا تھا۔

ان کا ٹوٹا پھوٹا خون آلودہ جسم بہت چھوٹا، کسی نو عمر لڑکے کا جسم لگتا تھا۔ زخمی یک رخنے چہرے پر ایسا اطمینان تھا جو میں نے اس چہرے پر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پر ان کی آنکھیں جیسے ایک حیرت میں کھلی رہ گئی تھیں۔ میں نے سوچا کاش میں اس وقت انسان کی جون میں ہوتا..... انسان کی جون میں ہوتا تو یہ آنکھیں ہاتھ بڑھا کر بند کر دیتا۔

یہ سوچنا ہی کافی تھا۔ میں نے سوچا اور میری کایا بدل گئی۔ بجلی کے ایک لشکارے میں جس سے شاید صرف میں چکا چوند ہوا تھا۔ میں نے خود کو درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے محسوس کیا۔ میں نے دیکھا، میں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہوں، شیر نہیں، اب میں پھر شیر علی تھا۔

لڑکی نے درخت کی اوٹ سے پکارا۔ ”شیر خان۔“

”ہوں۔“ اور میں نے ہاتھ بڑھا کر آہستگی اور احترام سے بڑے میاں کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔

لڑکی، جس کا نام بھی اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا۔ میرے پاس آئی اور گردن میں بائیں ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے بازو کے گھیرے میں اس کا سر لے کر آہستہ آہستہ سے تھپکنا شروع کیا۔ میں تسلی کے سوا اور کیا دے سکتا تھا۔ اس کا بھائی اور دوسرا نوجوان ہمارے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے تو میں نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے اور ان جوانوں کا ایک ایک ہاتھ تھام لیا۔

”حوصلہ کرو، حوصلہ میرے دوست۔“

لڑکی میرے برابر سے اٹھی۔ اس نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں ملیں اور گریے سے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”سردار! جو بھاگ گیا، وہ جیسے تھا۔ اس ہمارے ساتھی کا باپ۔“

میں نے کہا۔ ”سنو! میں تمہارا سردار نہیں ہوں مگر جب تک ہم رستے میں ہیں اور جب تک تمہارے دوسرے ساتھیوں سے مل نہیں لیتے، میں تمہارا منہ بولا ساتھی ضرور رہوں گا۔ آؤ اس جیسے کو گر فٹا کرتا ہے۔ ہر صورت میں اور ابھی۔ تم دونوں بہن بھائی میرے ساتھ آؤ گے۔“ میں نے جیسے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ یہاں بابا کے اور اس قیدی کے پاس رہے گا۔ گاڑی کی نگرانی کرے گا۔“

لڑکی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔ بولی ”تم خود سردار کہو کہ

بڈھے کا ادھر ہی کا کان بیکار تھا۔

مورنی نے یہ اچھی بات بتائی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے اس کے بھائی کو خبردار کیا کہ میں کچھ کرنے کو بڑھ رہا ہوں مگر اس سے پہلے کہ جھاڑی سے نکل کر میں بوڑھے چوکیدار کی طرف جاتا، لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر میرا سر پھر شاخوں میں گھسایا۔ میں نے گھاس پتوں کی اوٹ سے دیکھا، بوڑھے نے اپنی رائفل اٹھائی اور تیار کی تھی۔ وہ ہمارے رخ کی چھدری گھاس کو نشانہ بنائے ہوئے رائفل کی نال ادھر لارہا تھا، جدھر مورنی اور میں دیکھے ہوئے تھے۔

کیا اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے؟ ظاہر ہے آنکھیں تو خراب نہیں ہوں گی اس کی..... ہم دیکھ لیے گئے ہیں اور اب اس کی گولی کا نشانہ بننے والے ہیں۔ لڑکی مورنی نے رائفل کی نال پکڑ کر اپنی طرف کھینچی۔ کیا میں اس کے گولی چلانے سے پہلے اس پر فائر کر پاؤں گا؟ لڑکی مورنی نے رائفل پر ہاتھ مار کر مجھے روک دیا۔ وہ تیز سرگوشی میں بولی۔ ”آگے دیکھو گھاس پر۔“

میں نے آگے گھاس پر دیکھا۔ کالے رنگ کا بھوری چیتوں والا ایک ناگ، زہریلا بائیں ہاتھ کی جھاڑی سے نکل کر ہماری جھاڑی کے سامنے سے گزرتا ایک چھوٹے ٹیلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ادھر اس ناگ کی بانہی ہوگی۔ وہ ہمارے اور رائفل چھپاتے بڈھے کی موجودگی سے بے خبر تیزی سے لہراتا اپنے بل کی پناہ لینے چلا جا رہا تھا۔

اگر اور وقت اور حالات ہوتے تو ہم دم سادھے دیکے بیٹھے رہتے۔ سانپ گزر جاتا مگر بڈھے نے اس پر رائفل سیدھی کی تھی۔ اس لیے دو خطرہ موجود تھے، ایک امکانی خطرہ یہ کہ اس فائر میں ہم آ رہے تھے۔ ناگ مرتا نہ مرتا بڈھے کے فائر سے ہمارا زخمی ہونا یا مرنا گویا طے تھا۔ دوسرا لازمی خطرہ یہ تھا کہ فائر کی آواز سن کر دشمنوں کی تمام نفری ادھر آجاتی۔ اچانک حملے کی ہماری حکمت عملی بے کار ہو جاتی۔

لڑکی نے میری طرف دیکھا، پلک جھپکتے میں دونوں خطرے اور شاید تیسرا خطرہ ناگ کے پلٹ پڑنے، حملہ کرنے کا بھی، لڑکی کے تیز و طرار ذہن میں واضح ہو گیا۔ یہ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا اور پلک جھپکتے میں ایک ایسی غیر متوقع..... نہیں..... شاید مجھے ہلا دینے والی بات ہو گئی۔

لڑکی مورنی کے گرد سیاہ غبار سا آیا اور کرر کرر کی کرلائی ہوئی کسی پرندے کی پکار سنائی دی۔ اس برمی لڑکی کی جگہ اب جھاڑی میں بازو پھینچتی ایک مورنی طاؤس کی

نہ کہو، پر سردار ہو اور شیر تو ہو ہی۔ یہ ہم تینوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔“ میری پیشانی پر بل پڑ گئے ہوں گے کیونکہ میں نے الجھ کر کہا تھا۔ ”کیا یہ بات تم سب سے کہتی پھر وگی؟“

اس کا بھائی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ دیا اور مجھ سے کہنے لگی۔ ”کیا بابا نے کبھی تمہیں یہ نہیں بتایا کہ ایسی بات کسی باہر والے کو معلوم ہو جائے تو اسے ختم کر دیا جاتا ہے اور اپنوں کو اس راز میں شریک رکھتے ہیں۔ جیسے بابا کے کایا بدلنے کی بات بس ہم تین اور تم اور کوسوی جانتے ہیں۔ یہ پانچ جنے ہمارے اپنے ہیں، یہ جانتے تھے اور جانتے ہیں کہ بابا کایا بدل کے ریچھ اور ریچھ سے آدمی بن جاتا تھا۔ پر کسی چھٹے آدمی کو نہیں معلوم۔ اسی طرح اب کوسوی اور ہم تین یہ جانتے ہیں کہ شیر علی کایا بدل کے شیر نرسہا اور کایا بدل کے پھر آدمی بن سکتا ہے۔ یہ بات بس چار لوگوں کو معلوم ہے۔ سمجھو کہ وہ چار تمہارے اپنے ہو گئے۔ مانو کہ نہیں مانو اور بابا کہتا تھا، ایک وقت میں چھ سے زیادہ آدمی لوگ کو یہ بات کی خبر نہیں ہونی چاہیے جو ساتویں کو خبر ہو گئی تو ترنت اس سے، ایک کو مار دینا ہوتا ہے۔“ سمجھے؟ شیر علی سردار؟“

وہ مجھے سردار کہنے پر مصر تھی۔ عجیب ضدی لڑکی تھی۔

رستے چلتے اس نے اپنا نام بتایا، اس کا نام مورنی تھا۔

درختوں کی اوٹ لیتے، رائفلیں اٹھائے ہم تینوں سڑک کے پار نظر آتی ان کی گاڑیوں کی طرف سیدھے نہیں گئے۔ کوئی آدھے میل کا پھیر پڑا ہوگا لیکن گھوم کر ہم گاڑیوں کے اس نصف دائرے کے بالکل پیچھے جا پہنچے جسے انہوں نے اپنی دانست میں مورچے کی طرح ترتیب دیا تھا۔

مگر مورچوں کو تو کسی جنگی اصول پر بنایا اور برتا جاتا ہے۔ ان کے سب لڑاکے، ہماری اس اسکیلے بھیٹنا گاڑی کی طرف منہ کیے کھڑے ہوں گے۔ گاڑیوں کے پیچھے کوئی پہرہ چوکی کچھ نہیں تھا۔ ایک اکیلا بوڑھا چوکی پر تھا۔ وہ پتھر پر بیٹھا رائفل سے ٹیک لگائے جمای لے رہا تھا۔

ہم تینوں اس ٹیکے چوکیدار کو دیکھ کر جھاڑیوں میں دبک گئے۔

وہ لڑکی مورنی اپنی رائفل کھسکاتی، ریگتی ہوئی میرے برابر آئی۔ کان کے پاس منہ لے جا کر ہنسی ہوئی آواز میں آہستہ سے بولی۔ ”یہ چوکیدار ایک کان سے بہرا ہے۔“ لڑکی نے اپنے دائیں کان کو اشارے سے بتایا تھا۔ ہم جدھر جھاڑی میں دیکھے ہوئے تھے

نہیں تھا..... زخمی نہیں کیا تھا اسے“

میں مسکراتا رہا تھا مگر سوچ رہا تھا کہ بابا کے ششوں مریدوں میں ایسے کتنے ہوں گے جنہیں کاہل بدلنے پر قدرت حاصل ہے۔ کبھی پوچھوں گا یہ کیسا جادو گروں کا نولہ ہے جو چیز میں نے کبھی سنی بھی نہ تھی ان کے ساتھ رہ کر نہ صرف دیکھی بلکہ اب تو میں خود بھی جی ہاں میں خود بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جادو گر۔

مگر یہ جادو گری 'سرداری' مجھے بھاری لگ رہی تھی۔

وہ کہتے ہیں تم شیر ہو 'سردار' ہو اور سرداری کا ثبوت تو دینا باقی ہے۔ شیر بنتے تو ان تین نے مجھے دیکھ لیا، پر اس میں میرا کون سا کمال تھا۔ وہ کسی کی بخشش تھی۔ ہاں سرداری مجھے کسی کی عطا اور بخشش سے نہیں ملے گی۔ مجھے ثابت کرنا ہو گا کہ اپنے ہمعصر نوجوانوں کے مقابلے میں کیا کوئی ایسی اضافی لیاقت مجھ میں ہے جو میں ان سے بڑھ جاؤں اور ان کے کہے کو بچ کر دکھاؤں۔

مورنی نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا سوچتے ہو سردار؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے قبیلے والوں کے طور طریق، عادتیں کچھ نہیں معلوم۔ سردار بھلا کیوں کہتی ہو؟ مجھے یہ خبر نہیں کہ وہ لڑنے کی تیاری کرتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ مجھے مشورہ دو تم دونوں..... بلکہ میں چاہتا ہوں آگے چلو۔ تم بتاؤ کہ تمہارے ساتھیوں کو کس طرح آزاد کر لیا جاسکتا ہے اور یہ بتاؤ وہ دو گاڑیاں جن میں ہتھیاروں میں میگزین رکھا ہے، کہاں ہوں گی؟ میں سب سے پہلے ان گاڑیوں کو قبضے میں لینا چاہتا ہوں۔“

مورنی بولی۔ ”وہ بھی دوسری سب گاڑیوں جیسی ہیں۔ کوئی پہچان نہیں سکتا۔ جب تک ہر گاڑی کے فرش میں بنے خاص خانے میں دیکھ نہ لے۔“

مجھے فرش کے اس خانے ”قبر خانے“ کا خیال آیا جس میں جیل والوں سے بچانے کو مجھے چھپایا گیا تھا۔

”پہچان کا ایک طریقہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سب سے زیادہ نگرانی وہ ان دو گاڑیوں کی کر رہے ہوں گے۔“

”کوئی ضروری نہیں۔“ لڑکا کہنے لگا۔ ”وہ دلیر نہ سہی، عیار بہت ہیں۔ کس طرح سوچ رہے ہوں گے، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“

میں نے کہا۔ ”ہم کسی ایک گاڑی کو آگ لگا دیتے ہیں۔“

خوبصورت سبک جسم مادہ..... ایک مورنی جھاڑی سے جیسے جست کر کے کھلے قطعے میں آئی اور بجلی کی سی سرعت سے اس بھوری چھتوں والے یہ ناگ کو اپنی چونچ میں لے کر اس نے جھٹکا دیا اور دور ایک طرف اچھال دیا۔

بوڑھے جو کیدار نے پوپلی آواز میں کہا۔ ”ہرے رام۔“ اور رائفل کندھے سے ہٹا کر اپنے زانو سے نکالی۔ پھر اس نے مورنی کی طرف عقیدت سے دیکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی سے لگا دیئے۔

وہ مورنی کو طاؤس کی مادہ مورنی کو تعظیم دے رہا تھا۔

مور پتک شری کرشن کی نشانی تھے اور اس کے لیے محترم تھے۔

اس لڑکی مورنی کے بھائی نقلی فوجی کے لیے یہی وقت پیش قدمی کا تھا۔ وہ چوکیدار کے بہرے کان کی طرف سے پر شور انداز میں جھپٹتا ہوا چلا اور بڑھے کی گدی پر اپنے کھڑے پنچے کی ضرب لگا کر اسے گرا دیا۔ میں نے بڑھے کی رائفل قبضے میں کی۔ مورنی کے بھائی نے اپنی کمر کے گرد لپٹی سی کھول کر اس کے ہاتھ پیر باندھنا شروع کر دیئے۔ میں نے اس کے منہ میں اپنا رومال ٹھونس دیا۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ لڑکی کی ہنسی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

میں گھبرا کر مڑا۔ میرے پیچھے وہ برمی لڑکی کھڑی تھی جس کا نام مورنی تھا مگر اس وقت وہ مورنی کی جون میں نہیں تھی۔ وہ پھر انسان کے قالب میں آگئی تھی۔

میرے لیے یہ بہت حیرت ناک اور پریشان کر دینے والی بات تھی..... اور نہیں بھی تھی۔ پریشانی یہ تھی کہ میں ایک اور راز میں شریک ہو گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تم نے اچانک یہ سب کیا بتایا بھی نہیں کہ تم.....“

وہ ہولے سے ہنسی۔ ”اس میں بتانے کو کیا تھا؟ میں اگر اسی پل اپنی کاپا نہ بدلتی اور ناگ کو ہٹانہ دیتی تو تین بری باتوں میں سے کوئی ایک ہو جاتی۔ سب ہی کچھ بگڑ جاتا۔“

پھر وہ ہنستے ہوئے آگے بڑھی اور میرے قمیض کی آستین سے رگڑ رگڑ کر اپنے ہونٹ پونچھنے لگی۔ ٹھیک تو ہے۔ پرندے مورنی نے ناگ کو اپنی چونچ میں لے کے دور پھینکا تھا۔ میں نے یونی مسخرے پن میں قمیض کی آستین چٹکیوں سے پکڑ کر اسے دکھائی اور منہ بنا کر کہا۔ ”بخ! جھی جھی۔“

وہ آنکھیں چکا کر بولی۔ ”نانا، مورنی نے آرام سے ہمارے پھینکا تھا ناگ کو توڑا

لڑکا بولا۔ ”آگ نہیں لگا سکتے، انہوں نے ہمارے جوانوں کو گاڑی میں بند کر کے رکھا ہے۔“

لڑکی نے کہا۔ ”تمہیں وہ لڑکی یاد ہے جو دن اوگنے سے پہلے قافلے کی طرف گھوڑا دوڑاتی آئی تھی؟ وہ ہماری مدد کرے گی۔“

میں نے یاد کیا۔ گھوڑوں پر سوار راکفلین اٹھائے مگر وہ دو آئی تھیں۔ میں نے مورنی سے کہا۔ ”وہ دو لڑکیاں تھیں۔“

”دوسری میں تھی۔ میں یہاں رک گئی اور وہ اپنے آدمی کے ساتھ چلی گئی۔“

”اچھا وہ اس کا آدمی تھا۔“ میں نے اس نوجوان کو یاد کیا جو جیل کی چہار دیواری کے بعد نہر کے کنارے گھوڑے سنبھالے ہوئے انتظار کر رہا تھا۔ اسی نے تو مجھے پہلی بار بتایا تھا کہ بابا دراصل قبیلے کا سردار ہے۔ مانگ یان کالج کے بارے میں سبھی اسی نے بتایا تھا۔

”خوب! وہ میاں بیوی ہماری مدد کریں گے۔“

”میاں بیوی نہیں، صرف بیوی۔ اس کا میاں مانگ یان جا چکا ہے کو سوی کو خبر کرنے۔ بابا نے اسی طرح کہا تھا کہ جب وقت آجائے تو ایک آدمی جا کر کو سوی کو خبر کرے اور سنبھالے۔“

”اچھا تو بیوی کس طرح ہماری مدد کرے گی؟“

لڑکی نے کہا۔ ”وہ اپنے آدمی کو مانگ یان بھیجنے کے بعد جسگے کی گاڑی میں بیٹھ گئی ہوگی۔“

”گاڑی میں بیٹھ گئی ہوگی؟ کیسے بیٹھ گئی ہوگی؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے سمجھاؤ، میں نہیں سمجھا۔“

مورنی نے کہا۔ ”اس میں سمجھنا کیا ہے؟ وہ جسگے کی گاڑی میں گئی ہوگی۔ اس کی چادر اپنے اوپر لے لی ہوگی اور اس کی عورت بن گئی ہوگی۔“

میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”بیوی بن گئی ہوگی؟“

وہ بولی۔ ”بیوی نہیں۔ عورت عورت۔“

میں پوچھتے ہوئے ہلکا رہا تھا۔ ”مطلب بیوی وہ اسی پہلے والے کی رہے گی اور..... ٹھہرے گی..... بے گی اس جسگے کی گاڑی میں اس جسگے کی..... مطلب عورت بن کے.....؟“

مورنی نے الجھ کر سر جھٹکا۔ ”ہاں تو یہی ہے نا؟“

میں نے پریشان ہو کر اس قصے کو ختم کرنا چاہا۔ ”تو اب وہ اس کی عورت بنی رہے گی؟“

”ہوں جب تک اس کا میاں نہیں آجاتا۔ اگر کوئی بچہ ہو تو وہ اس کے میاں کا ہی مانا جائے گا۔ جسگے کی گاڑی سے اسے بس چار آنے بھر کا..... مطلب چار حصے میں سے.....“

میں نے بھی الجھن میں سر جھٹکا۔ یہ ان کا کوئی دستور ہوگا، مجھے اس سے کیا۔

میں تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ جواب جسگے کی عورت ہے، اس پر کس حد تک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ وہ ہماری کیا مدد کر سکتی ہے؟

مورنی نے بتایا۔ ”دستور یہ ہے کہ کسی کی ”عورت“ اس کے پیٹھ میں فخر نہیں مارتی۔ جب تک گاڑی میں رہتی ہے۔ گاڑی والے سے سچی رہتی ہے۔ پر یہ جسگے قبیلے کا دشمن ہے۔ بابا کا دشمن ہے اور کو سوی کا اب وہ جو جسگے کی عورت ہے، سب کچھ کر لے گی۔ موقع ملنے پر اسے مار بھی سکتی ہے۔ وہ ہمارے لیے اس گاڑی میں بیٹھی ہے۔ اپنے میاں کے کہنے پر بیٹھی ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے جیسے اتمام حجت کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو اپنے میاں کے کہنے پر بیٹھی ہے اس گاڑی میں؟“

مورنی نے کہا۔ ”ہاں نا۔“ اور اس نے دو قدم ہٹ کے جھاڑی میں منہ دے کر مورنی کی آواز نکالی۔

یہ اشارہ تھا کہ اس عورت کے لیے جو جسگے کی گاڑی میں بھیجی گئی۔ اب ہماری جاسوس تھی۔

مورنی نے کئی کئی طرح سے آواز نکالی۔ چونکتی ہوئی مورنی کی آواز۔ اپنے ساتھیوں کو پکارتی ہوئی مورنی کی کوک دانے پر سب کو بلاتی ہوئی اور ڈر کر اڑی جاتی مورنی کی آواز

جواب میں کوئی اشارہ نہیں آیا۔

کہیں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ دونوں بہن بھائی نے تشویش سے میری طرف دیکھا تھا۔

میں نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ سامنے کھڑی گاڑیوں میں سے جسگے کی گاڑی کون سی

میں ہم جسگے کے ساتھی بوڑھے چوکیدار کو ہاتھ پیر منہ باندھ کر ڈال آئے تھے اور وہاں سے مجھے وہ درخت بھی نظر آگیا جس کی اوٹ میں مورنی اور اس کا بھائی کھڑے تھے۔

پھر وہاں سے میں نے عجیب بات دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ دو آدمی رانقلیں اٹھائے، شکاری جانوروں کی طرح بھگے بھگے دو طرف سے اس درخت کی طرف بڑھ رہے تھے جس کی اوٹ میں بہن بھائی کھڑے تھے۔

میں نے اپنی رانقل سے پہلے ایک کو پھر دوسرے کو زد میں لیا۔ اگر ان میں سے کوئی بہن یا بھائی کو گولی مارنے کے لیے بدوق اٹھاتا ہے تو میں نے سوچ لیا کہ میں اسے یہیں۔۔۔ نشانہ بنا کر بے اثر کر دوں گا۔

مگر وہ دونوں قبائلی مورنی اور اس کے بھائی کو جان سے مارنے کے لیے نہیں بڑھے تھے۔ وہ ان پر اچانک جا پڑنے او بے بس کر کے گرفتار کرنے آ رہے تھے۔ ایسی صورت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے تو مورنی کے اشارے کے جواب میں اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا تھا اور پھر میں غائب ہو گیا تھا۔ اب وہ بے چین ہو کر ادھر ادھر دیکھتی تھی۔ اس نے مورنی ہانڈے کی آواز نکال کر مجھے متوجہ کرنا چاہا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ دونوں بہن بھائی دشمن کے مورچے میں تھے۔ پھر بھی میرے دیر کرنے اور روپوش ہو جانے سے نہیں کوئی اشارہ کیوں نہیں ملا؟ انہیں خبردار چوکنا ہو جانا چاہیے تھا مگر بڑے سے بڑے اور سورما بھی کبھی نہ کبھی حماقتیں کر جاتے ہیں۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں قبائلیوں نے مورنی اور اس کے بھائی کو رانقل کھا کر بے بس اور نہتہ کر دیا۔ ڈوریوں سے دونوں کی مشکلیں کس کر وہ گاڑی کے گھیرے میں ایک طرف چل پڑے۔

اب میرا کام شروع ہو رہا تھا۔ یہ دو قبائلی انہیں جسگے کی گاڑی پر لے جائیں گے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ درخت کی بلندی سے جسگے کی گاڑی کی پوزیشن سمجھ لوں گا، انہیں سنہلنے کا موقع دیے بغیر اچانک گاڑی پر چڑھائی کر دوں گا۔

میں نے یہی کیا۔ درختوں، ٹیلوں اور زمین کے کٹاؤ کی پہچان مجھے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ میں اس گاڑی کو اچھی طرح نظر میں رکھے ہوئے درختوں کے اس واقعے سے آگاہ اور گاڑی کے پیچھے علاقے میں داخل ہو گیا۔ پھر بچتا بچتا دیکھتا گھات لگاتا اس آڑی تک جا پہنچا جس میں قبائلی ان دونوں بہن بھائی کو لے کر گئے تھے۔

ہے؟“

لڑکا بولا۔ ”نہیں معلوم۔“

سب گاڑیاں ایک سی تھیں۔ ایک جیسا رنگ و روغن، ایک سی بناوٹ۔ مجھے تو برمی مھینے بھی ایک جیسے لگے۔ پھر بھی میں نے کہا کہ اس کے کسی مھینے کی کوئی پہچان اگر یاد ہو تو ہشیاری سے اور تیزی سے گھوم پھر کے جسگے کی گاڑی پہچانو۔ اس گاڑی تک پہنچنا ضروری ہے۔ عورت خطرے میں ہے۔

دونوں بہن بھائی گھات لگائے دائیں بائیں نکل گئے۔ قبیلے کے کیمپ میں ملاک سناٹا تھا۔ حیرت کی بات تھی مگر پھر مجھے یاد آیا کہ شور تو بکریوں کے ریوڑ، بچوں اور ٹرانزسٹر ریڈیو کا ہوتا تھا۔ گاڑیوں کا یہ گھیرا لڑاکوں کا مورچہ ہے۔ عورتوں، بچوں اور ریوڑوں کو الگ کر کے وہ حملہ کرنے آئے ہیں اس لیے اتنا سناٹا ہے۔

میں جھاڑی میں دبکا بیٹھا تھا کہ میں نے مورنی کو ایک درخت کی اوٹ سے اشارے کرتے دیکھا۔ اس کا بھائی بھی کسی طرح چکر لگا کر درخت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس درخت تک ادھر سے پہنچنا مشکل تھا کیونکہ میرے اور درخت کے درمیان ایک کھلا قطعہ آتا تھا۔ کسی طرح کی اوٹ نہیں تھی۔ اگر کوئی دشمن چھپا ہوا نہیں گھات لگائے بڑھتا دیکھ رہا ہوتا تو آسانی سے ایک فائر کر کے مجھے گرا سکتا تھا۔ میں نے مورنی کو رکنے کا انتظار کرنے کا اشارہ کیا اور نظروں ہی نظروں میں کسی اور طرف سے ان تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

اسی دم مجھے کسی فوری خطرے کا احساس ہوا اور میں وہ جھاڑی چھوڑ کر اپنے دائیں طرف نشیب و فراز میں اترتی پگڈنڈی پر بے آواز دوڑتا چلا گیا۔ پگڈنڈی درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کی طرف چلی گئی تھی۔ درختوں کی وہ پناہ گاہ میرے بہت کام کی تھی۔ میں نے وہاں تک پہنچنے میں بمشکل ایک منٹ لیا ہو گا۔ اس ایک منٹ میں میں نے اپنی اگلی کارروائی کا خاکہ تیار کر لیا۔ درختوں کا یہ جھنڈ اس طرح اٹھا تھا کہ بہت تھوڑی کوشش سے سب سے اونچے درخت کی سب سے بلند شاخ تک پہنچا جاسکتا تھا۔ ایک طرح کی ٹیڑھی سی بن گئی تھی۔ دوسروں کے مقابلے میں میرے لیے یہ ٹیڑھی استعمال کرنا بچوں کا کھیل تھا۔

اس جھنڈ کی بلند ترین شاخ پر چٹوں میں چھپ کر میں نے دور دور تک نظر دوڑائی۔ وہاں سے میں قبیلے کی سب گاڑیاں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے وہ جھاڑی پہچان لی جس

ہی تھی۔

مورنی کو پکڑنے والے نے جو اس وقت گاڑی میں اکیلا پہریدار تھا، اپنی گھوں کرتی مکرہ آواز میں پوچھا تھا۔ ”سمجھ رہی ہے تو؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟“
مورنی کی آواز آئی۔ ”نہیں۔ میرے کچھ پلے نہیں پڑا۔“ اس نے مورنی کے بندھا ڈھانا کھول دیا تھا۔

وہ کمیٹنگی سے ہنس۔ ”کیا سمجھ نہیں آئی؟ یہ کہ میں تجھے اپنی عورت بنا کے رکھنا ہوں یا یہ کہ تیرا راز مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ آں مورنی؟“
”خبر نہیں کیا بک رہا ہے؟“

”میں نے دن کی اجاگر روشنی میں بلکہ دھوپ میں اپنی ان آنکھوں سے تجھے سے مورنی بننے، پھر مورنی کو جھاڑی سے چھلانگ مار کر باہر آتے، سانپ کو اپنی چونچ کے دور پھینکتے، پھر واپس جھاڑی میں آ کے لڑکی بننے دیکھا ہے، سمجھی تو..... سمجھی کیا بک رہا ہوں؟ یا اب بھی نہیں سمجھی؟“

مورنی نے حقارت سے کہا۔ ”خواب دیکھا ہوگا تو نے..... جیسے جیسے آدمی بڑھا اٹا ہے، ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے بہت سے بڑھوں کو جاگتے میں خواب دیکھتے اور میں کھاتے دیکھا ہے کہ ایسا ہوا تھا، ویسا ہوا تھا۔“

قبائلی نے جو ظاہر ہے بوڑھا ہوگا، اسی لیے برا مان رہا تھا۔ ”مجھے بوڑھا کہہ رہی وہ تیرا سردار، کو سومی کا دادا، وہ بوڑھا نہیں ہے جو تو اس کی گاڑی میں جا بیٹھی ہے؟ ماپاٹھا ہے، مجھ سے پندرہ بیس برس بڑا ہی ہوگا سال۔“

مورنی بولی۔ ”ہاں، میں اس کی گاڑی میں جا بیٹھی ہوں۔ اس کی عورت بن کے کو سومی بن کے اس کی پوتی بیٹی بن کے بیٹھی ہوں۔“

قبائلی کو شاید بڑے میاں کی موت کی خبر نہیں ہوگی ورنہ اس طرح نہ کہتا مگر بات کی خبر تھی، وہ مورنی کے لیے تباہ کن ہو سکتی تھی۔

قبائلی غصے میں کہنے لگا۔ ”یہ بیٹی، پوتی والی بکواس میں خوب سمجھتا ہوں۔ سب کی باتیں ہیں۔“

مورنی بولی۔ ”چل تو نہیں مانتا، مت مان۔ میں بیٹی، پوتی نہ سہی، عورت سہی۔ بٹے اور بھی شرم کرنی چاہیے تو قبیلے کے پرانے دستور پر تھوکنے لگا ہے۔ میں اگر ما عورت ہوں تو جب تک میں خود اس کی چادر اتار کے اس کی گاڑی سے نکل نہ

میں نے سنا کوئی شخص بہت غصے میں بک جھک رہا تھا۔ ایک جملہ میری کچھ آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”حکم ہے جسکے سردار کا کہ جب بھی وہ بہن بھائی پکڑ میں آجائیں گولی مار کے قصہ ختم کر دوں۔ چلو منہ ادھر کرو۔“ اس کے ساتھ راکفل لوز کر صاف آواز آئی۔ پھر عورت کے غوں غوں کر کے ایسے چیخنے کی آواز آئی جیسے اس منہ میں کپڑا ٹھونسا ہو۔

دیر کرنا خطرناک ہوگا، وہ بد معاش دونوں کو قتل کر رہے تھے۔ میں تیزی مگر نرمی سے گاڑی کی سیڑھی پر پیر رکھتا پردہ اٹھا کر اندر جا کودا۔ ”خبردار!“ میں نے لگایا تھا۔

مگر یہ بے مقصد نعرہ تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ خبردار تھے۔ میرے اندر پہنچنے ہی نے جو پہلے سے میری آمد کا منتظر تھا۔ میرے سر کی پشت پر کسی بھاری اور نرم چڑ ضرب لگائی اور میں گاڑی کے فرش کی طرف جھکتا چلا گیا۔ اس نے گرتے ہوئے یہ ہاتھ پر ہاتھ ڈال دیا تھا اور راکفل میرے ہاتھ سے لے لی تھی۔

انہیں معلوم تھا، میں پیچھے پیچھے آؤں گا۔ انہوں نے مجھے شانے کو سب کیا تھا۔

بے ہوشی کے بعد ہوش میں آنے والے کو قطعی طور پر تو معلوم نہیں ہو وہ کتنی دیر بعد ہوش میں آیا ہے۔ میں نے ہوش میں آتے ہوئے گاڑی کے فرش پر درمی کے جھٹک ڈیزائن پر توجہ دی تھی۔ سمجھنا چاہتا تھا کہ درمی بننے والوں نے انار سے کیا بنایا ہے اور کیا نتیجہ نکالنا چاہا ہے۔ سر درد کرنے لگا مگر تین انچ کی دوری کے ڈیزائن میری سمجھ میں نہ آئے۔

پھر دھیرے دھیرے مجھ پر کھلتا گیا کہ سر میں اتنا شدید درد کس لیے ہے۔ نے حملہ آور یا اس کے ساتھی کی آواز سنی۔ وہ آواز ایک ہی لے پر چلی آ رہی تھی۔ ڈر رہا تھا کہ اگر ایک ہی چپ پر یہ بولتا رہا تو میں بے ہوشی کے بعد اب نیند میں گم ہو جاؤں مگر وہ جو کچھ، جس طرح کہہ رہا تھا مجھے جگائے رکھنے کے لیے بہت کافی تھا۔ وہ دھمکی دے رہا تھا، اس لیے میں نے سر اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ

صاف طور پر وہ مورنی کو دھمکا رہا تھا۔
میں بے ہوش بنا پڑا ہوں کیونکہ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ میں ہوش آچکا ہوں تو وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دیتا۔ میرے لیے پوری بات سننا ضروری تھا

”ٹھیک ہوں، تمہارا بھائی ابھی ہوش میں نہیں آیا۔ انہوں نے بہت مار پیٹ کی ہوگی جو ابھی تک بے ہوش پڑا ہے۔“

”یہ باز بھی تو نہیں آتا۔ بڑھے کو برابر گالی دیے جا رہا تھا۔“

”بڑھا جو کہہ رہا تھا، میں نے سب سن لیا ہے۔ کیا اس نے تمہیں مورنی بننے دیکھ لیا ہوگا؟ کہیں سنی سنائی یہ خالی شک ہے تو بات نہیں کر رہا؟ یہ بتاؤ تمہارے قبیلے میں جادو کرنے والے کو واقعی زندہ جلا دیتے ہیں؟“

”ہاں۔“ وہ تقریباً بے پروائی سے کہنے لگی۔ ”ہاں۔ یہ جادو نہیں ہے بابا کا علم ہے جو اس نے مجھے بخشا تھا۔ تمہیں بخشا تھا۔“

”مگر دوسرے لوگ جو ہیں، دوسرے لوگ اسے جادو سمجھتے اور جادو کہتے ہوں گے۔ وہ تو کہیں گے ناکہ اسے آگ میں ڈال دو۔ کیوں مورنی؟“

وہ کہنے لگی۔ ”نہیں دوسرے سب اسے جادو نہیں سمجھتے اور کہنے کا کیا ہے۔

جیسی مرضی بکواس کریں۔ اس وقت ان کے پاس ہتھیار ہیں، طاقت ہے۔ ویسے اگر یہ سب کہہ دیں گے کہ میں نے جادو سے کلایا بدلی تھی تو قبیلے والے جلا بھی سکتے ہیں مگر مجھے اس کی پروا نہیں کہ یہ کیا سمجھ رہے ہیں۔“

”پروا نہیں ہے۔ تم بھی حد کرتی ہو۔ تمہاری جان خطرے میں ہے اور تم کہتی ہو، پروا نہیں ہے۔“

”جان خطرے میں ہے۔“ وہ بولی۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہے ہو مگر خطرہ جلانے، سینکے کا نہیں ہے۔ یہ بالکل بکواس بھی ہو سکتی ہے۔ جان کو اصل خطرہ اس سے ہے کہ مورنی بننے والی بات اس نے کسی ایک سے بھی اگر کہہ دی تو پھر میری بات جانے والے آدمی سب ملا کے سات ہو جائیں گے اور جیسے ہی سات بندے ہو گئے، ایک جاننے والے کو ختم کر دینا پڑے گا، فوراً ختم کرنا ہوگا۔ یہ لازمی ہوتا ہے نہیں پھر کایا بدلنے والے کا خاتمہ ہے۔“

”یہ کیوں؟“ میں پریشان ہو گیا تھا۔

”کیوں کا مطلب؟“ اس نے الجھ کر کہا۔ ”یہ سب اسی طرح ہے۔ میں نے بتایا نہیں تھا پہلے بھی اور بابا نے بھی بتایا ہوگا کہ جو کسی کے کایا بدلنے کی بات جان لے، اسے یا تو مار دیتے ہیں یا وہ اپنوں میں سے ہو جاتا ہے۔ پر اپنوں میں بھی ایک وقت میں چھ بندوں سے زیادہ نہیں ہو سکتے، چھٹے کے بعد ساتواں کایا بدلتے دیکھ لے یا کسی سے سن لے کہ

آؤں، تجھے یا کسی کو بھی میرے لیے ایسا دل میں لانا ٹھیک نہیں ہے۔“

”سوچ لے۔“ اس کے لہجے میں اب واضح دھمکی بلکہ غنڈا گردی سنائی دے رہی تھی۔ ”سوچ لے، میں نے جو دیکھا ہے، اگر وہ جسکے سردار سے جا کے بول دیا تو جانتی ہے تیرا کیا حال ہوتا ہے؟“

مورنی کو طیش آگیا۔ ”کیا ہوتا ہے؟ ہاں بتا کیا ہوتا ہے؟“

”زندہ جلا دے گا جسکے سردار۔ دستور دستور کبے جا رہی ہے۔ خبر ہے جاو کرنے والے کو قبلہ کہاں پہنچا دیتا ہے۔ اسے الاؤ کے بیچ پہنچانے کا دستور ہے۔ جادوگری کرتا ہے، پکڑا جائے۔ ہاں۔ میں قسم کھا لوں گا کہ تو میری آنکھوں کے سامنے لڑکی سے مورنی بن گئی تھی اور پھر دوبارہ سے لڑکی بنی۔ یہ میں قسم کھا کے کہوں گا سہ کے سامنے۔“

”میرا بھائی موجود تھا ادھر۔“

”ہاں تیرا بھائی اور تیرا یہ عاشق، خبر نہیں کون ہے یہ..... یہ بھی تھا۔“

”میرا بھائی قسم کھا کے کہے گا کہ تو بکواس کرتا ہے۔ نہ میں لڑکی سے مورا بنی، نہ پھر دوبارہ کچھ بنی اور مورنی تو میں جنم سے ہوں۔ نام ہے یہ میرا۔“

”سوچ لے۔ میں جا رہا ہوں۔ زیادہ تاہم نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ میرا جوڑی دار یا تیرا عاشق اٹھ بیٹھے گا۔ ابھی تک تو ٹھنڈا پڑا ہے۔ ایک جم دیا تھا میں نے بھی..... سمجھی؟ سوچ لے کہ تجھے آرام سے میری گاڑی میں میری عورت بن کے رہنا ہے یا الاؤ میں مرنے ہے۔ میں جاتا ہوں، پھر آؤں گا..... ابھی کسی کو نہیں ہے تیرے جادو کا۔ تجھ سے آخری جواب سن لوں، پھر دیکھوں گا۔ آئی سمجھ لے۔ مورنی اذرا خوب سوچ لینا۔“

پھر آہٹوں سے پتا چلا کہ وہ اٹھا اور گاڑی سے نکل گیا۔ میں نے کروٹ لی اور مورنی کی طرف گھوم گیا۔

میری طرح اس کے بھی ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ مورنی کے برابر اس بھائی پڑا تھا۔ اس کے سر کی چوٹ ایسی تھی کہ کھال پھٹ گئی تھی اور کچھ خون گاڑی میں پھینچ رہی پر گر کر جم گیا تھا۔ وہ ابھی ہوش میں نہیں آیا تھا۔

مجھے کروٹ لیتے، آنکھیں کھولتے دیکھ کر مورنی آہستہ سے ہنس کر بولی۔

”جاگ اٹھے، کیسے ہو؟“

فلاں کا یا بدل سکتا ہے تو ایسا جانے یا دیکھنے والوں میں سے ایک کو مار دینا ہوتا ہے۔ وہ اپنا ہوا یا پر لیا ہو، کوئی ہو، ہر حال میں ایک کو ختم کر کے چھ بندوں کی کتنی قائم کرنی پڑتی ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”اگر نہیں رکھو چھ کی کتنی۔ بات جاننے والوں کی تعداد سات ہی رہے تو؟“

مورنی آرام سے بولی۔ ”تو کیا بدلنے والا اس دن کا سورج ڈوبنے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔“

”خدا رحم کرے۔“ میں نے فکر مندی سے کہا۔ ”یہ تو بڑی خوفناک، بہت عجیب بات ہے۔“

مورنی ہلکا سا مسکرائی۔ ”اس میں کون سی عجیب بات نہیں ہے۔ سبھی باتیں عجیب اور ڈراؤنی ہیں۔“

وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ میں بھی کیسے الجھاؤے میں الجھ گیا ہوں۔ یہ بات بڑے میاں نے بتائی تو تھی مگر اس طرح نہیں بتائی تھی۔ ان پچارے کو وقت ہی نہ مل سکا۔

میں نے اپنے دل کی خاموشی میں عہد کیا کہ اپنے شیر بننے کا راز کم سے کم لوگوں کو جاننے دوں گا مگر مجھے تو ابتدا ہی سے گھائے، ٹوٹے کا سامنا ہے۔ دیکھو نا..... کو سوس، مورنی یہ دو لڑکیاں، تیسرا مورنی کا بھائی اور چوتھا جسکے کا بیٹا۔ یہ چار انسان تو شروع ہی سے میری بات جانتے ہیں۔ صرف دو کی گنجائش اور ہے۔ اس کے بعد خطرے کی گھنٹی۔

پھر میں نے خوف کے ساتھ سوچا کہ اگر حملہ کرتے ہوئے اس شخص جسکے یا اس کے ساتھی نے جو بابا کی گاڑی کے پاس اس وقت ہمارے کمپ میں بندھا پڑا ہے، دونوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تھا تو ہو گئے پانچ آدمی یا اگر خدا نخواستہ دونوں ہی نے مجھے درخت کے نیچے انسان سے شیر بننے دیکھا تو پھر سمجھو شیر علی خان کہ پہلے منٹ سے تمہارے سر پر تلوار لٹک رہی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری قسمت کا فیصلہ اب تک ہو بھی چکا ہو۔ کسی ایک نے دیکھا ہو، دوسرے سے کہہ دیا ہو اور اس طرح اب تک سات کی تعداد بن چکی ہو تو تمہارے جانے بغیر شیر علی خان آج کا ڈوبنا سورج تمہاری جان لے کر ڈوب جائے گا۔

میرے چہرے پر پسینہ پھوٹ آیا۔ اس کیفیت کو مورنی دیکھ رہی تھی۔ بولی۔ ”سردار کس الجھن میں پڑے ہو؟“

میں نے ٹالنے کو کہہ دیا۔ ”بس ایسے ہی کچھ وہم آرہے تھے۔“ ”وہم؟“ کہ کہیں چار کے بعد پانچویں، چھٹے اور ساتویں کو خبر نہ لگ گئی ہو کہ شیر علی سردار جنگل کا شیر بن جاتا ہے، کیوں؟ کیا ایسے وہم آرہے تھے؟“ میں نے کہا۔ ”مورنی تم دل کا حال کیسے جان گئیں؟ حیرت ہے۔“ بولی۔ ”چہرہ پسینے میں تر ہے۔ میں نے تمہیں ہونٹ ہلاتے ایک سے چار تک گنتے دیکھا۔ آگے سمجھنا کون سا مشکل ہے سردار! وہم نہ کرو۔“ ”میں وہم نہیں کرتا مورنی مگر ایک دھند بھا، ایک فکر تو ہر وقت لگی رہے گی۔“

”فکر بھی مت کرو۔“ وہ بولی۔ ”فکر کرنے والے ہم جو ہیں جائنا۔“ میں ہنس پڑا۔ ”یہ جائنا اچھا لفظ سوچا ہے۔“

وہ سنجیدہ رہی۔ ”یہ لفظ کوئی اس وقت ابھی ابھی نہیں سوچا ہے۔ ہم لوگ تمہارے اپنے ہیں سردار۔ یہ فرض بھی ہے ہمارا اور دستور بھی کہ سردار کی جان پر بن جائے تو کوئی بھی جان باز، جائنا، کوئی بھی اپنوں میں سے جان پر کھیل جاتا ہے۔“ میں کیا کہتا، چپ رہا۔ وہ اتنے جوش اور جذبے سے بات کہہ رہی تھی کہ اسے لوگنا یا بات کو آگے بڑھانا مجھے اچھا نہ لگا۔

مورنی خود ہی کہنے لگی۔ ”خبر ہے کو سوس کے دادا، بڑے سردار کی جان اس کی پٹی بہونے کو سوس کی ماں نے بچائی تھی۔“ ”کیسے؟“

وہ بولی۔ ”ایسی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ کسی نے خیال نہیں، سردار کو بھی یاد نہیں رہا۔ وہ کیا بدل کے ریچھ بنتا تھا اور کسی آدمی نے کوئی راہ گیر تھا، اسے دیکھ لیا۔ وہ آدمی ڈر گیا۔ ناموشی سے نکل بھاگا۔ سردار کو پتہ نہ چل سکا۔ شام ہو گئی۔ سردار کنبے کے ساتھ رہتا فادہ سورج ڈوبتے وہ چکرا کے ایک دم گرا جیسے جیسے سورج چھپ رہا تھا۔ سردار کا رنگ بیلا پڑتا جاتا تھا۔ کو سوس کی ماں اس وقت سب کے لیے بھات پکا رہی تھی۔ اس نے دیکھ یا سمجھ گئی کہ آج چھٹے سے ساتویں آدمی نے بابا کو کیا بدلتے دیکھ لیا ہے۔ دوڑی دوڑی نا، آوازیں دے دے کے بابا سے اتنا ضرور پوچھ لیا کہ آج اس نے کیا بدل کی ہے؟ بابا نے بتایا کہ ہاں کھلے جنگل میں..... بہو سمجھ گئی کہ وہیں کسی کی نظر پڑ گئی ہوگی تو سورج غنے سے پہلے سات آدمیوں کی کتنی کم کر کے چھ آدمیوں پر لانا تھا۔ تبھی بابا کی جان بچ

تیری آدھی ٹانگ بھی توڑ کے پیٹ میں گھسا دیتا۔ سمجھاؤ دلاؤ..... لنگڑے۔“
غصہ در بوڑھے نے جو واقعی ایک ٹانگ سے معذور تھا ہاتھ میں پکڑی رانفل کا
بٹ چلایا۔ اس نے مورنی کے سر کو نشانہ بنایا تھا مگر مورنی تیار تھی۔ وہ بستر کی طرح رول
کر کے اس کی زد سے دور ہو گئی۔ بندوق کا بٹ بڑی آواز سے گاڑی کے فرش سے ٹکرایا۔
باہر سے دوسرے بوڑھے کی آواز آئی۔ ”کیا ہوا؟“

لنگڑانے والے نے ہلکا کر کہا۔ ”یہ رنڈی منہ ماری کر رہی ہے۔“
باہر سے مورنی کے عاشق بڑھے کے گالی بکنے کی آواز آئی۔ اس نے اپنے
ساتھی کو بہت ہی گھٹیا بات کہہ کر لٹکارتا تھا اور وہ بندوق اٹھائے غصے میں جھاگ اڑاتا گاڑی
میں گھس پڑا تھا۔ یہ اگر سامنے سے ہٹ نہ جاتا تو آنے والے نے بٹ کر مار کر اس کا منہ
ہی توڑ دیا تھا۔

”تیرے کو کیا پریشانی ہے رے؟ یہ کیا حرامی پن ہے؟ کیا بکواس کرتا ہے؟“
معذور نے ہلکا کر پوچھا۔

”مورنی کا عاشق پینترا لے کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اگر معذور بڑھا حملہ
کرنے کو بڑھے تو وہ اسے ایک ہی گولی میں لٹا دے۔“

مورنی نے بڑھاؤ دیا۔ ”مارا سے۔ میرے بدن پہ ہاتھ ڈالتا تھا سالا۔“
میں نے حیرت سے اس عیار لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس نے آدھے منٹ میں
ان بد معاش جوڑی داروں کو جانی دشمن بنادیا تھا۔

معذور بڑھا چٹخا۔ ”نہیں رے۔ جھوٹ بولتی ہے کتیا۔“ مگر اس کا فقرہ زبان
سے ابھی پوری طرح ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس پرانے عاشق بڑھے نے گولی چلا دی۔
کمزور ٹانگ والے کے پیٹ میں گولی لگی جو اسے چھیدتی ہوئی گاڑی کا تختہ توڑ کر
نکل گئی۔ عاشق کا جوڑی دار پیٹ کے سوراخ کو مٹھی میں جکڑے جکڑے الٹ گیا۔ اس
کے بد صورت چہرے پر غضب کی حیرت تھی۔

مورنی نے اپنے حیران و پریشان عاشق سے تیز تیز لہجہ میں کہنا شروع کیا۔
”چل ہم دونوں بھاگ لیں۔ چل آمیرے ساتھ نکل جا۔ آجا اٹھا مجھے میرے ہاتھ پیر
مول دے، دونوں نکل چلیں گے۔ ادھر رکنا ٹھیک نہیں ہے۔ چل ہاتھ پیر کھول
برے۔ آجا۔“

عشق کا الگ الگ مسرزم ہوتا ہوگا۔ جو شخص تھوڑی دیر پہلے مورنی کو موت

سکتی تھی۔ کوسوی کی ماں گھر کی عورت تھی۔ وہ ان چھ گھروالوں میں شامل تھی جو جانے
تھے اور جنہوں نے بابا کو کیا بدلتے دیکھا تھا۔ سردار کو بچانے کا اسے ایک ہی طریقہ۔ کچھ
میں آیا۔ وہ سردار کا بھالالے کر گاڑی کے پیچھے گئی اور الٹا بھالامنی میں گاڑ کے خود کو اڑ
میں چھید لیا۔ بھالادل کے پار ہو گیا۔ فوراً ہی جان نکل گئی۔ سورج چھپنے میں سمجھو ایک د
سانسوں کی دیر ہو گئی، ادھر بہو کی جان نکلی، ادھر بابا کے پران لوٹ آئے۔ سب دوڑے
دوڑے گئے۔ دیکھا پہلی رنگت دور ہو کر منہ پر سرخی آتی جا رہی تھی۔ بابا مرتے مرتے بڑا
گیا تھا۔ یہ جانثاری ہوئی تھی سردار کے لیے۔“

یہ کیسے لوگ ہیں۔ میں تکلیف سے گھوم کر مڑا مڑا ہوا مورنی کی صورت تنکے
رہا تھا۔ کیسے حیران کر دینے والے جانثار ہیں یہ لوگ..... میں ابھی کون سا سردار ہوں مگر
دیکھو کس طرح ڈوب کر اس نے اپنی بات کہی ہے۔ دل کو بڑی تقویت ہوئی۔

میں نے کہا۔ ”مورنی! اگر میرے پیر کھلے ہوتے تو میں تیرے پاس آتا۔ ہاتھ
آزاد ہوتے تو تیری پیٹھ تھپکتا۔ تجھ سے بات کر کے اس وقت بڑی ہمت ہوئی۔“
کہنے لگی۔ ”میں آزاد ہوتی تو تمہارے سینے لگ جاتی۔ پھر بھی دیکھو، کچھ کرتی
ہوں۔“ اور یہ کہہ کر اس باؤلی لڑکی نے اپنے بدن کو کسی طرح لڑھکا کر میرے پہلو سے
بھڑا دیا۔

یہ جانثاری کا ایک معصوم سا انداز تھا۔ مورنی بنے جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے
بھڑی ہوئی بندھے ہوئے بستر کی طرح پڑی تھی کہ اچانک ہی باہر آہٹ ہوئی اور جس
تیزی سے وہ قریب آئی تھی اتنی ہی تیزی سے دور چلی گئی۔ میں نے گردن ڈال کر ہولے
ہولے کر اہنا شروع کر دیا جیسے ابھی ہوش میں آرہا ہوں۔

یہ آنے والا وہ نہیں تھا جو مورنی کو الٹی میٹم دے گیا تھا کہ سوچ لے نہیں تو
الاف میں مرنے کے لیے تیار ہو جا۔ اس دوسرے نے آتے ہی ایک لات مجھے رسید کی۔
ایک اس لڑکے مورنی کے بھائی کے نکائی اور بولا۔ ”اٹھو رے ادھر مزے کرنے، سونے
کو نہیں آئے ہو..... تمہاری تو.....“

میں ہڑبڑا کے کچھ منہ ہی منہ میں بکتا ہوا اٹھا۔ مورنی کا بھائی بس کرہا تھا۔
ابھی تک بے ہوش تھا۔

مورنی نے اس نئے بوڑھے سے کہا۔ ”اس کے ہاتھ نہیں بندھے ہوتے تو
تیری ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ اپنی لنگڑی ٹانگ سے اس کی طرف اشارہ بھی کرتا۔“

میں نے جھک کر بے ہوش لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور خود بیٹھ کر اسے فرش سے اٹھاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

مورنی نے دونوں دشمنوں کی رائفلیں قبضے میں کی تھیں۔ پھر بجلی کی طرح اس نے فرش میں بنے چور خانے کا تختہ اٹھایا اور اندر جھانکنے لگی۔

وہ بولی تو اس کی آواز بے پناہ مسرت سے چھلکی پڑتی تھی۔ کہنے لگی۔ ”یہ کام کی گاڑی ہے سردار‘ سارا میگنیزین کار توں ادھر ہی ہے۔ اس خانے میں۔“

ابھی میں کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ گاڑی کا پردہ چیرتی ہوئی ایک گولی چھت میں پیوست ہو گئی۔ ”ہلنا مت۔“ کسی نے کھر در آواز میں برمی میں کہا اور گاڑی کا پردہ کھینچ دیا۔ دھوپ اندر آنے لگی۔

”اچھا۔ دونوں کو مار دیا؟“

سوال کرنے والے نے کسی سے بھی خاص طور پر سوال نہیں کیا تھا۔ پھر وہ بولا۔ ”چلو رائفل رکھ دو مورنی اور اس لڑکے سے اس کی زبان میں کہہ دو کہ تمہارے بھائی کو فرش پر ڈال دے۔ کوئی کہیں نہیں جا رہا۔“ اس کی آواز میں بلا کا تحکم اور قیامت کی خود اعتمادی تھی۔ ایک اندازہ سا ہو رہا تھا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔

میں نے سر گھما کر دیکھا، یہ وہی بھاگنے والا لگتا تھا جو بڑے میاں پر فار کرنے کے بعد شیر کی، میری دھاڑ سن کے بھاگا تھا۔ جسکے، ہاں یہ وہی باغی نقلی سردار جسکے تھا۔

مورنی فرش پر گھٹنا ٹیکے اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس نے ایک رائفل گلے میں پہنی ہوئی تھی۔ دوسری اس کے ہاتھ میں تھی۔ رائفل کا منہ گاڑی کے چور خانے کی طرف تھا۔ مورنی نے کم سے کم حرکت سے رائفل کو فار کے لیے تیار کیا۔ کرڑچ کی سی آواز ہوئی۔

جسکے نے چیخ کر کہا۔ ”اب ہلنا مت ورنہ گولی مار دوں گا۔“

”ہلے گا کوئی نہیں، جسکے۔ نمک حرام سائیں کے حرامی بیٹے۔ ہلے گا کوئی نہیں۔ اب ہم چاروں اس گاڑی کے ساتھ اڑ کے تیسرے آسمان تک ہی جائیں گے۔ بہت بڑی آواز کے ساتھ۔ میری رائفل کی نال ڈائنامٹ کے ڈبے پر سمجھ نکلی ہوئی ہے۔ اب میں چار تک گنوں گی۔ ایک ایک گنتی ہم چار زندہ آدمیوں کے لیے اگر چار گنتے بڑھیں تو نے ہتھیار ڈال کے ہم تینوں کو راستہ نہیں دیا تو ڈائنامٹ کے ڈبے کو گولی مار کر

کی دھمکی دے کر وصال کا طالب تھا‘ اب اس کی آواز اپنے ساتھی کو گولی مار دینے کے بعد کشاں کشاں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے اگلے حکم پر عمل درآمد کرنے۔

میں نے مورنی کا اگلا قدم خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ”خدا کرے۔“ میں نے دعا کی۔ ”خدا کرے ابھی اور آدھے منٹ تک اس گاڑی کی طرف کوئی نہ آئے۔ گولی کی آواز دور دور تک سن لی گئی ہوگی۔ خدا کرے ابھی کوئی نہ آئے۔“

اگر کوئی اور آواز مورنی کی آواز کے سوا کوئی بھی آواز عاشق کے کانوں کے رستے اس کے شعور تک پہنچ گئی تو ایک دل نواز محبوبہ کی آواز کا سر نوٹ جائے گا۔ کچے شیشے پر پتھر آگے گا۔

بوڑھے عاشق نے جیسے ایک محویت میں اپنی کمر سے خنجر نکالا۔ مورنی کے پیروں سے بندھی رسی کاٹ دی۔ ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا، پھر ہاتھوں کو باندھنے والی رسی کاٹ دی اور آدھی بیداری، آدھی نیند میں اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

میں نے اردو فارسی شاعری پڑھتے ہوئے حسن جفا پیشہ، قاتل، بے وفا اور ایسی درجنوں تراکیب محبوب ستم گر کے لیے استعمال ہوتے پڑھی ہیں۔ یقیناً یہ سب شاعرانہ اشاریت ہوتی ہوگی۔ کون بھلا اتنا ظلم کرتا ہو گا اپنے عاشقوں پر۔

بوڑھے عاشق کی آنکھیں بند تھیں۔ آہا، ”کی محویت اور تسکین کی آواز اس کے لبوں سے نکلی ہوگی۔ یہ آخری سے ذرا پہلے کی آواز تھی۔ اس فلی آخری آواز بڑی بھیاک تھی۔

کیونکہ مورنی نے گلے سے گلے لگے پوری طاقت سے عاشق کے پیروں پر اپنا گھٹنا مارا تھا۔ وہ ”ہودا“ جیسی کوئی آواز کرتا دہرا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر مورنی کے ہاتھ میں آگیا اور اس وحشی قبائلی لڑکی نے نیچے سے اوپر وار کرتے ہوئے اپنے اس عاشق کو کھول کے رکھ دیا۔

سودائے عشق میں رقیق ہوا اس کا لہو مجھ پر بھی گرا ہو گا۔ مورنی نے اس تڑپتے ہوئے جسم کو اس کے مقتول ساتھی پر پھینکا اور خون آلود خنجر سے میری رسیاں کاٹنے لگی۔

”چل سردار چل۔“ مورنی نے اپنے بے ہوش بھائی کے ہاتھ پیروں کی رسیاں کاٹ دی تھیں۔ ”اسے اٹھالے سردار۔ چل ادھر سے نکل چلیں۔“

چھید دوں گی۔ بودوم! ختم..... نہیں تو چل ہٹ جا۔“

میں نے جسکے کا چہرہ اچانک پسینے میں بھیسکتے ہوئے دیکھا۔

ہر آدمی سرداری کی ہوس کرتا ہے اور دل اس کا چڑیا یا شاید بکری جتنا ہے۔

جسکے تھوک نکل کر پھنستی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ”بکتی ہے تو جھوٹ بکتی

ہے۔ یہ وہ گاڑی ہی نہیں ہے۔“

مورنی فرش کے چور خانے میں دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے جیسے پڑھتے ہوئے

کہا۔ ”لے سن۔ ڈبے پر لکھا ہے اے، ’زید‘ کی اور نمبر پڑا ہے سولہ، پوائنٹ تین،

پوائنٹ.....“

”س..... سترہ۔“ جسکے نے ہکا کر ڈبے کا کوڈ نمبر اپنی یادداشت سے پورا کیا

تھا۔

مورنی خوش ہو کر بولی۔ ”ہاں سترہ۔ ارے واہ رے واہ۔ تجھے تو سب پتا ہے

رے سردار۔ چل پھر میں آخری گنتی گننا شروع کرتی ہوں..... ایک.....“

”کیا..... کیا کرتی ہے مورنی۔ ٹھٹھ، ٹھیر جا۔ سن تو مور.....“

مورنی نے گنا۔ ”دو۔“

”ارے بات سن۔“

”تین۔“

”یہ پڑی ہے رانفل۔ لو، لو، نکل جاؤ تم لوگ۔“ میں نے پیر بڑھا کر جسکے کی

رانفل اپنے قریب کر لی۔

مورنی نے کہا۔ ”کوٹ اور شرٹ اتار۔“

جسکے سردار نے اپنا بھڑک دار شکاری کوٹ اور ریشمی قمیض جس میں

دوسرے رنگ کی ڈھکن دار پیچ پانکس لگی تھیں، اتار ڈالی۔ کوٹ کی جیب لوہے سے بھاری

ہو رہی تھی۔

مورنی نے کہا۔ ”کوٹ کو ٹھوکر مار کے میری طرف پھینک جسکے۔“

اس نے کوٹ کو کھ مار کر مورنی کی طرف سر کا دیا۔ مورنی نے اس نقلی سردار

کو مسکرا کر دیکھا اور کوٹ کی جیب سے اس کا چھوٹا پستول نکال کر اپنے شلو کے کی جیب

میں پہنچا دیا۔ جسکے موٹے بنیان جیسے سوئٹر اور چمکیلی پتلون میں ملبوس ذلت و خواری میں

کھڑا فرش کو تکتے جا رہا تھا۔

مورنی کی آواز آئی۔ ”پتلون اتار اپنی۔“

”نن..... نن..... نہیں۔ یہ نہیں اتاروں گا۔“

”اتار۔ حرام کے۔ نہیں میں اڑادوں گی گولی سے۔“ مورنی نے پورے طیش

میں اس کی طرف رانفل سیدھی کی تھی۔

جسکے سردار نے ہیلت ڈھیلی کی اور مجبوراً اپنی چمکدار پتلون بھی اتار دی۔ وہ

دس دن کا میلا انڈرویز پہنے زلت اور غصے اور سردی میں کھڑا کانپ رہا تھا۔

مورنی نے اشارہ کیا کہ وہ اب پتلون کو بھی ٹھوکر لگا کے اس کی طرف پھینک

دے۔

جسکے نے ایسا ہی کیا۔

پتلون کی جیسیں چابی کے کچھوں سے بھاری ہو رہی تھیں۔

میں مورنی کے بھائی کو کاندھے پر لادے جسکے کی رانفل اپنے جوتوں کے

حصار میں لیے کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔

مورنی مجھ سے کہنے لگی۔ ”آپ میرے بھائی کو ادھر ہی لٹا دو۔ اب ہم جسکے

کے ساتھ کہیں سیر کو چلیں گے۔“ مورنی نے مجھے دکھا کر چابیوں کے گچھے اچھالے

تھے۔

میں نے اس کے بھائی کو گاڑی، پھر گاڑی کے فرش پر لٹا دیا۔ اس نے کراہ کر

کروٹ بدلی تھی۔

مورنی فرش کے خفیہ خانے کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے آنکھ کا

اشارہ کیا۔ میں نے فرش پر پڑی رانفل اٹھائی اور جسکے پر سیدھی کر لی۔

مورنی نے اس سے کہا۔ ”کس کس گاڑی میں ہمارے جوان ہیں۔ یہ چابیاں لے

چل اور کھولنا جا نہیں۔“

جسکے نے احتجاج کیا۔ ”ایسے۔ ایسے نہیں جاؤں گا میں۔“

”میں یہ تیری جڈی بھی اترا دوں گی۔ اتنا سمجھ لے۔ اگر اس طرح نہیں چلے گا

تو جان پھر اس طرح جانا پڑے گا۔“

جسکے نے منہ ہی منہ میں گالی دی اور چابیاں سنبھالے گاڑی سے اتر کر ہمارے

آگے چل پڑا۔

اٹھ نو آدمی جو سبھی بڑی عمروں کے تھے، رانفل میں اٹھائے ہماری طرف

گی۔

آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں مورنی کے سب ساتھی۔ بڑے میاں کے مرید سامنے میدان میں قطار بنائے کھڑے تھے۔ مویشی باندھنے کی جن زنجیروں اور تالوں سے مخالف گروہ نے ان نوجوانوں کو گرفتار کر رکھا تھا۔ ان سے اب ہم نے کام لیا۔ وہ زنجیر تالے اب دس بارہ باغیوں اور ان کے سرغنہ کے حصے میں آئے تھے۔

اگلے دو گھنٹوں میں قافلے کی گاڑیاں، مال مویشی اور بال بچے اکٹھا ہو گئے۔ قبیلے کے دستور کے مطابق نوجوانوں نے جسکے اور اس کے ساتھیوں کے پاس ہتھیار اور نقدی نہیں رہنے دی۔ ان کی چھ گاڑیاں، بال بچے جو ان کے ساتھ جانا چاہتے تھے اور گنتی کے جانور جو ان کے بچوں کی دودھ کی ضرورت پوری کر سکتے، ان کے حوالے کر گئے اور انہیں راتوں رات ارادوی دریا کی ترائی میں ہانک دیا۔ وہ باغی گروہ والے قبیلے کے ساتھ امپھال کے سالانہ میلے میں نہیں جاسکتے تھے۔

مورنی اور اس کے بھائی کسی مردار کے نہ ہوتے ہر بات مجھ سے پوچھ پوچھ کر کر رہے تھے۔ میں قبیلے کے دستور سے واقف نہیں تھا۔ پھر یہ معرکہ تو تنہا مورنی نے سر کیا تھا۔ میں نے کون سی سرداری دکھائی تھی۔ پھر بھی ان بہن بھائی کو خوش کرنے کو میں نے نام کا سردار بننا گوارا کر لیا۔

رات پڑے نوجوانوں کے ہنگامی جرگے میں فیصلہ کیا گیا کہ امپھال کے میلے میں ہماری گاڑی بان دوست جسکے کے بیٹے اور مورنی کے بھائی کو مشترکہ سرداری دے کر بھیجا جائے گا۔ باقی قبیلہ ایک دن رک کر آگے جائے گا۔ میرے ساتھ مورنی اور بیالا بائے بڑے میاں کی گاڑی میں مانگ یاں روانہ ہوئے۔ یہ بیالا بائے وہ لڑکی تھی جو سب کے مشورے اور اپنے میاں کے کہنے سے جسکے کی گاڑی میں اس کی عورت بن کے بیٹھ گئی تھی۔

مانگ یاں جاتے ہوئے میں تھکا ہوا اور اداس تھا۔ بڑے میاں کی آخری رسوم دن نکلنے سے پہلے نوجوانوں نے بہت عقیدت سے ادا کی تھیں۔ وہ بہت اداس، بہت دل گرفتہ تھے۔ میں نے بڑے میاں کے ساتھ بہت کم وقت گزارا تھا مگر اتنے کم دنوں میں بھی میں ان سے اس حد تک مانوس ہو گیا تھا کہ چتا پر رکھی ان کی میت کا آخری دیدار کرنے، سلامی دینے بڑھا تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

یہ بوڑھا آدمی میرے دین، میرے مسلک کا نہیں تھا۔ زبان بھی کوئی اور بولتا

بڑھے۔ وہ کوؤں کی طرح کائیں کائیں کرتے آرہے تھے۔

جسکے میری زد پر تھا۔ مورنی نے اپنی رائفل اس بے سرے ہجوم پر سیدھی کر لی۔ بولی۔ ”اس نفلی سردار کو اور تمہارے مال مویشی اور بال بچوں کو اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہیں، ہم روکیں گے نہیں۔ ہاں ہمارے ساتھیوں کو اور اس سامان کو جو تم نے ہم سے چر لیا ہے، واپس کر دو گے تو ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ جھنجھٹ اور چالاکی کرو گے تو گولی چلے گی اور ہم تمہیں بھی اس سائیں کی اولاد جسکے کی طرح ننگا کر کے جنگل میں دوڑا دیں گے۔“

ان میں سے ایک زیادہ ہک ہک کرنے لگا تو مورنی نے بڑھ کے اس کی پنڈلی پر اپنے شکاری بوٹ کی سخت نوک سے ٹھوکر لگائی اور اس کی بندوق رکھوالی۔ آہستہ آہستہ سب نے اپنے ہتھیار زمین پر ڈال دیئے۔“

میں نے دیکھا مورنی کا بھائی سر پکڑے آرام آرام سے چلتا ہوا ہماری طرف چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب رائفل تھی۔

ہم ڈانٹاٹ والی گاڑی کو بے مکران چھوڑ آئے تھے۔ اب مورنی کا بھائی ہوش میں آیا تھا تو وہ بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ میں نے مورنی سے آہستہ سے کہا۔

”اپنے بھائی کو گاڑی کے پہرے پر بھیجو۔ اس سے کہو وہیں رہے۔“

مورنی نے ہنستے ہوئے پوری آواز سے کہا۔ ”کیوں؟ اس گاڑی میں کیا ہے؟“

وہ عجیب بات کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”واہ، بھول گئیں، گاڑی میں ڈانٹاٹ مکار توں، میگزین نہیں ہے؟“

مورنی آرام سے بولی۔ ”نہیں تو بسکٹوں کے ڈبے ہیں۔ وہ سب تو میں نے اس جسکے سردار کو ستانے اور ڈرانے کو کہا تھا۔“

حد کر دی اس لڑکی نے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پہلے اسے پھر جسکے کو دیکھا۔

جسکے نے انڈریز بنیان میں لرزتے ہوئے مورنی کو بڑی بھاری گالی دی، وہ برا نہیں مانی۔ ہنس کے جسکے سے بولی۔ ”پتا نہیں بارود کار توں کس گاڑی میں ہیں۔ ویسے مجھے بیٹیوں پر لکھے نمبر یاد تھے اور جسکے وہ تجھے بھی یاد تھے۔ بس میرا کام نکل گیا۔“ پھر ایک دم تیور بدل کر وہ بولی۔ ”چل ہمارے ساتھیوں کو آزاد کر دے۔ ہنسنا ہنسنا ہو چکا۔ سیدھی طرح سب کو کھولتا جا نہیں جیسے تیرے اس حرامی کو مار پیچکا ہے، تجھے بھی مار دوں

کہنے لگی۔ ”سوچو مت، اس کے پاس جاؤ۔ وہ یہ بات پسند کرے گی، شاید تمہارا انتظار کرتی ہوگی۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر چپ رہا تو بولی۔ ”تم پٹھان ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں مگر تم کیوں پوچھتی ہو؟“

بولی۔ ”پٹھان کیا شرمیلے ہوتے ہیں؟“

عجیب سوال تھا۔ میں نے کہا۔ ”مجھے نہیں پتا، شرمیلے سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ پٹھان مسلمان ہوتے ہیں اور ہمارے دین میں جن چیزوں کو بہت ناپسند کیا جاتا ہے، ان میں ایک بے شرمی بھی ہے۔ اس طرح تم کہہ سکتی ہو کہ ہم..... مطلب شرمیلے ہوتے ہیں۔“

”ایک لڑکا تھا۔ پٹھان تھا وہ بھی۔ ادھر تمہارے ایسٹ پاکستان سے آیا تھا۔ بہت شرمیلا تھا۔“

وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی، میں نے جہاں لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا۔“

کہنے لگی۔ ”میرا نام تھا اس کا۔ تمہاری عمر کا.....“

میں نے جھٹکنے سے سراٹھایا۔ ”کیا نام تھا؟“

”میرا باز۔ کوئی جگہ ہے کاسیم بازار وہاں کے کسی ہوٹل میں.....“

”کہاں ملا تھا وہ میرا باز؟ کہاں ہے وہ؟“

”پریشان کیوں ہو گئے ہو؟ مانگ یان میں دیکھا تھا۔ اب خبر نہیں کہاں ہے۔“

میرا باز؟ مانگ یان؟ وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟ میں نے اس لڑکی بیالا بائے سے

پوچھا تو بولی۔ ”کرے گا کیا؟ بابا سردار نے لڑکوں کے رہنے کے کمرے بنائے ہیں۔ میں

نے وہیں ایک کمرے میں اسے دیکھا تھا۔“

”حیرت ہے۔ کمال ہی ہو گیا۔ واہ“ میں نے جوش مسرت سے کئی بار دہرایا۔

پوچھا۔ ”وہ کب سے ہے؟“

بولی۔ ”میں نے زیادہ ہو گیا بابا نے کسی چوکی گارد سے اسے نکالا تھا۔ زخمی تھا۔

ادھر ہی مانگ یان کالج میں چھپا کے رکھا تھا۔ دوا دارو کی تھی۔ میں نے جب دیکھا تھا،

ٹھیک تھا۔“

بڑے میاں نے میرا باز کے بارے میں مجھے کیوں نہیں بتایا؟ کیوں..... شاید

راپانک سامنے لا کر خوش کرنا چاہتے ہوں گے۔

تھا مگر اس نے اپنی دلاویز شخصیت اپنی شرافت اور توجہ سے میرا دل جیت لیا تھا۔
مورنی نے چٹا کو آگ دکھائی، پھر وہ قریب ہی مٹی پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور
بلک بلک کر اس طرح روئی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

بہت سے نوجوانوں کی یہی حالت تھی۔ میں نے سوچا، یہ اس بابا کا خون نہیں
تھے۔ کو سومی ان کی پوتی ہے، اس کا کیا حال ہوگا۔

مانگ یان جاتے ہوئے وہ لڑکی بیالا گاڑی ہانک رہی تھی۔ میں اس کے برابر
بیٹھا برما کے موسم خزاں کے رنگ اچھالتے جنگلوں کو اداسی سے دیکھتا تھا۔ مجھے اپنے گھر
والے یاد آرہے تھے۔

میں بہت دیر سے خاموش تھا۔ بیالا نے پوچھا۔ ”کچھ کھاؤ گے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

کہنے لگی۔ ”اگر تمہیں نیند نہیں آرہی ہو، اندر مورنی کے پاس جا کے بیٹھو۔ وہ
بہت بکھری ہوئی ہے۔ باتوں سے..... بابا کی باتوں سے اس کا دکھ ہلکا کرنے کی کوشش
کرو۔ وہ تمہیں بہت مانتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔ مانتی تو ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اسے تنہا چھوڑ دوں گا تو
سنبھل جائے گی۔“

بیالا بائے نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ ”تنہا کسی بڑے دکھ کو نہیں جھیل
جاسکتا۔ تم اس کے پاس جاؤ، ساتھ ہی لیٹ جاؤ، باتیں کرو اس سے۔ رات وہیں رہنا۔ اسی
طرح دکھ بٹاتے ہیں۔“

میں نے اندھیرے اجالے میں اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ یہ کیا کہہ
رہی ہے؟ دل گرفتہ تو یہ عورت بھی ہے۔ ایسے میں کوئی مذاق چھیڑ چھاڑ تو نہیں کرتا۔

اس کا چہرہ سادہ تھا۔ یہ بات بیالا نے سنجیدگی اور معصومیت میں کہی تھی۔

لمبے بھر بعد اس کو یاد آیا کہ میں اس کے کسی فقرے پر حیران ہو کر خاموش ہوا

تھا اور اس طہرے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگی۔ ”اپنے اپنے دیس کے طریقے ہوتے ہیں۔ ہم

قبائلی اس بات کو اس طرح سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی کھوٹ، کوئی ہلکا پن نہیں ہے۔ تمہیں

اگر کوئی بات بری لگی ہو تو.....“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”بری نہیں لگی۔ نئی بات سنی ہے۔ عجیب لگی ہے۔

اس لیے سوچ میں پڑ گیا۔“

اور قرضہ؟ دو ہزار کا قرضہ لا حول ولا قوت۔ میں نے دل میں کہا۔ وہ قرضے کی کہانی بڑے میاں نے میرے لیے گھڑ لی تھی۔

بیلا کے چہرے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ ایک دم کہنے لگی۔ ”جسکے کا بڑا بیٹا رائل، کوسوی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ سنا ہے وہ ان لوگوں کو ڈھونڈتا تھا ہمارے پورے پاکستان تک گیا تھا۔ ادھر جنگل میں ریچھ نے زخمی کر دیا تھا، اسے ابھی بچا نہیں بچا، کچھ خبر نہیں۔“

”اوہ تو وہ ڈرائیور جسکے کا بیٹا رائل تھا؟“

”ہاں۔“ لڑکی نے سیدھا سا جواب دیا تھا۔ ظاہر ہے بڑے میاں کے کا یا بدلنے کا راز اسے نہیں معلوم ہو گا جبکہ اس عورت کے میاں کو جو اس وقت مانگ یاں میں ہے، سب کچھ خبر تھی۔

ٹھیک تو ہے چھ آدمی پورے تھے۔ ساتویں کو معلوم ہونا گویا موت تھی۔ بابا کی ان میں سے ایک کی۔

بیلا پوچھنے لگی۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ہمارے ایسٹ پاکستان میں بہت ریچھ ہیں۔“

کہنے لگی۔ ”تمہارے پاکستان سے زیادہ ریچھ ادھر برما میں ہیں مگر یہاں ریچھ کے ہاتھ نہیں آیا، رائل ادھر جا کے مرا۔“

”کیا پتا زندہ ہو۔“

بولی۔ ”اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔ ایک دم باپ جیسی بد معاشی ہے اس میں۔“

برے لوگوں کو یاد کرنا شروع کیا تھا تو ایک سرے سے سب کے نام یاد آنے لگے۔ سلسل چودھری، اس کا بھتیجا بازار یعنی وہ بد معاش بذل الرحمن اور ان کے سب ر خرید گر گئے۔ سوم ناتھ دتہ اور جسکے کا بیٹا وہ رائل۔ عجیب بات ہے ان دو برے آدمیوں رائل اور بازار کا ساتھ کس طرح ہو گیا؟ شیطانی اتفاق تو دیکھو ملاقات ہو گئی ان کی۔

میں نے سوچا جس طرح بڑے میاں کو ہم دونوں یعنی میں اور میرے بازر مل گئے تھے اور کاکسین بازار سے نکل کے جس طرح مجھے اچھے لوگ ملتے گئے، اسی طرح جرائم دل اور سازشیوں کو بھی ان جیسے لوگ مل جاتے ہیں۔

اچانک بیلا بائے نے کہا۔ ”تم اندر نہیں گئے، کیوں نہیں گئے؟“

لڑکی بیلا نے پوچھا۔ ”وہ کون ہے تمہارا؟“

میں نے کہا۔ ”بھائی ہے۔“

پوچھنے لگی۔ ”سگا؟“

میں نے کہا۔ ”سگا نہیں مگر اپنا ہی ہے۔ میرے باپ کے گیسٹ ہاؤس میں کام

کرتا تھا۔“

”ہاں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”بولتا تھا ہوٹل میں نوکر ہوں۔ کیا ہوٹل کے مالک تم ہی

لوگ تھے؟“

میں نے سر ہلا کر ہاں کہا تو تعریفی انداز میں بولی۔ ”نوکر کو بھائی بولتے ہو۔“

”خوب۔“

میں نے کہا۔ ”خوب کہا۔ میرے باپ نے اسی طرح رکھا ہے۔ میرے باپ کو اپنا بچہ

سمجھتے ہیں۔“

مجھے میرے باپ اور خدا بخش رائل بہت یاد آرہے تھے۔

بہت دیر تک میں بیلا کو اپنے کاکسین بازار میں گزارے شب و روز کے بارے

میں بتاتا رہا۔ میں نے بتایا کہ میں بابا اور کوسوی سے پہلی بار کن حالات میں ملا تھا تو بیلا

بولی کہ وہ بابا اور کوسوی کے لیے بہت سختی کا زمانہ تھا۔ تین طرف سے پریشانیوں گھیرے

ہوئے تھیں۔ ایک تو برما کے سرکاری لوگوں نے بابا کا جینا دو بھر کر دیا تھا۔ دوسرا یہ جسکے

پریشان کر رہا تھا۔ تیسرا کوئی آسامی تھا۔ ہندوستانی، دتہ نام کا وہ کیا جانے کس بات پر بابا

کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

میں نے سوم ناتھ دتہ، ہندوستانی جاسوس کا نام لیا تو لڑکی بیلا کو یاد آگیا۔ کہنے

لگی۔ ”ہاں وہی حرام کا جتنا سوم ناتھ دتہ۔ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے اور سرکاری

کارندوں سے جان بچانے کو ہی تو برما سے پورے پاکستان نکل گئے تھے بابا۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی بری ڈرائیور بھی تھا جو کوسوی سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔“

بیلا سوچ میں پڑ گئی۔ ”نہیں ایسا کوئی نہیں تھا۔“ پھر وہ ہنس کر بولی۔ ”کسی

ڈرائیور سے کوسوی کی شادی کا ہے کو ہوگی اس کے تو کالج میں ہی کوئی بارہ چندرہ ڈرائیور

نوکر ہیں۔“

تو بازار کا وہ بری ڈرائیور کون تھا جو بڑے میاں کو دیئے ہوئے قرضے کے

عوض کوسوی کی شادی کر دینے پر دباؤ ڈال رہا تھا۔

”مگر کیا مورنی؟“

کہنے لگی۔ ”تمہارا رہن سہن، تمہارے دستور شہروں کے ہیں۔ پھر تم مسلمان بھی ہو۔“

”ہاں۔ مسلمان ہوں۔“

کہنے لگی۔ ”مسلمانوں میں ایسی باتوں پر تو پابندی ہے۔“

”ہاں ہمارے ہاں اور بھی دوسرے دینوں میں بھی پابندی تو ہے۔ تم بہت پرانا قبیلہ ہو، کسی بہت پرانے طریقے پر چلتے ہو گے۔ خیر“

”سمجھتی ہوں میں نے جسکے کی گاڑی میں بیالا کے بیٹھے۔ اس کی عورت بن کے بیٹھنے کی بات کہی تھی۔ جب بھی تمہیں بڑی حیرانی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں سمجھی نہیں۔ سوچنے لگی، اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے شیر علی سردار کو بھلا اچنچھا کیوں ہوا ہے؟ پھر میں نے سوچا، یہ بات ہم کسی باہر والے سے کبھی نہیں کہتے۔ سردار شیر علی باہر والا نہیں ہے مگر پھر بھی ہے تو.....“

میں نے ہاں کہتے ہوئے سر ہلایا۔

مورنی بولی۔ ”بابا کے بعد میں بالکل جیسے بے ماں باپ کے ہو گئی۔ ماں باپ تو سمجھو یاد بھی نہیں تھے۔ مجھے بابا ہی تھے سب کچھ۔“ وہ پھر رونے لگی۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ لے کر تھپکا تو اس کو کچھ قرار سا آیا۔ اپنی بات پوری کرنے کو وہ بولی۔ ”بابا کے بعد، سردار کوئی نہیں..... سوا نہارے تم ہی تھے سردار تو میں نے سوچا، تم آؤ گے، تسلی دو گے..... رات ادھر ہی میرے پاس رہو گے۔“ اس نے آنکھوں سے اپنے پہلو کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پھر بولی۔ ”پھر بہت دیر بعد جب میں رورو کے سونے لگی تھی۔ مجھے یاد آیا تھا کہ تم تو شیر علی ہو، مارے ہو پر ہم سے باہر کے بھی ہو۔“

میں آہستہ سے سیٹ سے اتر کر فرش پر اس کے برابر اس کے کبل سے ٹک کے بیٹھ گیا۔ اس نے کبل سے دونوں ہاتھ نکال کر میرے ہاتھ تھام لیے۔

میں نے کہا کہ اب تم سونے کی کوشش کرو۔ میں بیٹیں ہوں۔ تمہارے پاس بٹار ہوں گا، فکر مت کرنا کوئی..... ہاں اور دیکھی مت رہو۔

وہ آہستہ سے گنگنائی۔ ”فکر مجھے اب کوئی نہیں..... تم آگئے نا میرے..... سردار۔“ اور اس نے سر اٹھا کر میری گود میں رکھ لیا۔

مجھے یاد آیا کہ اندر گاڑی میں وہ غم زدہ لڑکی مورنی موجود ہے۔ میں نے سوچا، وہ اگر جاگتی ہوئی تو کچھ دیر اس سے باتیں کر کے پھر باہر آ بیٹھوں گا۔

مگر بیالا بائے نے اپنے رواج کے مطابق معصومیت میں جس بات کا مجھے مشورہ دیا تھا، وہ میرے عزت دار کہنے، میری تربیت بلکہ میرے پورے سماجی اور دینی نظام اخلاق کے منافی تھی۔

بیالا نے مشورہ دیا تھا کہ میں اسے تنہا دکھ جھیلنے کے لیے نہ چھوڑوں۔ مورنی بہت بکھری ہوئی ہے۔ اس نے کہا تھا۔ ”تم اس کے پاس جاؤ، ساتھ ہی لیٹ جانا۔ باتیں کرنا اس سے..... بابا کی باتیں اور رات وہیں رہنا۔ اسی طرح دکھ بناتے ہیں۔“

یہ عورت بیالا کہتی تھی کہ وہ قبائلی اس بات کو اسی طرح سادہ اور معمول کے مطابق سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی کھوٹ، کوئی ہلکا پن نہیں ہے۔

میں گاڑی ہانکتی ہوئی اس عورت بیالا بائے کے برابر سے اٹھا اور اس کے عقب میں کھٹکے سے کھٹنے والی کھڑکی کھول کر گاڑی میں چلا گیا۔

ہرے رنگ کی چنی چڑھا مٹی کے تیل کا لیپ گاڑی کی اونچی چھت سے لٹک رہا تھا۔ اس ہرے اندھیرے میں بھاری کبل اوڑھے وہ سیٹوں کے درمیان فرش پر لیٹی تھی۔

میں لیٹی تھی، اس لیے کہا کہ جاگ رہی تھی۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ تھوڑا ایک طرف سرک گئی اور فرش پر میرے لیے جگہ کر دی مگر میں برابر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے کبل سے ہاتھ نکال کر کھٹنے پر ٹکا دیا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیسی ہو مورنی؟“

اس نے اداسی سے مجھے دیکھا اور ہاں میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ”بیالا نے کہا تھا کہ مجھے آنا چاہیے۔ میں بہت دیر سے یہاں آنے کی سوچ رہا تھا۔“

وہ دھیرے سے بولی۔ ”آ جاتے.....“

”تمہارے..... تمہارے قبیلے کے اپنے دستور ہیں۔ سب جگہ کے اپنے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔“

”اچھا..... وہ۔“ مورنی نے سمجھ کر سر ہلایا۔ ”اسے تم سے نہیں کہنا تھی“

بات..... تم اپنوں میں تو ہو مگر.....“

لیتا ہے۔ یہ ساتھ جینے مرنے کی سوگند (قسم) ہوتی ہے۔“
میں نے ہنس کر کہا۔ ”مگر میں نے تمہاری پیشانی نہیں چومی، اس لیے بے فکری ہے۔“

اس نے جھٹ میرا سر تھام کے میری پیشانی چوم لی۔
میں نے پوچھا۔ ”یہ کس لیے؟“

بولی۔ ”یاد دلانے کو کہ آگے جب بھی میرا سر تھامو تو پیشانی چومنا مت بھولنا۔“

اس نے، مورنی نے یہ بات اتنی لگاوت، اس قدر محویت سے کہی تھی کہ میں ڈر گیا۔

وہ سمجھ گئی۔ بولی ”مرضی ہے تمہاری..... تم اگر مجھے اپنی بیوی نہیں بناتے تو نہ سہی۔ عورت بنالو۔ اپنی چادر دو، یہ گاڑی سردار کی تھی اور اب تمہاری ہے یہ گاڑی۔ میں تمہاری چادر اپنے اوپر لے کے تمہاری عورت بنی جاتی ہوں۔ ابھی لو۔“
میں نے تنبیہ کی سے کہا۔ ”مورنی! یہ گاڑی سردار کی ضرور ہوگی مگر میں سردار نہیں ہوں اور میرے پاس کوئی چادر نہیں ہے جسے تم اوپر لے کر اپنا دستور پورا کرو گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے ابھی بیوی کی یا عورت کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے سب سامنے کام پڑا ہے۔“

کہنے لگی۔ ”میں تمہارے کام میں ہاتھ بٹاؤں گی۔“

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ تم بڑی ہمت والی، بہت پکی دوست لڑکی ہو۔ تم ایسا ہی کرو گی مگر دشمن میرے اپنے ہیں اور بختون روایت یہ ہے کہ اپنے دشمنوں سے خود ہی نپٹا جاتا ہے۔ عورتوں کو تو بالکل دور رکھتے ہیں۔ دوستوں سے بھی دور رکھتے ہیں اور دشمنوں سے بھی۔“

پوچھنے لگی۔ ”دور کیسے رکھ سکتے ہو۔ زندگی میں تو ساتھ ہوتی ہیں عورتیں“
ایک ایک قدم پر ساتھ ہوتی ہیں۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”مرنے جینے کی ساتھی ہوتی ہے عورت مگر حجرے میں اور لڑتے وقت باہر درے میں عورت ساتھ نہیں ہوتی، ناں ناں۔ حجرے میں ہم دوستوں کے سامنے بیٹھتے ہیں اور درے میں دشمنوں کے سامنے اور یہ دو وقت ایسے ہوتے ہیں جب ہم اپنے دوستوں، اپنے باپ، بھائیوں اور بیٹوں کے ساتھ ہی اچھے لگتے ہیں۔“

تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گئی۔

بھینسا گاڑیاں بہت آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔ جتنی دیر وہ میری گود میں سر رکھے ہوتی رہی، گاڑی نے بہت ہوا تو پانچ سات میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا۔ مانگ یاں کتنی دور ہو گا۔ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ بیالا کو میل، کلو میٹر کی کچھ خبر نہیں تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ خوب دن نکل آئے گا، تب ہم مانگ یاں کے قریب پہنچیں گے۔ وہاں بیالا ہمیں گاڑی کو سب کی نظروں سے چھپا کر چلی جائے گی اور خود مانگ یاں کالج جا کر اپنے میاں کو لے کر آئے گی۔ ایک دم گاڑی لے کر کالج کے سامنے جا کھڑے ہونا خطرناک ہو گا۔ اس نے بتایا تھا کہ سرکاری لوگ ابھی تک کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ بیالا کا خیال تھا کہ کیونکہ میں صورت اور زبان سے برما قبائلی نہیں لگتا، اس لیے وہ قبائلیوں کے تحفظ کے کسی قانون کا سہارا لے کر مجھے ستا سکتے ہیں۔

میں نے گاڑی کے پردوں کے پیچھے روشنی بڑھتے محسوس کی۔ صبح ہونے والی تھی۔ ایک بار کھڑکی کھول کر بیالا بائے نے اندر جھانکا تھا اور مورنی کا سر میری گود میں اور اسے گہری نیند سوتے دیکھ کر سر ہلا کر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا گل تھپک دیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم۔ اس سے کیا مقصد تھا اس کا اور وہ کیا سمجھی بیٹھی تھی۔

مجھے پروا بھی نہیں تھی۔ ایک نوعمر، دلیر اور سادہ لڑکی کو میری رفاقت سے سکون ملا تھا، اس کا غم ہلکا ہوا تھا۔ بس میرے لیے یہی کافی تھا۔

باہر روشنی بڑھ رہی تھی۔ سوتی ہوئی مورنی کو اس کا احساس ہو گیا تھا اور وہ کسمار ہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مسکرائی اور میرے گلے میں بانٹیں ڈال کر آسودہ بلی کی طرح اٹھ بیٹھی۔ وہ فرش پر پھسکوا مارے مجھ سے کئی بیٹھی تھی۔

کہنے لگی۔ ”تم کو تھکا دیا میں نے۔ آں؟“

میں نے کہا کہ نہیں تھکن کس بات کی؟ تم بہت ہلکی ہو اور پھر سارے بدن کا بوجھ تو فرش پر تھا، میں تو تمہارے سر کو سہارے ہوئے تھا۔

بولی۔ ”سر تھامنا کسے کہتے ہیں ہماری قبائلی زبان میں..... کچھ خبر بھی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

بولی۔ گو نے (شادی) کے وقت میاں اپنی بیوی کا سر تھام کر اس کی پیشانی چوم

بنا بھینسے کی اس گاڑی کو دھکا دے کر اب اس برجی یا چھپرے کے نیچے پہنچا دیا اور بانسوں کی چٹائی کا بنا پھانک بند کر دیا۔ گاڑی اب سڑک سے نظر نہیں آتی تھی۔ چارپانچ منٹ پہلے گزرنے والی بھینسا گاڑی سڑک سے بالکل غائب ہو گئی تھی۔ بیالا نے مجھے خاص مہمانوں کی طرح ہاتھ پکڑے پکڑے لے جا کر برجی یا چھپرے کے پیچھے سفید اور سیاہ تارہوار پتھروں سے چن کر بنائی ایک جھونپڑی میں پہنچا دیا۔ جھونپڑی کی دیواریں چوڑے پتھروں کی اور چھت گھاس پھوس کی تھی۔ چھت پر زردی مائل سبز پتوں کی تروتازہ تیل چڑھی تھی۔ تیل اتنی کھنی تھی کہ چھت کا گھاس پھوس تک پوری طرح چھپ گیا تھا۔

بیالا کہنے لگی۔ ”یہ بابا سردار کے ایک ششو (مرید) کا کھیت اور چھپرہ ہے۔ جب سے سرکاری لوگوں نے کالج کی زمین کا جھگڑا کھڑا کیا ہے، مانگ یان میں داخل ہونے سے پہلے ہم لوگ یہاں کچھ دیر رکھتے ہیں۔ جب معلوم ہو جاتا ہے کہ سب ٹھیک ہے تو آگے بڑھتے ہیں۔“

بابا کا ششو اس وقت کہیں گیا ہوا تھا، اس کی بیٹی اور بہت سے نواسا، نواسی بیٹوانی کو جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ششو کی بیٹی چالیس پینتالیس سال کی صحت مند عورت تھی۔ خود آس کے بیٹا، بیٹی بیس ایکس برس سے لے کر نو دس سال تک کے تھے۔ سبھی صحت مند اور تیز دار لگتے تھے۔

بڑا بیٹا جو ہماری گاڑی کو دھکا دیتا ہوا چھپرے میں چھوڑ آیا تھا، میرے برابر آکر بیٹھ گیا اور خوش ہو کر بتانے لگا کہ وہ مانگ یان کالج میں فزکس، کیمسٹری کا کورس کر رہا ہے۔ کہنے لگا۔ ”میں انگریزی بھی بول سکتا ہوں۔“

ابھی میں مانگ یان پہنچا بھی نہیں تھا کہ بڑے میاں کی بوٹی ہوئی تعلیم کی فصل لہلہاتی ہوئی نظر آتا شروع ہو گئی تھی۔

مورنی اور بیالا مجھے اس خوشحال کسان گھرانے کے حوالے کر کے چلی گئیں۔

ان سادہ دل مہمان نواز لوگوں نے میری اتنی خاطر مدارات کی کہ مجھے اپنے پاکستان کے قصوں، گاؤں دیہات کی تواضع، مہمان نوازی یاد آگئیں۔ شاید دنیا بھر میں کسانوں، چرواہوں، ملاحوں کا مزاج ایک جیسا ہوتا ہے۔

فطرت فراخ دل ہوتی ہے۔ وہ انہیں کھیتوں، مرغزاروں میں اور جمیل، تالابوں، دریاؤں میں فراخ دلی سے نصیحتیں دیتی ہے اور یہ کسان چرواہے، ملاح کھلے دل سے

وہ ہنسی بولی۔ ”تو ٹھیک ہے۔ میں تمہیں بیٹے دوں گی۔ حجرے میں اور درنے میں ساتھ بیٹھنے کے لیے۔ میں شیر جیسے بیٹے دوں گی، وعدہ۔“

میں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی۔ ”ابھی بیٹے نہیں چاہئیں۔ ابھی تو، تو مجھے کچھ کھانے کو دے۔ مورنی! بہت بھوک لگی ہے۔“

عورت کتنی ہی خوابناک، کیسی ہی سرشاری میں ہو، جیسے ہی اسے خبر ملتی ہے کہ مرد بھوکا ہے، وہ اپنی سرشاری اور خواب سے باہر آ جاتی ہے۔ وہ مرد کو بھوکا پیٹ نہیں دیکھ سکتی۔ مورنی نے لپاک جھپاک کر کے کچھ ادھر ادھر سے خشک میوے، بکری کے دودھ کا پنیر اور چاول کے پھولے لادے۔ کہنے لگی۔ ”ابھی اس سے گزارہ کرو۔ مانگ یان میں بہت اچھا کچھ کھلاؤں گی۔“

میں کچھ کھاپی کے فارغ ہوا تھا کہ بیالا نے بتایا، وہ اب گاڑی کو اور ہمیں چھپانے لے جا رہی ہے۔ میں اور مورنی باہر ہی آ بیٹھے۔ مجھے تو یہ دیکھنا تھا کہ وہ گاڑی کو بھینسے سمیت کیسے چھپاتی ہے۔

ہم ایک ٹھکلی ندی کے ساتھ چلتی کچھ کچی پکی سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ سڑک کے ایک طرف ندی کنارے اونچی گھاس اور سرکنڈوں کے جھنڈ تھے، دوسری طرف گنے کی فصل کھڑی تھی۔ گاڑی کے دونوں بھینسے پانی کے قرب کی وجہ سے اور زیادہ ست رو اور نکمے ہو گئے تھے۔ بیالا نے انہیں تیز چلنے پر اکسا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گاڑی کو ان بھینسوں کے حوالے کر کے اب تیز تیز چلتی ہوئی کافی آگے نکل گئی۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد گنے کی فصل میں کھڑی گھاس پھوس کی ایک برجی سی نظر آئی۔ جیسے برسات میں چارا اسٹور کرنے کے لیے چھپرا بنا لیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح۔ گاڑی نے اس چھپرے تک پہنچنے میں پانچ سات منٹ اور لیے۔ چھپرہ قریب آگیا تو میں نے دیکھا، اس پر بانس کی سیڑھی لگائے کچھ عورت مرد کام کر رہے تھے۔ ایک عورت مجھے بیالا بائے جیسی لگی۔ وہ سیڑھی سے اتر کر دوڑتی ہوئی ہماری طرف آئی تو معلوم ہوا بیالا ہی ہے۔ اس نے اپنا سفری لباس اتار کر برمی کسانوں کا سیر وگ شلوکا پہن لیا تھا۔

بیالا نے ہاتھ پکڑ کر مجھے گاڑی سے اتار لیا۔ مورنی نے کوڈر خود کو گاڑی سے اتارا۔ اس وقت وہ خاصی چونچال دکھائی دے رہی تھی۔ بیالا کے ساتھ آنے والوں نے تیزی سے گاڑی کے دونوں بھینسے کھول دیے۔ وہ کاہلی سے چلتے ہوئے سڑک پار کرنے لگی، پھر وہ ندی میں اتر گئے۔ برجی سے اتر کر ساتھ آنے والے عورت، مردوں نے

میں آخر کار میر باز کو لے کر اپنے میزبانوں کی خوبصورت جھونپڑی میں آ بیٹھا۔

جھونپڑی پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی خوبصورت بچ پر میں نے لے جا کر اسے بٹھا دیا۔ میں نے محسوس کیا، وہ بچ تک رسائی سے نہیں پہنچا تھا۔ اس کی چال بدلی ہوئی تھی۔ میر باز لنگڑا رہا تھا۔

”یہ کیا ہوا؟ تو لنگڑا کیوں رہا ہے؟“ میں پریشان ہو گیا۔

”کچھ نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ بیٹھو تا شیر خان۔ یار، کھڑے کیوں ہو؟“

”تیری ٹانگ میں کیا ہوا؟ تو لنگڑا کیوں رہا ہے؟“

وہ ہنسا۔ ”میں لنگڑا نہیں رہا۔ تمہارے سامنے بھی دوڑتا ہوا آیا ہوں۔ بیٹھو بیٹھو

یار، وہم میں نہیں پڑو۔“

میں اس کی ہنسی کو اس کی حجت کرنے کو سمجھتا تھا۔ میر باز مجھے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا بری پتلون کے نیچے ایسا لگتا تھا جیسے اس کی بائیں ران پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ میں نے غور سے دیکھا، ران پر سے پتلون کا رنگ گلابی ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی پٹی خون سے رنگین ہوتی جا رہی تھی اور پتلون کو رنگتی جا رہی تھی۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تو زخمی ہے“ تیری ران پر کوئی زخم ہے۔ دیکھ، خون جھلک گیا ہے۔“

میر باز پھر ہنسا۔ ”شیر خان، دوستا، جھگڑا کیوں کرتے ہو؟ مہینوں پیچھے دیکھ رہا ہوں تم اور تم جھگڑا کرتے ہو۔ بیٹھو میرے بھائی بیٹھو، سناؤ کیسے ہو؟“

بیالا کا میاں جھونپڑی میں آ گیا۔ وہ ہماری باتیں سمجھ تو نہیں سکا تھا مگر میرے اشاروں سے جان گیا تھا کہ میں کس بات سے پریشان ہو رہا ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ ابھی مانکے کاٹے گئے ہیں۔ ران کا زخم اچھا ہو رہا ہے۔ اس کے بھاگنے دوڑنے سے زخم پھر کھل گیا ہو گا۔“

بیالا کے میاں نے بتایا کہ میرا سن کر یہ بے تاب ہو گیا تھا۔ رستے میں ٹرک خراب ہو گیا تو اسے سمجھایا بھی کہ رک جاؤ، تمہیں سواری پر لے جائیں گے مگر اس نے سنا ہی نہیں۔

اسے ڈانٹ پھینکا کرنا مجھے اچھا نہیں لگا مگر میر باز اپنی طرف سے جب بھی بے پروا ہوتا تھا، مجھ سے ڈانٹیں کھاتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ دانٹ نکالے ہنستا رہا

اسے مہمانوں کے آگے رکھ سکتے ہیں۔

میں بچوں کے ساتھ ان کی گنے کی فصل دیکھنے نکلا ہوا تھا اور وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ یہاں اس مسافر نے ٹھیک لی ہے، پڑاؤ نہیں کیا ہے۔

وہ لوگ مجھے اپنے پسندیدہ کھیت کے بہترین گنے کاٹ کاٹ کر دے رہے تھے۔ میں خود کو صوبہ سرحد کے یا سندھ اور پنجاب کے کسی کھیت میں اترا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ دو چار بار کی وہ یادیں جب میں چار سہ میں یا بچند اور سکھر ضلع کے فارموں میں اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ گنے کے کھیتوں میں اترا تھا۔ وہ یادیں جیسے پھر سے تازہ ہو رہی تھیں کہ اچانک کسی نے پشتو میں پکار کر کہا۔ ”شیر خان! میرا بھائی، میرا دوست..... یار اتم کدھر ہے۔ سامنے آ۔“

ایک بری کسان پشتو میں پکارتا ہوا دوڑا چلا آ رہا تھا۔

نہ نہ بری شرمی کوئی نہیں۔ یہ تو میر باز تھا، میرا دوست، میرا بھائی، میر باز خان۔

مہینوں کے پھڑے ہوئے اور شاید یقینی موت سے بچ کر آئے دونوں دوست دوڑ کر لپٹ گئے۔

میں نے تیزی سے اس کے بارے میں پوچھا کہ ”وہ کیسے زخمی ہوا تھا؟ اب تو ٹھیک ہے، زخم گہرے تو نہیں تھے۔ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اسے زخمی کیا۔ خدا بخش کہاں ہے؟ خدا بخش رائیں کا کچھ اتا پتا ہے؟“

وہ اپنی تیز رفتار پشتو میں یہی سب مجھ سے پوچھ رہا ہو گا کہ نہ اس کا ایک لفظ میں نے سننے سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی میر باز نے میری بات سن کے دی۔

اب تک بیالا اور اس کا میاں قریب آ چکے تھے۔

انہوں نے اتنی رفتار سے کسی کو بات کرتے، وہ بھی پشتو میں کاہے کو سنا ہو گا۔ دونوں میاں بیوی باری باری میری اور میر باز کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ ہمارے میزبانوں کے بچے ہمیں گھیرے کھڑے تھے اور حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔

آخر بیالا باپ نے بڑھ کر ہم دونوں کی پیٹھ تھپکی سے دونوں کو ایک دوسرے کی طرف دھکا دیتے ہوئے پھر ایک بار گلے لگا دیا۔ اس نے چیخ کر مجھ سے کہا تھا کہ شیر علی اندر چل کے بیٹھو، اپنے دوست کو بھی لے جاؤ اور دونوں آدمی کچھ دم بھی لو۔

میاں کا یا بدل کر ریچھ بن سکتے تھے۔

میر باز کو بڑے میاں کی موت کا بہت صدمہ ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ”یارا..... تیرا والد صد بنگلہ خان صاحب کے بعد اگر میں نے اپنے یہ شفقت کرتے باپ دادے کی طرح پیار کرتے کسی کو دیکھا ہے تو وہ یہی کو سومی کا دادا، مداری بابا تھا۔ باخدا۔ سچ کہتا ہوں۔ اس کی وفات کا سن کے شیر خان، یار ایسا لگتا ہے جیسے میر اپنا والد دوبارہ فوت ہو گیا ہے۔ اللہ رحم کرے۔“

میر باز کی اپنی روداد مختصر مگر بہت تکلیف دہ تھی۔

سلسل چودھری اور باز لر کے گروں نے اسے اور خدا بخش رائیں کو بہت مارا پیٹا تھا۔ ان سے میرے بارے میں اور ولد صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہی تھی۔ میر باز نے اور خدا بخش نے بس یہی کہا تھا کہ یہ دونوں باپ بیٹے صد خان صاحب اور شیر علی ہمارے بھائی بند ہیں۔ جس طرح ہم اپنے باپ، بھائیوں، بیٹوں، بھتیجوں کے بارے میں دشمنوں کو کچھ نہیں بتا سکتے، اسی طرح ان کے بارے میں تم حرام زادوں کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ چاہے ہمیں مار ڈالو۔

میر باز بتانے لگا کہ خدا بخش رائیں نے اپنی پنجابی ملی اردو میں انہیں شرم بھی دلائی تھی کہ ”اوئے کتے“ او شرم کرو، تم کہو بے اماندار بندے کے خلاف سازش پئے کر دے او۔ ارے ساوا بنگلہ صاحب ہوری جیسے پچاس بندے ہر محکمے میں ابھی موجود ہیں۔ جیسی پاکستان چل رہا ہے۔ نہیں تم دشمن بے دینوں نے تو اس جنت ور گے ملک نوں بچ کے ہی کھا جاتا تھا۔“

باز لر اور چودھری کے گروں نے بخش کے ساتھ اتنی زیادتیاں کیں اور ایسا تشدد کیا کہ اس کی دماغی حالت متاثر ہوئی اور پھر ان بد معاشوں نے مقامی پولیس کی مدد سے خدا بخش رائیں غریب کو وہیں کسی پاگل خانے میں داخل کرادیا۔

میر باز کو باگھیر بوڑی سے ہٹا کر چودھری نے کچھ دن اپنے گھر کے گیراج میں بند رکھا۔ پھر مختلف جگہ قید اور مارپیٹ کے بعد اسے برما کی بارڈر پولیس کے حوالے کر دیا۔ بارڈر پولیس والوں کو تو میں دیکھ چکا تھا کہ کتنے ظالم اور بد معاش ہیں۔ انہوں نے چودھری کے منصوبہ کے مطابق میر باز کو بارڈر پولیس مقابلے میں ہلاک کرنے کی پوری تیاری کر لی تھی مگر بات کھل گئی اور کسی عورت نے جو میر باز کے کہنے کے مطابق بد معاشی کے لیے لائی گئی تھی۔ (میں نے سوچا یہ یقیناً بولاری ہوگی۔) اتنا شور شرابا کیا کہ

اور ڈانٹیں سنتا رہا۔ آخر میں بولا۔ ”ابھی بس کرو خاناں۔ وعدہ کرتا ہوں بے پروائی نہیں کروں گا۔ تم سناؤ تمہارے ساتھ کیسی گزری؟“

میر بانوں نے تواضع جاری رکھی۔ بیالا اور اس کا میاں ہمیں لے جانے کے انتظامات کرتے رہے۔ ادھر میں نے میر باز کو بتایا کہ باز لر کے ہاتھوں ہم تینوں کے یعنی میر باز، خدا بخش اور میرے گرفتار ہونے اور باگھیر بوڑی کے کارخانوں میں رکھے جانے کے بعد کس طرح اس دلیر لڑکی روپائی سے ملاقات ہوئی اور اس نے قصاب برادری کے ایک نوجوان کو اپنا گرویدہ کر لینے کے بعد باگھیر بوڑی کا رخانے پر مویشیوں اور گوشت منڈی کے بیوپاریوں کا حملہ کر دیا اور کس طرح روپائی کے ساتھ مجھے بھی چھڑا لیا گیا۔ پھر کاکسیر بازار جانے کی تیاری میں کس طرح میں نے اپنے قصائی محسن کے دوستوں گھرائی دکاندار صدیق اور سلیم کے ہاں سے اپنے کاکسیر بازار کے گیسٹ ہاؤس فون کیا جس سے دشمنوں کو میرے فرار کا علاقہ معلوم ہو گیا اور انہوں نے مسلح نوجوانوں کی سیاسی تنظیم بنگلہ دوست کے رضا کاروں سے مدد لے کر میرا پیچھا کیا۔ میں بمشکل کاکسیر بازار پہنچ کر وکیل مزل صاحب کے نشی سے ملنے میں کامیاب ہوا اور پھر سلسل چودھری اور اس کے ذیل بھتیجے باز لر کے چنگل میں آگیا۔

اس کے بعد کا کچھ حال بڑے میاں نے میر باز کو بتا ہی دیا تھا کہ مجھے باگھیر بوڑی کا رخانے میں لڑکی روپائی کے قریب کوٹھری میں قید رکھ کر سلسل اور باز لر نے والد صاحب کو دکھانے کے لیے مجھ سے نشے کے اثر میں جعلی رسیدیں اور دوسری دستاویزات پر دستخط کرا لیے تھے تاکہ والد صاحب کو دھوکے سے مغربی پاکستان سے بلا کر وہ لوگ یہاں اپنے جاسوسی کے منصوبے کی تکمیل کر سکیں تو اسی پلان پر عمل کرتے ہوئے مجھے برما کی سرحد میں دھکیل دیا گیا۔

برما کو سومی اور بڑے میاں سے ملاقات اور ان کی مدد سے رنگون شہر تک پہنچنے کا احوال اور رنگون میں کوئی نیشنل ہوٹل میں ہم تینوں فراریوں کی کارگزاریاں سب میر باز کے علم میں تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ بڑے میاں نے کس طرح مجھے رنگون چل سے فرار کرایا ہے اور وہ قبیلے کے باغی جسکے کی غذا اگر دی سے بچتا بچتا مجھے یعنی شیر علی خان کو لے کر شاید یہاں مانگ یان آجائے گا یا خود میر باز کو مانگ یان سے کہیں بلوا بھیے گا، جہاں ہم دونوں دوست مہینوں بعد ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔

مگر میر باز کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کا یا بدل بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور یہ کہ بڑے

تھی۔ میرے ساتھ تو چودھری والوں نے اور بارڈر والوں نے اتنا زیادہ کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کو تو جیسے توڑ کے رکھ دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو سمجھو میرے والد کے ساتھ جنگلوں میں رہتے ہوئے اسے سختیاں جھیلنے کی عادت پڑ گئی تھی جو یہ سب جھیل گیا۔ پھر اسے جو محبت مجھ سے، میرے کہنے سے تھی، اس نے بھی میرا بازو کا تھوڑا رکھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پاس جا کر کسی بڑے بھائی کی طرح اس کا سر اپنے پہلو سے لگا کر تھپکا۔ اس کی تعریف کی کہ نام تو تیرا شیر نہیں ہے مگر یار تو واقعی شیر آدمی ہے۔

بیالا اور اس کا میاں اچانک بہت تیزی سے اور جوش میں بھرے ہوئے آئے۔ کہنے لگے کہ کان لُج ہاسٹل میں گھسنے کا یہی موقع ہے، چلو تم ٹرک میں بیٹھ جاؤ۔

باہر سبزیاں لے جانے والا ٹرک کھڑا تھا۔ میرا بازو انہوں نے میرے ساتھ نہیں بیٹھے دیا۔ ڈرائیور کے برابر بٹھایا۔ ٹرک پر گو بھی کے ٹوکرے لدے ہوئے تھے۔ بیالانے دو ٹوکروں کے بیچ کی جگہ میں دری بچھا کر مجھے لیٹ جانے کو کہا۔ وہ خود پچھلے حصے میں ٹرک کے ڈالے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کا میاں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

ہمارے میزبانوں نے ہمیں جھونپڑی سے نکل کر رخصت نہیں کیا۔ وہ اس بات سے اداس ہو گئے تھے کہ میں جا رہا ہوں۔ ان کے ساتھ اب اور نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے رخصت ہوتے ہوئے امید دلائی کہ میں پھر آؤں گا۔

تازہ گو بھی کی تیز مہک میں لپٹا اس ٹرک میں پڑا میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اور میرا بازو کو قید سے چھڑانے والے بڑے میاں تو نہیں رہے مگر ان کے مریدوں اور بچوں کا ایک گروہ خود کو خطرے میں ڈال کر ہمارے لیے وہی سب کر رہا ہے جو بڑے میاں نے کیا تھا۔

ایک غیر ملک میں ہمیں بے آسرا نہ رکھنے پر میں نے مالک کا شکریہ ادا کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر اس کریم کی عنایت نہ ہوتی تو اب تک ہم دونوں مٹی ہو چکے ہوتے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ ہم بڑی سڑک سے گزر رہے تھے۔ کوئی پندرہ منٹ بڑی سڑک پر چلنے کے بعد گاڑی ٹھہر گئی۔ بیالا کا میاں ہارن بجا کر کسی کو بلارہا تھا۔

بھاری بوٹوں کی آواز آئی، پھر کسی نے اکھڑپن سے بری زبان میں پوچھا، ”کیا بات ہے؟“

بیالا کا میاں بولا۔ ”گھٹ کھو لو، سبزی آئی ہے۔“

بارڈر پولیس والے اور بری فوجی گھبرا گئے۔

وہ تو اس عورت کو مارے ڈال رہے تھے مگر ماتحت پولیس والوں نے اپنے افسروں کو سمجھایا کہ اس پاس جنگل میں سرکاری لکڑی کٹ رہی ہے۔ عورت کے شور مچانے سے ٹھیکیدار اور مزدور ادھر متوجہ ہو رہے ہیں۔ اگر اسے مار دو گے تو بات اوپر تک جاسکتی ہے۔ مجبوراً افسروں نے اس عورت (بولاری) کو اور میرا بازو کو الگ الگ گاڑا چوکیوں پر منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ عورت کا تو پھر پتہ نہ چل سکا۔ میرا بازو کو دوسری چوکی پر منتقل کرنے کے بہانے سے بارڈر پولیس کے افسروں نے گولی مارنے کے لیے کسی ندی کا قریب ملے کیا تھا۔ انجانے میں انہوں نے میرا بازو پر دو فائر بھی کیے۔ ایک گولی ران میں لگی، دوسری شانے کو کھر جتی نکل گئی۔ وہ زخم اب مندمل ہو چکا ہے۔

میرا بازو کہنے لگا۔ ”شیر خان قدرت کو بچانا منظور تھا ورنہ وہ قاتل تو سمجھو میرے پر ایسے گولی چلا رہے تھے جیسے چھاؤنی میں فوجی لوگ چاند ماری کرتے ہیں۔ بس قدرت خداوندی سے بچ گیا یار۔ دو گولی کے بعد ان کے چار چھ فائر مس ہوئے۔ میں جھکڑی سنبھال کے بھاگتا تھا کہ جنگل میں سے ایک اونچا پورا ریچھ نکل کے آیا۔ اس ریچھ نے ان خدائی خوار پولیس والوں کی جیب کو الٹ دیا۔ زخمی بھی کیا حرام زاواں کو۔ میں ادھر سے جان بچا کے نکل گیا۔ ایسا ہی خون بہتے میں ندی پار کر کے چھپ گیا۔ بے ہوش ہو گیا۔ ابھی خبر نہیں، کدھر سے یہ کو سومی اور دادا داری آگیا۔ یہ لوگ نے مرہم پٹی کیا۔ میرے کو جنگل سے نکالا۔“

میں نے کہا۔ ”ریچھ بہت ہیں ادھر برما میں۔ چلو ایک بری ریچھ نے تمہاری جان بھی بچالی۔“

وہ بولا۔ ”بری شرمی نہیں یار۔ میرے کو تو وہی مداری کا ریچھ لگتا تھا۔ اونچا پورا، ایک دم کالا سیاہ۔“

میں نے پوچھا۔ ”تم پھر مانگ یاں کس طرح آئے؟“

کہنے لگا۔ ”یہ پتا نہیں کس طرح آیا۔ جنگل سے یہ لوگ نے نکال کے کسا ٹرک پر لا دیا، پھر میرے کو مداری، خانہ بدوش کے ڈیرے پر لے گئے۔ ادھر اس نمونے کی بھینسا گاڑی بہت تھی۔ تو چھ آٹھ روز میں بخار میں جتا گرتا پڑتا ان لوگوں کے قبیلے کے ساتھ ادھر پہنچ گیا۔ لڑکی کو سومی میرے بعد ادھر آئی۔“

میرا بازو کی داستان مختصر مگر مجھ سے کہیں زیادہ روٹنے کھڑے کر دینے والا

میں لپکتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے پنجے میں پنجا پھنسا لیا اور سرگوشی میں بولی۔ ”جیسے ہی یہ چلنا شروع کرے، ہم لوگ گلی چھوڑ کے کھلے میں نکلیں گے۔ کھلے میں رکنا نہیں ہے۔ دوسرا پہریدار برچی پر آجائے گا۔ وہ ہماری طرف منہ کر کے آئے گا۔ یہ سمجھ لو رکنا نہیں ہے اور خاموشی سے نکل جانا نہیں تو پکڑے جائیں گے۔“

سامنے برجیوں پر نکلے سائے نے حرکت کی۔

بیالا نے میرا پنجا اچھی طرح اپنی گرفت میں لیا اور گلی سے نکل کر کھلے قلعے میں دوڑ پڑی۔ میں دوڑتے ہوئے سامنے برجیوں کی طرف دیکھ جا رہا تھا۔ نیچے قدموں تلے گھاس تھی۔ ہم دونوں جس عمارت کی طرف دوڑے چلے جاتے تھے، میں نے دیکھا اس کا دالان ہماری طرف کھلتا تھا۔ دالان کے ایک سنگی ستون کے پیچھے سے دو چہرے، دو لڑکیاں۔ تشویش کے ساتھ ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ رہی تھیں۔ ایک نے ہاتھ بڑھا کر بے تابی کا اشارہ بھی کیا تھا۔ وہ چاہتی تھی ہم جلد از جلد دالان کی پناہ میں آجائیں۔

دالان چار پانچ قدم دور ہو گا کہ سامنے برجیوں پر کچھ آتا محسوس ہوا۔ میں نے تیز سرگوشی میں بیالا کو خبردار کیا۔ ”آ رہا ہے۔“ اور ہم نے آخری قدم لینے میں اپنی جان لڑادی۔ میں سامنے اب صرف دالان کی پناہ گاہ میں دیکھ رہا تھا۔ مگر ہمیں دیکھ لیا گیا تھا۔

برجیوں پر سے کسی نے لکارا اور ہماری طرف فائر کیا۔ فائر بظاہر ڈرانے کو کیا گیا تھا۔

”مارے گئے۔“ میں نے دل میں سوچا۔

ہم دالان میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس گارڈ نے ہمیں دالان میں داخل ہوتے تو دیکھا ہے۔ وہ لوگ اب ہمارے پیچھے آئیں گے۔

یہی بات۔ بالکل یہی بات ستون کے پیچھے چھپی ہوئی ان دو لڑکیوں نے سوچی ہوگی..... کہ وہ اب بیالا کے اور میرے پیچھے آئیں گے۔ اس لیے انہوں نے عجیب دلیری کا کام کیا۔

دونوں لڑکیاں ہنستی کھلکھلاتی ستون کے پیچھے سے نکلیں اور گھاس پر دوڑتی ہوئی کھلے میں گئیں۔ دور سے دیکھنے والے کو لگتا ہو گا کہ وہ اس وقت ایک دوسرے کو پکڑنے کا کھیل کر رہی ہیں۔

اکھڑ آدمی نے کہا۔ ”صبح سے یہی سب کر رہا ہے تم لوگ..... دودھ کیا ہے بڑی آئی ہے۔ ایک بار میں سب نہیں لا سکتے سارے؟“

”ابھی چاول کی بوریاں لاؤں گا۔“

اکھڑ آدمی بڑبڑایا۔ ”چاول کی بوریاں۔“

”ہاں..... پھر جلانے کی لکڑی آئیں گی۔“ بیالا کے میاں نے اسے چڑانے کو

لہک کر کہا تھا۔

اکھڑ آدمی نے جو دروازہ کھولنے کے لیے بھاری قدموں سے ادھر ادھر حرکت کر رہا تھا، گالی دی۔ بیالا کے میاں نے بھی جواب میں وہی گالی لوٹا دی۔ اکھڑ آدمی نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس نے سنا نہیں ہے۔ اس نے اور ہی سوال کیا۔ ”یہ پیچھے بڑک میں کون ہے رے اوسور؟“

میں نے سانس روک لی۔ کیا اس بے ہودہ آواز والے نے مجھے دیکھ لیا ہے؟

مگر وہ بیالا کا پوچھ رہا تھا۔ اس کے میاں نے جواب دیا۔ ”ماں ہے تیری۔“

”دھت تیری تو۔“ کہہ کر گیٹ کھولنے والے نے ٹرک کی باڈی پر لاٹھی ماری

یالات جمادی۔ بیالا کا میاں چڑانے کو ہنستا ہوا ہارن بجاتا ٹرک کو اندر لے آیا۔

اندر کوئی بہت نیچ دار رستہ تھا جس سے گزرتا ہوا ٹرک رک گیا۔ ٹرک کے

رکتے ہی لگا جیسے کچھ غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ بیالا بائے نے تیز سرگوشی میں کہا۔

”اٹھو..... شیر علی، پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ آواز نہیں کرنا۔“

میں نے گو بھی کے ٹوکروں سے اٹھ کر دیکھا۔ بیالا تیزی سے ٹرک کے ڈالے

پر چڑھی اور نیچے کود گئی۔

میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ کچھ دور چل کر پھر وہ جیسے زمین سے چپک گئی۔ میں

نے بھی یہی کیا۔

ادھر ادھر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ بیالا چل پڑی، میں بھی پیچھے چلا۔ وہ بھر تلی

عورت سرخ پتھر کی دیواروں کے درمیان سرخ پتھر جڑی گلی میں جھکی جھکی تیزی سے نکل

چلی جا رہی تھی۔ ہم نے بہت سے موڑ مڑے۔ میں نے گوشہ چشم سے دیکھا، دور جہاں

بلند دیوار پر برجیاں جیسی بنی تھیں، خاکی کپڑوں والا ایک شخص رانٹل کندھے پر رکھے

پہرہ دے رہا تھا۔ پہریدار کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔

بیالا برجیوں پر نکلے ہوئے اس سائے کو نکلے جا رہی تھی۔

”وہ جو ادھر آگیا ہے حرام کا..... جسکے۔“
”مگر جسکے کے آنے کا اور اس پہرے چوکی، چاند ماری کا آپس میں کیا تعلق

ہے؟“

بیالا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کسی شاگرد کی طرح مجھے سمجھانا شروع کیا۔ بولی۔ ”دیکھو لڑکوں کے کمروں کی طرف بڑا بھاری جنگل ہے۔ بڑے بڑے درخت ہیں۔ ایک دن سویرے سرکاری لوگ نے کالج پر چڑھا دیا کہ اتنے دن میں یہ جگہ ہالی کر دو، نہیں ہم طاقت سے خالی کرالیں گے اور باہر انہوں نے پہرہ بٹھا دیا۔ رات میں ی وقت جسکے اور اس کے بد معاش جنگل کی طرف سے درختوں پر چڑھ کے لڑکوں کے بے میں کود گئے۔ وہ لوگ خبر نہیں کہاں سے چوری کر کے، کچھ کر کے بندوق کار توں آئے تھے جو انہوں نے لڑکوں کے کمروں کے پاس چھپا دیئے۔ پھر باہر نکل کے انہوں نے جنگل کی طرف سے گولی چلائی۔ پہرے والے سرکاری لوگ ادھر آئے تو یہ درختوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ انہوں نے حرام کے جنوں نے گولی چلا کے دوسرے آدمی مار دیئے۔ رہاگ گئے۔ بس پھر کیا تھا، ایک گھنٹے کے اندر اندر کالج میں لڑکوں کے کمروں کی طرف ادھر لڑکیوں کے حصے پہ سب جگہ فوج نے گولی توپ چلاتے ہوئے گھیر اڈال دیا۔ لڑکوں کی آنکھ جسکے والوں کی گولی کی آواز سے کھل گئی تھی۔ وہ خود پریشان تھے۔ اب جو سرکاری لوگوں نے فائرنگ کر دی تو انہوں نے دہائی دی۔ ہاتھ اٹھا دیئے۔ لڑکوں کو تو سب کو گرفتار کر لیا اور لے گئے۔ تلاشی لی تو کمروں کے پاس سے بندوقیں نکالیں۔ انہوں نے فوراً قبضہ کر لیا۔ وہ تو لڑکیوں کے حصے کو بھی خالی کر رہے تھے، پھر خبر نہیں لیں ان لوگوں کو ادھر ہی رہنے دیا ہے۔“

”کوسوی کہاں ہے؟“

”ہم کوسوی کے پاس ہی چل رہے ہیں۔ وہ نیچے وہاں میں ہے۔“

وہاں دراصل بودھ عابدوں کی خانقاہ ہوتی ہے۔ یہاں قدیم عمارت میں انہوں نے یہ دھارت خانوں میں بنایا ہوگا۔

میں نے پوچھا۔ ”انہوں نے تمہارے میاں اور میر باز کو یہاں کیسے رہنے دیا؟“
بولی۔ ”قبضے کے وقت میرا آدمی ٹرک لے کر گیا ہوا تھا۔ میر باز کو اس نے بیسے ہی اپنا کلیز بنا کے رکھا ہوا ہے۔ جیسی سبزی، راشن لے کے یہ لوگ آئے تو ادھر سرکاری لوگوں کا قبضہ دیکھا۔ بڑی جھک جھک کے بعد ٹرک کی اور ان دونوں کی اچھی

پہریدار نے انہیں دیکھا، پھر اس نے لٹکار کو کچھ کہا اور ڈرانے کو پھر فار کیا۔
”اے..... اے..... اندھے۔“ لڑکیوں نے ہنسی روک کر غصے میں بڑبڑوں کی طرف ہاتھ ہلائے تھے۔ انہوں نے چیخ کر کہا۔ ”او اندھے۔ تیرے کو دکھتا نہیں ہے؟ ادھر کو فار کیوں کرتا ہے؟ کیا فالتو کار توں ہیں تیرے پاس۔ آں رے؟“
نرجیوں پر سے چیخ کر پہریدار نے کچھ کہا ہو گا جو ہمیں سنائی نہ دیا۔
لڑکیوں نے اسی طرح کھلے لان پر کھڑے کھڑے ان سے منہ ماری شروع کر دی تھی۔

”اے اے سالا! ادھر لان پر نہیں کھیلے گا تو کیا تیری کھوپڑی پر دوڑ لگائے گا؟ اندھے کا جنا نہیں تو۔ اپنی بندوق قابو میں رکھ۔ کیوں جائے اندر؟ ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ ہاں آآں۔“ اور چیخنے والی نے اپنی دوست سے کہا۔ ”آؤ جی۔“ وہ دونوں پھر لان پر ایک دوسرے کو پکڑنے کا کھیل کرنے لگیں۔

لڑکیوں نے ہمیں یقینی گرفتاری سے بچا لیا تھا۔

بیالا نے ہاتھ ہلا کر خاموش اشارے میں ان کا شکریہ ادا کیا اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے والان کی خاتمے پر نیچے اتری۔ سرخ پتھر کی فراخ میز ہیوں کی طرف ڈیٹ پڑی۔ نیچے ٹھنڈک تھی اور دھوپ کی چمک نہیں تھی۔ نیچے عافیت تھی۔
میں میز ہیوں پر ہی رک گیا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔
”رک کیوں گئے؟ آؤ“ بیالا نے میرا ہاتھ کھینچا۔
”بال بال بچے ہیں۔ دم لینے دو ذرا۔“

وہ بھی بہت بے حال ہو رہی تھی۔ کچھ دیر رک کر دم لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے رک کر پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟ اور یہ گولیاں کیوں چلا رہے ہیں؟“

کہنے لگی۔ ”میرے آدمی نے یا اس میر باز نے بتایا نہیں، یہاں کیا ہوا ہے؟“
میں نے نفی میں سر ہلایا تو بولی۔ ”وہ لوگ یہ سب بہت روز سے جھگڑ رہے ہیں۔ تم سے کہنا یاد نہیں رہا ہوگا۔ سرکار نے کالج اور ہاسٹل پر قبضہ کر لیا ہے۔“
”کیوں؟“

”بابا کے مرنے کا پتا چل گیا۔ بس آگئے، بولے خالی کرو۔“

”خالی کرو؟ پر اتنی توپ بندوق فوج فالٹالانے کی کیا ضرورت تھی؟“

ساتھ دو ہاتھ اوچی دیوار چل رہی ہے جس کے پار تازہ پانی کی ایک نہر بہتی ہے۔
میں نے پیلا سے ایک منٹ رکنے کو کہا اور سن پانی بہنے کی ہلکی آواز ہمارے بائیں
طرف سے آرہی تھی۔ بہت ہلکی روشنی میں دو ہاتھ کی وہ حفاظتی دیوار بھی دکھائی دے
رہی تھی۔

مجھے دور کہیں روشنی کا دھبہ ساد دکھائی دیا جس نے جلد ہی ایک مستطیل جالی کی
نکل اختیار کر لی۔ پتھر کی اس جالی کے پار سے لڑکیوں کے باتیں کرنے یا گنگنانے کی
آوازیں چلی آرہی تھیں۔ روشن دان سے آتی روشنی اور آوازوں نے مجھے عہد قدیم کے
امن اور سناٹے سے نکال کر آج اس لمحے کے ہیجان میں پہنچا دیا۔

’لمحہ لمحہ روشن ہوتی سیڑھیوں سے چڑھ کر ہم ایک بہت بڑے ہال میں پہنچے۔
ہال دن کی روشنی اور گنجارتی ہوئی نوجوان لڑکیوں کی آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے
دیکھا ہال میں کوئی آٹھ نو جگہ لڑکیوں کے دائرے بنے تھے۔ ان دائروں کے بیچ میں بھی
ایک لڑکی تھی، وہ کتاب اٹھائے پہلے کچھ پڑھتی تھی، پھر دائرے میں بیٹھی لڑکیاں ایک
آواز ہو کر اسے دہراتیں۔ مجھے تو یہ فزکس، کیمسٹری، بیالوجی کے فارمولے لگے جنہیں یہ
لڑکیاں رٹ رہی تھیں۔

میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ”یہ تو رٹا لگا رہی ہیں جیسے گاؤں، قصبوں کے ماسٹر
پہاڑے رنواتے ہیں۔ ویسے ہی۔“

قریب کے دائرے سے ایک لڑکی نے سر اٹھا کر دیکھا اور نرم لہجے میں مگر اونچی
آواز سے کہ جو گنجارتی ہوئی لڑکیوں کی تانوس موسیقی کی لہروں سے اوپر اٹھ کر مجھے
غوب صاف سنائی دی تھی۔ کہا۔ ”نہیں۔ رٹ نہیں رہیں، ہم سب اپنی یادداشت
نکھارے کی مشق کر رہے ہیں۔ دن بھر میں چوتھائی گھنٹا اس مشق کو دہرایا جاتا ہے شیر
خان۔“

شیر خان میں نے بات سن اور سمجھ لی تھی اور ٹھنک کر کھڑا ہو گیا تھا۔
یہ لڑکی مجھے کیسے پہچانتی ہے؟

لڑکیوں کا گنجارتا بند ہو گیا تھا۔ میرا نام لینے والی لڑکی دائرے سے اٹھی۔ پہلی
نظر میں وہ جانی پہچانی مگر نئی سی لگی۔ پھر وہ مسکرائی تو پوری سمجھ میں آگئی۔ وہ کوسوی
تھی۔

کوسوی، بڑے میاں کی پوتی۔ یہ وہی تھی مگر یہ وہ لڑکی ہی نہیں تھی جسے میں

تلاشی لے لے ان لوگوں کو اندر چھوڑا، پھر فونو پاس بنا دیئے۔ اب یہ لڑکیوں کے لیے
راشن سامان لے کے آتے ہیں۔ فوج والے تلاشی لے کے پھر اندر جانے دیتے ہیں۔
رات کو دونوں کو ادھر سے نکلنے نہیں دیتے۔“

میں نے پوچھا۔ ”تم اور مورنی اندر کیسے آگئیں؟“
بولی۔ ”مورنی کا تو پتا نہیں۔ وہ جنگل کی طرف منڈلاتی پھر رہی تھی۔ خبر نہیں
اتنے پہرے میں اندر کیسے پہنچ گئی۔ مجھے تو میرے آدمی نے پاس بنا کر اندر پہنچایا ہے۔“
مجھے حیرت تھی کہ جب تلاشی اور گمرانی ہو رہی ہے تو انہوں نے ٹرک میں
جھانک کر مجھے کیوں نہیں پکڑ لیا؟

میں نے پیلا سے یہ بات پوچھی تو اس نے بتایا۔ ”جہاں ہم دونوں ٹرک سے
کودے تھے اس جگہ ٹرک کو رکنا پڑتا ہے۔ روک کے وہ لوگ تلاشی لیتے ہیں، پھر آگے
جانے دیتے ہیں۔ ہم کود کے گلی گلی پچھوڑے نکل کے ادھر والان کی طرف آگئے تو جُ
گئے۔ ایک منٹ ٹرک میں اور بیٹھے رہتے تو بس آہی رہے تھے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اگر وہ پہلے سے ہوتے تو تم لوگ کیا کرتے؟“
کہنے لگی۔ ”مشکل تو ہوئی، پر کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا میرا آدمی۔ ٹانگ کر تا میر باز
سے، کوئی جھگڑے والی بات کر کے منٹ بھر کو انہیں اپنی طرف بلا لیتا۔ ہم نکل جاتے، یہی
طے ہوا تھا۔“

یہ بڑے عیار لوگ تھے جہاں ایسے مشکل حالات میں سرکار کا اور بری قبائلیوں
جاگیرداروں کا مقابلہ کر رہے تھے۔

دیر ہو چکی تھی۔ پیلا بابائے اور میں اب تازہ دم اور آگے جانے کو تیار تھے۔
یہ پرانی عمارت عبادت گزار بودھ بھکشوؤں کی پناہ گاہ تھی۔ عمارت میں
معدوں، خانقاہوں سے مخصوص ایک گھمبیر سناٹے کا راج تھا۔ ہم دونوں اب اس ٹھنڈے
نیم تاریک زینے سے اتر کر سرنگ جیسے کسی راستے پر چل پڑے۔ پیلا لانے رہنمائی کے
خیال سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ شاید اس کی آنکھیں اندھیرے دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔
وہ تو کتنی ہی بار اس راستے سے گزری ہوگی مگر میرے لیے اگلا قدم کسی نئی صورتحال میں
پڑتا معلوم ہوتا تھا۔

پیلا نے بتایا کہ ہم گھاس کے جس کھلے میدان سے دوڑتے ہوئے گزرے تھے
یہ راستہ اسی میدان کے نیچے بھول بھلیاں بناتا گزر رہا ہے۔ اس زیر زمین راستے کے ساتھ

کب تک کیسا، کیسی کرتے رہو گے؟“
 وہ دھیماسا قہقہہ مار کر ہنسی تھی مگر اسے قہقہہ نہیں کہا جاسکتا۔ قہقہے میں ایک طرح کی بے پروائی ہوتی ہے۔ کوسوی کی اس ہنسی میں ایک رکھ رکھاؤ تھا۔
 ہم تینوں اس ہال سے نکل آئے۔ ہال میں لڑکیوں نے پھر موسم بہار کے بھونزوں کی طرح گجراتا گنگنا شروع کر دیا تھا۔
 ہال سے نکلے تو ہم بودھ دھار کا ایک اور طبقہ اتر کر چھوٹے زیر زمین کمروں کی ایک منظم دنیا میں داخل ہو گئے۔ یہاں پتھر کا فرش تھا۔ پتھر کی دیواریں اور چھت بھی پتھر کی تھی۔

یہاں ایک چوڑی راہ داری کے دونوں طرف کمروں کی قطاریں تھیں۔ راہداری کے خاتمے پر ایک بلند دروازہ تھا جس کی چوکھٹ اور دروازے کے پلر بھی سرخ پتھر سے تراش کر بنائے گئے تھے۔ دروازے کے پتوں میں بڑی حکمت سے پتھر تراش کر نوادی کندا اور زنجیر لگادی گئی تھی۔

بیالا نے اشارہ کیا۔ ”یہ دھیان تپسیا کا کمرہ ہے۔“
 یعنی اس جگہ کبھی بودھ راہب ریاضت، مراقبہ کرتے ہوں گے۔
 دھیان تپسیا کے ہال کے قریب دو تین کمرے چھوڑ کر ایک عام سا کمرہ تھا جس کی طرف بیالا نے اشارہ کیا۔ ”یہ کوسوی کا کمرہ ہے یا شاید اس کے برابر والا۔“
 کوسوی بولی۔ ”برابر والا نہیں، میرا کمرہ یہی ہے۔“
 وہ دونوں مجھے ساتھ لیے پتھر کے دروازے کی چوکھٹ والے ہال کے سامنے اکھڑی ہوئیں۔

کوسوی کہنے لگی۔ ”لڑکوں کے رہنے والے کمروں پہ سرکاری آدمیوں کا قبضہ ہے اس لیے تمہیں یہاں دھار ہی میں چھپنا پڑے گا۔“
 ”یہاں؟ کہاں؟“ میں لڑکیوں کے ہاسٹل میں قیام کرنے کے خیال ہی سے الجھ ہاتھا۔

بیالا بولی۔ ”یہاں تپسیا والے کمرے ہیں۔“ وہ پتھر کے دروازے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ کوسوی نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ جیسے بلب اشارے سے کھلتا چلا گیا۔ کئی ٹن وزنی پتھر کے اس پٹ کو اتنے مکمل توازن سے نکال دیا تھا کہ یہ پٹ ایک بچہ بھی کھل سکتا تھا۔

نے پہلی بار مشرقی پاکستان میں اپنے گیسٹ ہاؤس کے پچھواڑے دیکھا تھا۔
 وہ ایک باوقار خاتون کی طرح اٹھی تھی اور وہ بہت خوبصورت تھی مگر خوبصورت یا بہت خوبصورت کہنا کافی ہوگا۔

کوئی نینٹل ہوٹل میں قیام کے دوران کوسوی میں ایک تبدیلی آئی تھی۔ اس وقت مجھے وہ ذرا بڑی سی اور صحت مند سی لڑکی لگی تھی۔ یہاں بودھ عابدوں سے منسوب اب خانقاہ میں وہ کچھ اور ہی بن گئی تھی۔ شاید زیادہ وقت اس نے اس زیر زمین دنیا میں گزارا ہوگا تو اس کی رنگت میں نکھار آگیا تھا مگر اس کے چہرے کی جلد میں دھوپ سے محروم رہنے والوں کی پیلاہٹ نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر صحت مند سرخی تھی۔ مناسب غذا اور ورزش اور آرام اور کھلی ہوا میں وقت گزارنے والوں کی طرح اس کے پاس دھوپ کی اور نئے اگتے ہوئے پودوں کی مہک اٹھ رہی تھی اور اس لڑکی کوسوی سے جیسے نسائی حسن کی روشنی پھوٹی تھی۔

میں سمجھنا چاہتا تھا، پر سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ اتنا حسن میرے تجربے میں نہیں تھا، میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ”ابا! کوسوی! کوسوی کیا کر رہی ہو یہاں؟ کیسی ہو تم کوسوی؟“

وہ مسکرائی۔ کاسکیز بازار گیسٹ ہاؤس کے پچھواڑے بنی جھوپڑی سے نکل کر آنے والی لڑکی شاید اس طرح پہلے کبھی نہیں مسکرائی تھی مگر نہیں ایک دو بار رنگوں کوئی نینٹل میں وہ کسی بات پر مسکرائی تھی تو مجھ پر منکشف ہوا تھا کہ اس کی پوری شخصیت ایک دھیمی مسکراہٹ سے ترتیب پائی ہے۔

اسی مسکراہٹ کی وجہ سے کوسوی کو ایک بار دیکھنے والا دوبارہ اپنی یادداشت میں بہت آسانی سے لا سکتا تھا۔ بس اسے مسکراتا یاد کرنا ہوتا اور وہ خیال کی آنکھ سے نظر آجاتی۔

میں نے ایک بار اور اس کی طرف گھبرا کر دیکھا اور کہا۔ ”ہاں کوسوی..... کیسی ہو؟ زمانے کے بعد دیکھا ہے تمہیں تو۔“

وہ بولی۔ ”زمانہ نہیں..... چند مہینے اور تم..... شیر خان، تم کیسے ہو؟“
 وہ بے تکلف دوستوں کی طرح مجھے تم کہہ کر بلارہی تھی۔
 بیالا نے جو کبھی میرا، کبھی کوسوی کا چہرہ نکلتی تھی، مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا اور ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ اس نے کوسوی سے کہا تھا۔ ”کوسوی آؤ، یہاں کھڑے

تمہیں اس موقع پر ہونا چاہیے تھا مگر.....
 وہ جلدی سے بولی۔ ”مگر تم وہاں تھے یہ اچھا ہوا تم تھے۔“
 میں نے آہستہ سے ہوں کہا۔
 ”تمہیں انوکھا لگ رہا ہو گا؟“
 ”کیا؟“ میں نے پوچھا۔

کہنے لگی۔ ”دوسری لڑکیوں کے ہوتے میں ہنستی اور بات کرتی تھیں۔ اس وقت کوئی نہیں ہے تو تمہارے سامنے روتی ہوں۔“
 میں نے تسلی دی۔ ”اس میں کوئی انوکھی بات ہے؟“
 وہ کچھ دیر سر جھکائے رہی، پھر بولی۔ ”میں ان لڑکیوں کی اگوا ہوں۔ سمجھو ایک طرح کی رستہ دکھانے والی شاگرد۔ پڑھاتی نہیں ہوں مگر میں جس جس طرح خود پڑھتی ہوں دوسری لڑکیوں کو اسی طرح پڑھنا ہوتا ہے۔ دوسری باتیں یہ مجھ سے سیکھتی ہیں۔ مجھے خود پر قابو رکھنا ہوتا ہے۔“

وہ غم کی باتوں سے ہٹ کر کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اس کا دھیان بٹائے رکھنے کو میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اگوا لڑکی سے دوسری سب لڑکیاں سیکھتی ہیں۔ یہ تو بہت اچھا انتظام ہے۔“
 وہ بولی۔ ”مجھے اگوا اس لیے نہیں بنایا کہ میں بابا کی بیٹی ہوں۔“ اس نے پوتی نہیں بہت پیار سے بیٹی کہا تھا۔

میں نے سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔
 ”میں اگوا اس لیے بنی تھی کہ پڑھائی میں سب سے آگے رہتی آئی ہوں۔ بس ایک برس کوئی اور لڑکی اگوا بنی تھی۔ مجھ سے ایک سیڑھی اوپر آگئی تھی وہ۔“
 میں نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں یہ بڑا منصفانہ طریقہ ہے۔“
 وہ پھر گم صم ہو گئی۔ اس نے اداسی سے سر جھکا لیا۔
 پھر ایک دم سر اٹھا کر بولی۔ ”جانے سے پہلے بابا نے تمہیں کایا بدلنے پر راضی کر لیا تھا۔ یہ بہت اچھا ہوا۔“

”کیا اچھا ہوا؟“ میں جاننا چاہتا تھا۔
 ”یہ چار شتا بدی (صدی) کا تحفہ تھا۔ کسی نے پرکھوں میں سے کسی نے بڑی جو کہ بڑے تپ سے حاصل کیا تھا۔ بابا آگے نہ بڑھاتا اس تحفے اس علم کو تو یہ زنجیر کٹ

کوسومی نے دہلیز پار کی اور دھیان تپیا کے اس ہال میں داخل ہو گئی۔ اس کا قدم پڑنے سے ہلکی چاپ پیدا ہوئی جس کی گونج میں نے سنی۔ مجھے یہ کسی اور زمانے کی آہٹ لگی۔

ہال بہت وسیع اور عریض تھا اور بالکل خالی تھا۔ کہیں کوئی بت، مورتی، پتھر میں تراش کر بنائی ابھاری ہوئی کوئی تصویر، کہیں کچھ نہیں تھا۔

مراتبے کے اس لمبے چوڑے ہال میں اس ایک دروازے کے سوا کوئی دوسرا دروازہ، کھڑکی، روشندان، روزن کچھ نہیں تھا۔ چاروں طرف اور اوپر نیچے ٹھوس سرخ پتھر تھا مگر ہال میں باسی بند ہوا یا ٹھنکن نہیں تھی۔ ایک ٹانائوس سی تروتازگی اور سناٹا تھا۔ سکون بھرا سناٹا جو غور و فکر اور ریاضت کے لیے سازگار ہو سکتا تھا۔

فرش سے اٹھتی سفید روشنی سے ہال روشن تھا۔ پورے ہال میں دیواروں کی جڑ میں دو دھیا پتھروں سے دو فٹ چوڑی ایک اوٹ بنادی گئی تھی جس کے پیچھے روشنی کا ماخذ تھا۔ بجلی کے تاریاٹیوب کچھ نظر نہیں آتے تھے۔

میں نے کہا۔ ”بہت اچھی جگہ ہے۔“
 ”ٹھیک ہے تو میں چلتی ہوں۔“ بیالانے کہا اور وہ مجھے اور کوسومی کو ہال کے وسط میں کھڑا چھوڑ کر چلی گئی۔

بیالا کے جاتے ہی کوسومی میں ایک نمایاں تبدیلی آگئی۔ وہ جو کسی اچھی انفر رابطہ کی طرح میری طرف متوجہ تھی اور مسکرائے جا رہی تھی۔ اچانک بجھ گئی۔ مسکراتے چہرے پر اب ایک اداسی کھنڈ گئی تھی۔ کوسومی میری طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی تھی اور فرش کو ننگے جا رہی تھی۔

میں اس بدلتی کیفیت کو فوری طور پر سمجھ نہ پایا۔ گھوم کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے تھے۔ اس نے آستین سے آنکھیں پونچھ لیں، بہت دھیمی آواز میں بولی۔ ”میں اس وقت وہاں کیوں نہ ہوئی۔“
 کوسومی اپنے دادا کو یاد کر رہی تھی۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”ہاں، یہ خلش تو رہے گی کہ آخر وقت تم ان کے پاس نہیں تھیں۔“

”میں تو آخری رسم بھی ادا نہ کر سکی۔“ وہ اب دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔
 ”ہاں کوسومی۔ اس موقع پر نہیں تمہیں، تم ان کی آخری رشتے دار تھیں۔“

وہ مڑی اور دروازے کے پٹ کو اشارے سے کھولتی باہر چلی۔
میں نے ندامت اور نرمی سے اسے پکارا۔ ”کوسوی۔“

وہ نہ رکی نہ ٹھہری۔ دروازہ اس کے اشارے سے بند ہو گیا تھا۔
مجھے یہ سب بحث نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں آئندہ شیر بنانا نہ بننا کسی کو یہ
..... علم آگے بٹھانا نہیں چاہتا۔ یہ میرے اپنے سوچنے فیصلہ کرنے کی بات تھی۔ مجھے چپ
رہنا تھا، میں نے بے وجہ اسے خفا کر دیا۔

کتنی خوبصورت تھی۔ خوبصورت ہے وہ۔ میں نے نرمی اور مروت سے سوچا۔
وہ اتنی خوبصورت ہے کہ اس ہال کی پوری فضا اس کے چلے جانے سے بچھ گئی ہے۔
پتھر کا ایک پٹ آہستہ سے کھلا۔ کوئی آ رہا ہے، وہ آ رہی ہے مگر آنے والی مورنی
تھی۔ وہ خوب کھل کر مسکراتی ہوئی آئی تھی۔

وہار میں آکر اس نے دوسری سب لڑکیوں جیسے کپڑے پہن لیے تھے۔ وہ بے
تکلف دوستوں کی طرح آئی اور میرے بالکل سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں، چہرہ
پورا بدن مسکرا رہا تھا۔

بولی۔ ”کیسی لگ رہی ہوں میں؟ وہار کے ان کپڑوں میں؟ بتاؤ شیر۔ کیسی لگ
رہی ہوں؟“

”بہت اچھی۔“

”تم نے شیر، یہ بات میرا دل رکھنے کو کہی ہے۔ تم ادا اس ہو۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں تو۔“

مورنی بولی۔ ”ادا اس ہو اور مجھے خبر لگ گئی ہے، کس لیے ہو۔ کوسوی نے تم
سے جھگڑا کیا ہے۔“

”نہیں۔ وہ نہیں جھگڑی۔ جھگڑا میں نے کیا تھا۔“

مورنی بولی۔ ”منالینا۔ اب جو وہ سامنے آئے تو منالینا۔ وہ بہت دکھی ہے۔ اپنے
آپ میں نہیں۔ اس پر سختی سے فیصلہ نہ کرو۔“

میں نے کہا۔ ”فیصلہ میں کیا کروں گا۔ بس بے کار بحث میں الجھ گیا۔ تمہارا اس
کا سامنا ہو تو کہہ دینا شیر علی نے خفا کر دیا تھا۔ اب وہ خود اس بات سے دکھی ہے۔“

مورنی نے ہاں میں سر ہلایا، پھر بولی۔ ”دکھی مت ہو، یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں
تپسیا کے کمرے میں ٹھہرانے کا کوئی سادھن (تدبیر) کرتی ہوں۔ پھر تمہارے پاس آ کے

جاتی۔ اب تم آگے چلاتے رہو گے۔ چار شتابدی کا علم اگلے حق داروں کو اپن کرو گے۔
بڑھا دو گے آگے والوں کو۔“

”بالکل نہیں۔“ میں یہ بات نرمی سے کہنا چاہتا تھا مگر اپنی رو میں ذرا روکھے پن
سے کہہ گیا۔

وہ حیران ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی۔ ”کیوں؟“

میں نے سمجھاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ”دیکھو کوسوی! میں بالکل ہی دوسری
دنیا کا آدمی ہوں۔ میری پرورش، میرا دین، دھرم اور میرا مزاج۔ ایسے کسی جادو جنتر کسی
علم کو جو میری وچار دھارا (فکر کے بہاؤ) سے پورے زندگی کے نظام سے ٹکرا رہا
ہے، ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ میں نے مجبوری میں اور تمہارے دادا کے ایک طرح سے
دباؤ میں آکر اسے قبول کیا تھا، نہ میں اس..... سختی سے اب کبھی فائدہ اٹھاؤں گا، نہ آگے
کسی کو بخشوں گا۔ یہ بات شاید تمہیں اچھی نہ لگے مگر اسی طرح ہے۔ سمجھیں کوسوی۔“
وہ خاموش کھڑی ہو گئی، بالکل بے اختیار مجھے دیکھنے جا رہی تھی۔

میں نے دھیرے سے کہا۔ ”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“

وہ افسوس میں سر ہلانے لگی۔ پھر بہت مشکل سے بولی۔ ”بابا کا وقت نہیں ملا،
نہیں تو وہ تمہیں اچھی طرح سمجھا کے جاتے۔ وقت مل جاتا تمہیں سمجھنے کا پھر یہ بات اس
طرح نہ سوچتے، یوں نہ کہتے تم۔“
”وہ سال بھر تک بھی سمجھاتے رہتے تو میری سمجھ میں اس طرح نہ آتا جس
طرح تم نے کہا ہے۔“

اس نے غصے سے سر جھٹکا۔ ”وہ ایک پستہ (ہفتہ) اس وہار میں سامنے بٹھا کر
تعلیم کرتے تو تم ان کے سچے دشمن بن کر اٹھتے۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں گرمی آگئی تھی۔ ”میں ان کا سچا مرید کبھی
نہیں بن سکوں گا۔ وہ ایک اچھے آدمی تھے اور اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ ان
کی بڑائی اچھائی یہی تھی کہ انسانوں سے اور علم سے پیار کرتے تھے۔ ریچھ بننا، شیر بنانا، یہ
سب.....“

اس نے پتھر کے فرش پر پیر پٹکا۔ ”بس شیر علی، میں جا رہی ہوں۔ تمہارے
آرام کے لیے وہ لڑکی مورنی، کچھ لادے گی یہاں سے آنے جانے کا سب سمجھا بھی دے
گی۔“

بیٹھوں گی۔ باتیں کروں گی۔“

میں خاموش بیٹھنا چاہتا تھا۔ مورنی سے کسی سے بھی باتیں کرنے، کسی کی باتیں سنتے رہنے تک کی ہمت نہیں تھی مجھ میں مگر یہ بات میں مورنی سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک اور دوست کو کیسے ناراض کر دیتا؟

وہ تیزی سے گئی اور کہیں سے ایک گدا کھینچ لائی۔ پیال بھرے اس گدے پر مورنی نے ایک چادر لا ڈالی۔ سیل کی روٹی کا نرم تکیہ لا کے رکھا اور گدے کے پائنتی خود آڑی ترچھی دراز ہو گئی۔

بولی۔ ”تم تھکے ہوئے بھی ہو شیر علی۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں..... بہت تھکا ہوا ہوں۔“ میں نے سوچا شاید اس طرح کہنے سے وہ چلی جائے گی۔

کہنے لگی۔ ”میں تمہارا سر، تمہارے ہاتھ پاؤں دبا دیتی ہوں۔“

”یہ۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ کام دوستوں کا نہیں ہوتا۔“

”تو پھر کس کا ہوتا ہے؟“

میں اس سوال سے گڑبڑا گیا۔ ”دیکھو..... تم میری دوست ہو۔ ہوتا؟“

اس نے ہاں میں سر ہلایا۔

”تو دوست اپنے دوستوں کے ہاتھ پاؤں نہیں دباتے۔“

”کیوں؟ اور کیا وہ سر دبا سکتے ہیں؟“

”ہاں“ اگر سر درد کرتا ہو مگر میرا سر درد نہیں کر رہا، اس لیے تم بس باتیں کرو

مجھ سے۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا بھی ہے۔“

”پوچھو، کیا پوچھنا ہے؟“ اس وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس ضدی

لڑکی کو آخر کس طرح ٹالوں۔

وہ سننے کے لیے مستعد ہو بیٹھی تھی۔

ذہن میں ایک روشنی سی لٹک گئی۔ میں نے پوچھا۔ ”مورنی تمہیں جو کایا بدل

کر مورنی بننے کی طاقت ملی ہے۔ یہ تم دوسرے کو۔ مطلب اگر کسی دوسرے میں کچھ بننے

کا حوصلہ اور..... اور گنجائش ہے یا لیاقت ہے تو کیا تم اسے کایا بدل لینے کا علم بخش سکتی ہو؟

ہاں؟ بتاؤ۔ بخش سکتی ہو؟“

”نہیں۔“

”کیوں نہیں؟“

”بخشتا صرف جگہ گرو ہے۔“

”جگہ گرو۔ یہ کون ہوتا ہے؟“

”سب جگت کا گرو۔ سب عالم کا، اس دنیا کا استاد جو بابا تھے، جواب تم ہو گئے

ہو۔“

میری چیخ نکل گئی۔ ”میں؟ جگہ گرو؟“ میں نے کچھ کہا نہیں تھا بلکہ میں چیخا تھا۔

”میں جگہ گرو ہو گیا؟ کب سے؟“

”جب سے بابا کا ارپن کیا گیا ورن (درجہ) تم نے قبول کیا ہے۔“

میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ ”میں نے کوئی درجہ ورن شرن قبول نہیں کیا

ہے۔ وہ دم توڑ رہے تھے اور مجھے کچھ دینا چاہتے تھے۔ آخری وقت میں انہیں مطمئن

لرنے کو میں نے ہاں کہہ دی اور بس۔“

کہنے لگی۔ ”بس یہی موقع، یہی اوسر تھا جب تم نے جگہ گرو بننا منظور کیا۔ اب

پریشان کیوں ہوتے ہو؟ ایسا کوئی بھیاک معاملہ تو نہیں ہو گیا۔ خوش رہو، مگن رہو، کوئی

کچھ نہیں مانگے گا تم سے۔“

”واہ یہ خوب کہی۔ مانگے گا کیسے نہیں۔ کو سومی ابھی اسی بات پر خفا ہو کے گئی

ہے۔ کہتی تھی، تمہیں آگے کچھ کرنا ہو گا۔ یہ چار صدی کا علم کسی کو دے کر جانا ہو گا۔“

”دینے کو اور شیر علی جانے کو ابھی پورا ایک جنم بڑا ہے۔“

میں کڑوے پن سے بولا۔ ”ہاں جی۔ پوری ایک زندگی پڑی ہے۔ کسی کو چیتا“

کی کواڑ دھا، بھیڑیا بننے کا علم بخشتا رہوں، بیٹھا رہوں جگہ گرو بنا۔ اپنے لیے آگ کا گھڑا

تیار کرتا رہوں۔“

’آگ؟‘ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ ”کچھ نہیں تم نہیں سمجھو گی۔“

بولی۔ ”سمجھاؤ نا۔“

میں نے کہا۔ ”چھوڑو۔ یہ بتاؤ تمہیں مورنی کی کایا میں جانے اور واپس آنے کی

لاقت کس سے ملی؟“

کہنے لگی۔ ”کو سومی سے۔“

”ایں۔“ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہ گیا، پھر پوچھا۔ ”اور کو سومی خود کیا

کہہ دیتی کہ ہاں ایک اور ہے یا دو اور ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”ظاہر ہے۔“ اچانک ایک خیال ذہن میں آیا۔ میں نے پوچھا۔
”کوسوی کے باپ نے بھی کیا یہ علم پھیلایا۔ آگے عطا کیا کسی کو؟“
مورنی کچھ سوچ کر بولی۔ ”کوسوی کا باپ داروپنے کا اور عورت رکھنے کا بڑا رسیا
تھا۔ بڑا تیکھا جوان تھا اپنے وقت میں۔ بیوی کے علاوہ بھی عورتوں پہ اپنی چادر ڈالتا پھرتا
تھا۔“ وہ پھیکے پن سے ہنسی۔ ”خود میری ماں تین بار اس کی گاڑی میں بیٹھی۔ میں اور بھائی
میرا دونوں تو اپنے باپ ہی سے پیدا ہیں۔ ایک بھائی ہمارا تھا، مر گیا وہ کوسوی کے باپ
سے تھا۔“

میں اس معلومات پر سر ہلا کر ہاں ہی کہہ سکتا تھا۔
مورنی اب کے ذرا اعتماد سے ہنسی۔ ”اب تو دونوں ہی مر گئے۔ میری ماں بھی
چلی گئی اور کوسوی کا باپ بھی چلا گیا۔ اس لیے بتا رہی ہوں۔ کوسوی کے باپ نے میری
ماں کو کایا بدلنا ارپن کیا تھا۔“
مجھے تجسس ہوا۔ ”وہ کیا بن سکتی تھی؟“
”آدمی۔“

”آدمی؟ کیا مطلب۔“

”مرد، پہلوان، خوب نگوار۔“

”اوہ۔“ یہ عجیب بات تھی۔ میں نے کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی۔ انسان تو وہ تھی
ہی، تمہاری ماں نے کسی جانور کا روپ کیوں نہیں لیا؟“
مورنی بولی۔ ”کیون نہیں لیا، کا جواب کیا دے سکتی ہوں۔ یہ تو تمہیں پتا ہے کہ
آدمی کے گھٹ میں جو جاندار اترا ہوا ہوتا ہے، وہ وہی بن سکتا ہے۔ میری ماں کی کایا میں
عورت نہ تھی نہ کوئی جانور تھا۔ ایک مرد پہلوان چمپا تھا۔ کایا بدلتے وقت وہ پہلوان باہر
آتا اور کسی جانور کی طرح اپنے تماشے دکھاتا تھا۔“
”تماشے؟“

کہنے لگی۔ ”ہاں، میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔ سنا ہے گھٹنے گھٹنے دو
گھٹنے میری ماں اور کوسوی کا باپ کشتی لڑتے رہتے تھے۔ وہ پہلوان میری ماں کو خوب اٹھا
اٹھا کے پھینکتا پھینکتی تھی اسے۔ کبھی تو دو دو دن ہلدی چونا تھو پے پڑا رہتا تھا کوسوی کا
باپ.....“ وہ ہنسی۔ ”جاننے والے دو تین اور تھے“ اسے دیکھ دیکھ کر تھو تھو کرتے تھے۔

بن سکتی ہے؟“

”کچھ نہیں۔ اسے کچھ نہیں بننا ہوتا۔ وہ ایسے ہی پر م اگوا ہے۔“

یہ پر م اگوا اور بلند رتبہ ہوگا۔ بہر حال میں نے کہا۔ ”چلو پر م اگوا ہے۔ وہ پردہ
تمہیں کوئی طاقت کیسے دے پائی۔ کیا وہ جگ ماتا ہے یا ایسی ہی کچھ۔ وہ چھوٹی سی لڑکی؟“
مورنی نے بے چینی سے مجھے دیکھا۔ ”تم اس کے لیے یہ سب کیوں کہہ رہے
ہو شیر علی، اتنے کڑوے پن سے اس کی بات مت کرو۔ وہ ہم سب سے پیار کرتی ہے۔ ہم
سب اس سے پیار کرتے ہیں۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر چھو لیا۔ میں جانتا تھا کہ اس طرح وہ ایک
دوسرے کو منالیتے ہیں۔ مورنی کا رخ دور ہو گیا تھا۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔
کہنے لگی۔ ”بابا کے کٹم کٹے میں پیدا ہو کے اس میں آپ یہ تیج آگیا کہ وہ
کسی کو کایا بدلنے کی دیا (علم) دے سکتی ہے۔ میں ایک کو اور جانتی ہوں جسے کوسوی نے یہ
ودیا ارپن کی ہے۔ یہ مت پوچھنا، وہ دوسرا کون ہے۔ یہ بات جان کر اپنی اور اس کی جان کو
تم کیوں چھ سات کی گنتی کے جو کہ میں ڈالو۔ ٹھیک ہے نا؟“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے مگر تم نے ابھی کہا ”دوسرا“ کون ہے تو ایک بات میں
سمجھ گیا کہ وہ دوسرا کوئی مرد ہے۔ عورت نہیں ہو سکتی ورنہ تم دوسری کا لفظ کہتیں۔“
وہ ہنس پڑی۔ ”اس بھروسے مت رہنا سردار۔ میری بات اس طرح بھی ہوتی
ہے اور اس طرح بھی۔“

مورنی نے بہت کام کی باتیں بتائی تھیں۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ سردار قبیلہ کے
خاندان میں پیدا ہونے والا یہ صلاحیت اور اختیار لے کر پیدا ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی
مناسب اور رضامند شخص کو کایا بدلنے کی طاقت بخش دے۔ کوسوی نے اس لڑکی مورنی کو
اور ایک کسی اور کو یہ شکتی ارپن کی ہے یا اپنے لفظوں میں یہ طاقت دی ہے کہ وہ انسان
سے جانور اور جانور سے انسان بن سکتا ہے۔ لڑکی مورنی کو قطعی طور پر یہ نہیں معلوم تھا
کہ کوسوی نے ان دو آدمیوں کے علاوہ بھی کسی اور کو کایا بدلنے کی شکتی ارپن کی ہے یا
نہیں۔ اس لڑکی کو شاید یہ بھی علم نہ ہو گا کہ بڑے میاں نے کس کس کو یہ تحفہ دیا۔
مطلب میرے علاوہ اور کس کس کو دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”بابا نے اور کسے یہ علم دیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”کسی اور کا نہیں معلوم۔ اگر معلوم ہوتا تو نام نہ بتاتی تمہیں۔ بس یہ

خبر نہیں کیوں۔“

”عورت سے مار کھاتا تھا شاید اس لیے۔“

مورنی ہنس پڑی۔ ”اگر اسے پہلوان بننا نہیں ملتا، وہ گھوڑی، ہتھنی یا ساٹنی بنتی تو بھی کوسومی کے باپ سے گھڑی ہی پڑتی۔ وہ تھی ہی ایسی بھاری بھر کم مزاج کی۔“

”کیسے بھاری بھر کم مزاج کی؟“

مورنی نے شرمائے بلکہ شرمندہ ہو کے بتایا کہ اس کی ماں دھان پان کی عورت تھی مگر دارو بہت پیٹی تھی۔ نشے میں ہو جاتی تو بک بک کرتی تھی اور مورنی کے باپ کو گاڑی سے دھکے دے کے نکال دیتی تھی۔ کئی بار اٹھا کے بھی پھینکا تھا اسے۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا ہو گیا تھا اسے؟ بیمار ہو گیا تھا کیا؟“

اس نے اداسی سے سر جھکا لیا۔ میں نے ناحق اس سے یہ سوال کیا تھا۔

مگر اگلے ہی لمحے وہ سر اٹھا کر مسکراتے لگی۔ بولی ”ماں نے ایک روز الاؤ کے آس پاس جب پورا قبیلہ اکٹھا تھا نشے میں آ کے اپنی جون بدلی اور پہلوان بن گئی۔ کوئی جشن رت جگا تھا۔ سو دو سو آدمی الاؤ پہ گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سب نے ماں کو عورت سے کڑیل جوان پہلوان بننے دیکھا۔ ڈر گئے۔ بہت سے اپنی گاڑیوں، چھو لدریوں میں چلے گئے۔ میرا باپ سمجھو، صدے سے مرتے مرتے بچا۔ کوسومی کے باپ نے ماں کو میری سنبھالا۔ اسے اپنی گاڑی میں لے جا کے بند کر دیا۔ رات بھر قبیلے میں جگا رہی۔ جنہیں کیا بدل کی خبر نہیں تھی، وہ پریشان تھے۔ جنہیں خبر تھی، وہ بابا کو ڈھونڈنے نکل گئے کہ شاید بابا کوئی اتار، کوئی علاج کر سکے۔ دو چار دشمن تھے ہمارے، وہ بک بک کرنے لگے کہ ماں جادو گرئی ہے، اسے الاؤ میں زندہ ڈال دو۔ کوسومی کا باپ میری ماں کو اپنی گاڑی میں ادھر سے نکال لے گیا۔“

مورنی خاموش ہو گئی۔ سر جھکائے بیٹھی رہی، اس کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔

آخر خود ہی بولی۔ ”دوسرے دن جیسے جیسے سورج ڈوبتا گیا، ماں پہلی پڑتی گئی۔“

ادھر تم لوگ کی مغرب کی بانگ ہوئی۔ ادھر بتاتے ہیں ماں ختم ہو گئی۔ شراب نے مار دیا۔ اسے۔ نہ اتنی پیٹی، نہ بے قابو ہو کے سب دنیا کے سامنے کایا بدلتی۔“

کچھ دیر مورنی جھکی ہوئی ہاتھ سے چادر کی سلوٹیں دور کرتی رہی۔ خاموش بیٹھی رہی، پھر بولی۔ ”بہت چھوٹی تھی میں۔ اسے جان ہی نہ پائی۔ نہ اپنے باپ کو جان پائی یہ سنا ہے ماں کے بعد مہینہ ڈیڑھ اور جیا وہ بیمار ہو کے مر گیا وہ بھی۔“

مورنی اب دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔ یہ بظاہر بے فکر لڑکی، ہر دم ہنسنے والی، کیسے دکھ، کتنی محرومیاں چھپائے بیٹھی تھی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر تسلی دی۔ اس کا سر تھپکا۔ وہ میرے سینے سے آگئی، سکیاں لے لے کر رونے لگی۔

مراتبے والے بڑے کمرے کا دروازہ بے آواز کھلا اور ایک لڑکی باورچیوں کا اپرن کمرے سے باندھے لکڑی کا بڑا سا پیالہ اٹھائے اندر آئی۔ اس نے مورنی کو میرے سینے سے لگے دیکھا اور مسکرائی۔ میں نے آہستہ سے اسے خود سے دور کیا تو آنے والی لڑکی نے دیکھا کہ وہ رو رہی ہے، اس کا مسکراتا بند ہو گیا۔ وہ پیالہ اٹھائے میرے پاس آئی۔ میری طرف بڑھا کر بولی۔ ”لمبی پھلیوں کا شور بہ ہے۔ کئی کا دلیر پڑا ہے پی لو۔ تھوڑا سا اسے بھی پلا دینا۔ خوش رہے گی، خوش کرے گی۔“

اس نے مورنی کی طرف اشارہ کیا تھا اور پھر مسکرائی تھی۔ عجیب بات کہی تھی س نے۔

میں نے سنجیدہ صورت بنائے اس کی طرف دیکھا تو مسکراتا بند کر کے وہ رازدارانہ کہنے لگی۔ ”تمہیں شاید خبر نہ ہو، اسے مورنی کو تو خیر پتا ہے کہ دھیان والے کمرے میں کوئی اکیلا سو تو سکتا ہے پر دو کے، عورت مرد کے رہنے بسنے کی سائی نہیں ہے۔ اگر تم نے اس پہ اپنی چادر ڈال دی ہے تو آگوا سے کہہ کے کوئی کمرہ لے لینا، وہاں رہنا بسنا دونوں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر جانے لگی، پھر ذرا رک کر بولی۔ ”اُبھی ادھر ہی جا رہی ہوں۔ بولو تو ادھر کوئی کمرہ تلاش کر کے رکھوں۔“

مجھے غصہ آگیا۔ کیا بے وقوف لڑکی ہے۔ میں نے کہا۔ ”رکو۔ وہ مڑ گئی۔“ یہ تم کیا بک کر کے چلی ہو۔“ میں نے مورنی کو مخاطب کیا۔ ”مورنی۔ یہ لڑکی کیوں ایسی بے کار باتیں کر کے جا رہی ہے۔ کون ہے یہ؟“

مورنی نے سر اٹھا کے دیکھا۔ نرمی سے اس سے کہا۔ ”سنو۔ تمہاری سمجھ میں جو نہ آئے، وہ پوچھ لیا کرو۔ تا سبھی کی باتیں کیوں سوچتی اور کہتی ہو؟“

مورنی اگرچہ ڈانٹ رہی تھی تو یہ بالکل بے اثر ڈانٹ تھی۔

لڑکی نے اس کی بات سنی۔ مسکراتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا اور ہال سے نکل گئی۔

میرا غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے مورنی سے کہا۔ ”جاتے ہوئے یہ شور بہ

کے لیے۔

ٹھیک تو ہے یہ ان کے زندہ رہنے کی ایک سبیل تھی۔ کایا بدلنے کا یہ علم کوئی بیل تماشا جادوگری نہیں تھا۔

میں نے ان لوگوں پر سختی سے فیصلہ دیا تھا اور میں نے یہ فیصلہ بغیر جانے سنا دیا نا۔ ٹھیک تو ہے۔ میں ان کے عذاب کس طرح جان سکتا، اگر مورنی اپنی سادہ دلیلوں سے مجھے قائل نہ کر لیتی۔

میں نے کہا۔ ”مورنی مجھے ابھی کوسوی کے پاس لے چلو۔ میں اسے منانا چاہتا ہوں۔ اس سے کچھ اچھی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔“

مورنی جو تھکی ماندی سی پیال کے گدے پر آ لیٹی تھی، مستعدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی۔ ”ابھی لو۔ میں کہہ آتی ہوں کہ تم اس کے پاس آرہے ہو۔“ اور وہ تیر کی رخ کرے سے نکل گئی۔

وہ اب پہلے والی مورنی تھی۔ بجلی کی طرح سب رفتار اور مستعد۔

وہ دو تین منٹ میں لوٹ آئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے میری کلائی تھامی، ٹھیک سے پاپوشیں پہننے کا موقع بھی نہ دیا اور مجھے کھینچ کر لے چلی۔

مراتبہ دھیان کے کمرے کے باہر برآمدہ سنان تھا۔ وہ بے آواز اس ہداری سے گزرتی کوسوی کے دروازے پر لے گئی اور مجھے اندر دھکا دے کر دروازہ بڑتی خود دھیمی آواز میں ہنستی ہوئی چلی گئی۔

کوسوی کے کمرے میں نئے کھلے ہوئے کنول کے پھول کی مہک تھی اور ساتھ ہی اگر جی کی دھیمی خوشبو بھی۔ کمرے میں ایک سادہ اور بڑی سی چوکی، ایک کرسی اور لٹوں کی چھوٹی الماری کل اتنی چیزیں تھیں۔ روشنی اور ہوا یہاں بھی اس طرح نامعلوم اور کم معلوم ماخذ سے آرہی تھی۔ کسی قسم کی سٹھن یہاں نہیں تھی لیکن یہاں کی تازگی جی ناموس سی تھی۔ جیسے کسی کیماوی طریقے سے ہوا صاف کی گئی ہو۔

جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا، کوسوی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مسکرا کر بولی۔ ”آؤ اب تک اس بات سے دکھی ہوں کہ تم سے کڑوی بات کہہ کر چلی آئی تھی۔ اب تم آؤ آگئے۔ یہ تمہاری بڑائی ہے۔ میں معافی مانگنے آنے والی تھی مگر تم بازی لے گئے۔“

میں نے کہا۔ ”کوسوی۔ وہاں میں رہ کے تم دنیا ترک کر دینے والوں کی سی زبان لے لی ہو۔ غلطی میری تھی اور میں عذر پیش کرنے، اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے آیا

دور بہ لیتی جانا، میں نہیں پیوں گا۔“

مورنی بولی۔ ”تم ابھی تک خفا ہو اس سے؟ وہ اچھی لڑکی ہے۔ قافلہ واہر آئے تو یہ میرے بھائی کی بیوی بن جائے گی۔“

میں نے سوچا ابھی سے یہ مورنی کے آس پاس تہمتوں اور افواہوں کا جال پر رہی ہے۔ شادی کے بعد خدا معلوم کیا کرے گی۔ مورنی بہت دیر تک مجھے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ لڑکی بس یہی تو یاد دلارہی تھی کہ دھیان تپسیا کا یہ کمرہ شدہ (پاک صاف) جگہوں میں شامل ہے۔ یہاں ایک دوسرے کو دل سے مانے ہوئے مرد عورت بھی نہ سو سکتے اور نہ رہ بس سکتے ہیں۔

میں نے کہا، میں تمہارے طریقوں پر نکتہ چینی نہیں کرتا لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہارے قبیلے کے دستور بنانے والے بڑوں نے ہر نوجوان لڑکا لڑکی کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے اور کامی بوڑھوں کی بھی رسی دراز کر دی ہے جو جس کی گاڑی میں اس کی چادا اوپر لے کے رہ پڑے، سمجھو اس کا جوڑا بن گیا۔

مورنی خندہ پیشانی سے میری یہ بات سنتی رہی۔ پھر بولی کہ شاید آگے کبھی تمہیں ہمارے اس قبیلے کے سینکڑوں برس کے حالات سننے کا موقع ملے گا۔ سمراتوں مہاراجوں اور پھر جاگیرداروں، حاکموں نے ایک ایک وقت میں قبیلے کے ہزار ہزار دودا ہزار کڑیل جوان مردوں کو مار گرایا ہے۔ ہم چار چار مہینے کھلے آسمان تلے پڑے رہے ہیں۔ ہر دھرم کے طاقتور لوگوں نے گھیر اڈال کر ہمیں پکڑنا اور اپنے دھرم میں شامل کرنا چاہا ہے۔ انگریز مشنریوں نے تو ہمارے بچوں کو کھیدا کر کے جال ڈال کے پکڑا ہے اور اپنے مشنری یتیم خانوں میں پال پوس کے اپنے دھرم میں اٹھایا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آٹھ سو جانور کے قبیلے میں صرف سترہ جوان مرد بچے تھے۔ باقی بچے، بوڑھے، مرد اور مختلف عروں کی عورتیں تھیں۔ قبیلہ ختم ہی ہو گیا تھا۔ اگر ہم اپنے شادی بیاہ اور پیدائش کے طور طریقوں کو اور اپنی رسموں کو اپنی ضرورت کے حساب سے نہ بناتے۔

میں اس کی باتیں توجہ سے سنتا رہا۔

میں نے سوچا، میرا طرز زندگی میری اپنی تاریخ سے ابھرا ہے۔ وہ اگر ایسا ہی شکار کیا ہوا قبیلہ ہے تو ہو سکتا ہے اسی شدت اور ظلم کے زمانے میں کسی ریاضت والے فقیر، سادہویا ساحر نے کایا بدلنے کی قوت حاصل کی ہوگی اور اسے محدود طرز پر اپنے گھرانے میں اپنے اعتماد کے لوگوں میں پھیلا دیا ہوگا۔ ظلم و جور سے بچنے، خود کو زندہ رکھنے

سے گزرتی برتنوں کے ریک میں جا گئی۔

میں نے کوسومی کا ہاتھ پکڑ کر جھکاتے ہوئے گھٹنوں کے بل بٹھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چیخ کر رسوئی میں موجود دوسری لڑکیوں سے بیٹھ جانے کو کہا تھا۔ ہم اس دریتچے کی طرف رخ کیے ہوئے تھے جس سے کوسومی اناروں کے قطعے دکھانا چاہتی تھی کہ دوسری طرف سے دو فائر ہوئے۔ دونوں فائر ایک ڈیڑھ بالشت سے مس ہو گئے ورنہ اس وقت یہ کہانی سنانے کو میں موجود نہ ہوتا۔

کوئی مجھے پہچانتا تھا اور نشانہ بنانا چاہتا تھا۔

کوسومی کا ہاتھ پکڑے پکڑے میں لیٹ گیا اور فرش پر پھسلے ہوئے میں نے رسوئی گھر کے ایک ایسے گوشے میں پناہ لے لی جسے کہیں سے زد میں نہیں لیا جاسکتا تھا۔ کوسومی میرے ہاتھ میں ہاتھ دیے رسوئی گھر کے صاف ہموار، پتھریلے فرش پر میرے برابر لیٹی تھی۔ وہ اس اچانک حملے سے کچھ پریشان ضرور ہو گئی تھی مگر خاصے سنبھلے ہوئے انداز میں حملے کا سامنا کر رہی تھی۔

وہ کہنے لگی۔ ”ہم اس وہم میں تھے کہ انہیں تمہارے آنے کی خبر نہیں ہوئی، پر وہ اس عرصے میں گھیر اڈالے بیٹھے تھے۔ وار کرنے کے لیے موقع کے انتظار میں تھے۔“ میں نے کہا۔ ”اچھا ہوا جودن کی روشنی میں خبر لگ گئی۔ وہ اگر ذرا بھی سمجھدار ہوتے تو اس وقت سامنے نہ آتے۔ رات ہی میں جو کرنا تھا کرتے۔“

کوسومی بولی۔ ”وہ رات میں وہار کے اس حصے میں داخل نہیں ہو سکتے۔ سب کچھ ٹھوس چٹانوں میں بنا ہے اور داخلے کا راستہ انہیں نہیں معلوم ہو بھی جائے تو اسے اڑانے توڑنے میں کم سے کم دو ہفتے لگیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں۔ وہ صرف مجھے ہٹ کرنا چاہتے ہیں۔ باقی تم لوگوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”شاید۔“

ابھی کوسومی کا کہا ہوا لفظ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ ہمارے سامنے سے اور عقب سے تابڑ توڑ گولیاں چلنے لگیں۔

کوئی گولی دیوار سے ٹکرا کر پاس آگری ہو گی یا پتھر کی کرچیاں رسوئی میں کام کرنے والی لڑکیوں پر گری ہوں گی تو وہ خوف سے چیختے لگیں۔ میں نے پوچھا۔ ”کوئی زخمی تو نہیں ہوئی؟“

ہوں۔ معافی دینے کا حق تمہارا ہے۔“

وہ ہلکے سے ہنسی۔ ”جو تم اس وقت بولتے ہو، اصل میں تو بھکشوؤں جیسی زبان ہے۔ خیر اچھی بات ہے۔ اگر غلطی تمہاری تو میں معاف کرتی ہوں لیکن غلطی کیونکہ مجھ سے ہوئی تھی اس لیے اب معاف کر دو۔“

کوسومی نے یہ کہتے ہوئے بڑھ کر میرے سر کو ہاتھ لگایا تھا۔ وہ مجھے منارہی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور سفید تال کنول کی بھینی خوشبو سے جیسے میں سرد در میں آگیا تھا۔

وہ اچانک بولی۔ ”تم نے لمبی پھلیوں کا شور بہ نہیں لیا۔ آؤ میرے ساتھ رسوئی گھر میں چلو۔ وہاں ہم دونوں کے اٹھنے بیٹھنے ٹہلنے کے لیے بہت جگہ ہے۔“ اور وہ مسکراتی ہوئی مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرنی کمرے سے نکل گئی۔ وہ مجھے راہداری سے گزارتی، میز حیاں چڑھاتی دو منزل اوپر لے گئی۔ یہاں دن کی روشنی اور تازہ ہوا تھی۔

میں خوشبو اور خواب کے کاندھوں پر اڑتا وہاں تک پہنچا تھا۔ میں خوش نصیب تھا کہ کوسومی کے ساتھ تھا۔

وہار کار سوئی گھر اچھا خاصا فیکٹری کا چھپرہ سا لگتا تھا۔ دیوار کے ساتھ چوہوں کی قطار تھی۔ بند الماریاں اور کھلے ریک تھے۔ ریک جگمگاتے پیتل کے اور قلعی کی گئی کانسی اور تانبے کے برتنوں سے جگمگا رہے تھے۔

وہی لڑکی جو مراقبے کے کمرے میں شور بہ لے کر آئی تھی۔ وہ اور اس کے ساتھ دو اور لڑکیاں اپہرن باندھے کچن میں مصروف تھیں۔ شور بہ لانے والی لڑکی نے میری طرف شوخی سے دیکھا تھا اور کوسومی کے کسی اور کی طرف متوجہ ہونے پر اشارہ کیا تھا۔ اس نے ہاتھ اپنے سر کو لگا کر میری طرف بڑھادیا تھا۔ پھر وہ مسکراتی ہوئی ٹھوم گئی۔ میں سمجھ گیا، وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہے اور مجھے منانے کا اشارہ کر رہی ہے۔

میں زیر لب مسکرایا۔ یہ نوجوان کپٹ اور کینہ رکھنا نہیں جانتے۔

کوسومی مجھے لیے ہوئے ایک کھلے فراخ دریتچے کے سامنے آئی۔ بولی ”شیر علی! تم نے یہاں سے ہمارے اناروں کا باغ نہیں دیکھا تو سمجھو کسی بہت بڑی نیکی سے محروم رہ گئے۔ اس وقت انار پھول پر آئے ہوئے ہیں اور.....“

ایک زبردست دھماکہ ہوا اور گولی میرے اور کوسومی کے درمیان کی خالی جگہ

میں نے پوچھا۔ ”بری فوج آخر جسکے کی ہم لوائی کیوں کر رہی ہے؟“
 کوسوی نے کہا۔ ”جسکے چھوڑ وہ خود شیطان سے بھی ہاتھ ملا لیتے ہیں۔
 سرکاری فوج کو تو کسی طرح مانگ یاں کالج پر قبضہ کرنا ہے۔ اب جبکہ جسکے نے انہیں
 گولی چلا کے کالج میں محسنے کا موقع دیا ہے تو وہ اسے استعمال کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اس حالت میں کہ جسکے نے یا اس کے آدمیوں نے دوسرکاری
 آدمی مارے ہیں؟ فوج کیا یہ بات نہیں جانتی؟“
 کوسوی نے کہا۔ ”وہ دو کیا دس آدمی بھی مار دیتا تو بری فوج اس موقع سے
 فائدہ اٹھاتی۔ جسکے سے ہاتھ ضرور ملاتی۔“

لاؤڈ اسپیکر پر پھر اسی اجڈ آواز میں کہا گیا۔ ”سنو یہ اعلان آگوا کے لیے بھی
 ہے۔ ہاسٹل میں ٹھہری ہوئی سب لڑکیوں کے لیے بھی ہے اگر دس منٹ کے اندر اندر
 لڑکیاں نیچے اپنے اپنے کمروں میں نہیں گئیں تو ہو سکتا ہے ہماری کارروائی سے ان کو
 نقصان پہنچ جائے۔ یہ آخری وارننگ ہے اگر ہاسٹل کی آگوا ہماری بات پر توجہ کرتی ہے تو
 اچھی بات ہے اگر وہ ہمارے اعلان کو اہمیت نہیں دیتی تو لڑکیوں کو خود اپنی فکر کرنی
 چاہیے۔ سب لڑکیاں نیچے چلی جائیں۔ ہم نو منٹ میں ہاسٹل میں داخل ہو جائیں گے۔“
 پھر منٹ بھر کے بعد اعلان کیا گیا۔ ”آٹھ منٹ بعد ہم ہاسٹل میں داخل ہونے
 کی کارروائی کریں گے۔“

اگلا اعلان انگریزی اور بری زبان میں تھا۔ اجڈ آواز والے نے براہ راست مجھے
 مخاطب کیا تھا۔ ”رنگون جیل سے بھاگے ہوئے قیدی شیر خان سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ
 معصوم بے قصور لڑکیوں کو برغمال بنائے رکھنے سے باز رہے۔ خود کو بری فوج کے حوالے
 کر دے۔ ہم قانون میں رہتے ہوئے ہر ممکن سہولت دیں گے۔ بری قانون کے مطابق
 اسے سرکاری خرچ پر وکیل دیا جائے گا۔“

پھر لاؤڈ اسپیکر پر کسی نے بری میں یہی بات کہی۔ آخر میں وہ بولا۔ ”میں مانگ
 یاں کی جامع مسجد کا پیش امام مولانا زنگون میاں۔ (پاسان گور میاں) بولتا ہوں۔ شیر
 علی تم مسلمان ہے اللہ تعالیٰ کا شکر کرو اور خود کو آرمی کے حوالے کر دو۔“ پھر مولوی
 ساگور یا زانگور میاں نے قرآن کریم کی وہ آیت پڑھی جس میں خدا اور رسول ﷺ اور
 ولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

اس کے بعد بری فوج نے بہت بڑی حماقت کی کہ مائیکرو فون جسکے کے

لڑکیوں نے بتایا کہ نہیں مگر وہ بہت خوف زدہ تھیں۔ کوسوی نے کہا وہ تینوں
 فرش پر ریختی ہوئی ٹپلی منزل میں چلی جائیں۔ ہم ان کے پیچھے آتے ہیں مگر وہ کوسوی کو
 چھوڑ کر جانے پر تیار نہیں تھیں۔

ابھی معاملہ طے بھی نہ ہوا تھا کہ گھاس کے میدان کی طرف کھلنے والے
 درپچوں میں سے کسی ایک درپچے سے ٹین کا ایک چھوٹا سا ڈبا اڑتا ہوا آیا اور رسوئی کے
 بچوں بچ فرش پر لڑھکنے لگا۔ ڈبے سے دھوئیں کی پتی لکیر نکل رہی تھی۔ آنسو گیس۔
 میں جھپٹ کر بڑھا اور خود کو ہوا کے رخ پر رکھتے ہوئے فرش پر لیٹے لیٹے ڈبے
 کو اٹھا کر کھلے درپچے سے نیچے لان پر پھینک دیا۔

کوسوی نے لڑکیوں سے درشتی سے کہا۔ ”جاؤ۔“ میں نے دیکھا وہ ریختی ہوئی
 رسوئی سے باہر جا رہی تھیں۔ دونوں لڑکیاں خوف اور شرمندگی سے ہچکیاں لے رہی
 تھیں۔ مورنی کی ہونے والی بھانج انہیں سمجھا رہی تھی۔

دو تین منٹ تک عقب سے اور سامنے لان کے رخ سے گولیوں کی بوچھاڑ آتی
 رہی۔ رسوئی گھر کی الماریاں اور برتن ٹوٹنا شروع ہو گئے۔

پھر لان کی طرف سے گونج دار آواز آئی جیسے کوئی مائیکرو فون ٹیسٹ کر رہا
 ہو۔ جی ہاں یہ مائیکرو فون ہی تھا۔ لمبے بھر بعد بھاری اجڈ سی آواز نے لاؤ اسپیکر پر کہا۔
 ”لڑکیوں کے ہاسٹل میں ایک بھاگا ہوا قیدی چھپا ہے۔ ہاسٹل کی آگوا کو چاہیے اسے سرکاری
 فوج کے حوالے کر دے۔ یا وہ خود اپنی ساتھی لڑکیوں کو لے کر نیچے چلی جائے۔ ہم آرہے
 ہیں۔“

کوسوی نے میری طرف دیکھا۔ بولی۔ ”فوج والے اب تک تو اپنی کارروائی
 میں لگے تھے وہ کالج اور ہاسٹل کی عمارتوں پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اب انہیں تمہاری
 تلاش ہے۔۔۔ لگتا ہے جسکے ان کے ساتھ مل گیا ہے۔ یہ بھاگے ہوئے قیدی والی لائن
 اسی کی دی ہوئی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیسے کہہ سکتی ہو؟“
 وہ بولی۔ ”جسکے کو تمہارے مانگ یاں آنے کی خبر ہوئی ہے اتنا تو ہمیں پتا
 ہے۔ تم نے مورنی نے اور دوسروں نے اسے ذیل کر کے قافلے سے نکال دیا اور سردار
 کی گاڑی لے کر یہاں آئے؟ تو اسے کالج کے خلاف اپنا منصوبہ ناکام ہوتا دکھائی دیا اس
 لیے اس نے فوج سے ہاتھ ملالیا۔“

اور وہاں سے ہماری طرف گولیاں چلانے لگے۔ انہوں نے جسکے کے اس ساتھی کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا جو ٹانگ میں گولی لگنے سے زخمی ہوا تھا اور اب کھلے لان پر بے بسی کے عالم میں پڑاڑ کرتا تھا اور کبھی گالی دے کر کبھی گھٹکیا کر فوج والوں کو مدد کے لیے بلاتا تھا۔

وردی والوں میں سے ایک کو شرم آئی ہو گی تو وہ بہت زبردست کورنگ فائر سے مدد لیتا ہوا جھپٹ کر اپنی نئی پناہ گاہ سے نکلا اور زخمی قبائلی کو ہاتھ سے پکڑ کر لان پر کھینچتا ہوا واپس لے چلا۔

ہماری طرف سے فائر کرنے والا کوئی بہت ہی ہوشیار اور بے خوف بندو قبی تھا۔ اس نے فوجیوں کی طرف سے اتنے بھاری کورنگ فائر کے باوجود پناہ گاہ کی طرف واپس جاتے ان دو فوجیوں پر پھر فائر کیے۔

زخمی قبائلی کو اس بار سر میں گولی لگی اور اسے مصیبت سے نجات مل گئی۔ قبائلی کے گولی لگتے ہی فوجی نے اس کا بے جان ہاتھ چھوڑ دیا اور بھاگ کر اپنی نئی کمین گاہ میں جا چھا۔

میں نے کوسومی سے پوچھا۔ ”یہ ہماری طرف سے فائر کس نے کیا تھا؟“

کہنے لگی۔ ”معلوم نہیں۔ آؤ پتا کرتے ہیں۔“

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رسوئی کے ہموار فرش پر ریگتے ہوئے ڈھکی ہوئی میز ہیوں پر آئے اور وہاں سے تقریباً دوڑتے ہوئے نیچے دھار کی محفوظ دنیا میں پہنچ گئے۔

کمرؤں کے سامنے لڑکیاں کھڑی تھیں اور تشویش سے ہمیں آتا دیکھ رہی تھیں۔

لڑکیوں میں نئی اور پرانی سبھی تھیں۔ پورا برآمدہ خاموش کھڑی لڑکیوں سے بھرا تھا۔ میں نے نظروں ہی نظروں میں جائزہ لیا۔ مورنی اور بیالا اس ہجوم میں نہیں تھیں۔

کوسومی نے مجھے اشارہ کیا اور کچھ بھرے برآمدے میں راستہ بناتی وہ ایک طرف چل پڑی۔ ہم ایک کمرے میں داخل ہو کر میز حیاں چڑھے اور لان کی طرف کھٹنے والی ایک گیلری میں نکل آئے۔ یہاں گیلری میں کوئی لڑکی گھٹنوں کے بل رانقل سنبھالے بیٹھی تھی اور فوج کے نئے مورچوں کی طرف اپنی دوربین سے درختوں کے

حوالے کر دیا۔ اس نے دینی قبائلی بری زبان میں کوسومی کو بھیجی کہہ کر بلایا اور اسے خبر دی کہ شیر علی مسلمان نے ہم لوگ سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے تیرے دادا اور میرے بوڑھے سردار کو میری آنکھوں کے سامنے خنجر مار کر ہلاک کیا ہے اور مورنی کے بھائی کو بھی سازش میں شریک کر کے اسی وقت بڑے بوڑھے سردار کا کریا کرم بھی کر دیا۔ تجھے اس کا دیدار نہیں کرنے دیا۔ اس لیے کوسومی میری پیاری بھیجی تو اس بد معاش شیر علی کو جو تجھے اور دوسری لڑکیوں کو فرض کے خلاف روکے ہوئے ہے فوراً فوجی حکام کے حوالے کر دے اور میرے اور فوج کے ہاتھ مضبوط کر۔“

جسکے نے یہ احمقانہ اعلان، جس کی کوئی ایک کل بھی سیدھی نہیں تھی، کرنے کے بعد فوجیوں کو مانیکر و فون دے دیا جنہوں نے اعلان کیا کہ وہ پانچ منٹ بعد ہاسٹل میں داخل ہو جائیں گے اور نقصان کی تمام ذمہ داری ہاسٹل کی لڑکیوں پر ہو گی جو فوج کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتیں۔

وہ لوگ سیاست، عیاری، جھوٹ اور فوجی حکمت عملی سب کو ملا کر دھوکا دینا اور کسی طرح مجھے قابو میں کرنا چاہتے تھے مگر۔

کوسومی نے کہا۔ ”ان کی بکواس مت سنو وہ ہمیں ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ ہمارے پاس خوراک کا ذخیرہ ہے۔ پروا نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ان کے پاس وقت ہی وقت ہے اور وقت ہمارا دشمن ہے کوسومی۔ وہی ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ چھاؤنی ڈال کر یہاں پڑے رہیں گے ہمارا خوراک کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا اور ہم دروازے کھول دیں گے۔“

کوسومی سوچ میں پڑ گئی۔ کوئی پانچ بجے منٹ گزرے ہوں گے کہ انہوں نے پھر دونوں طرف سے گولیاں چلائی شروع کر دیں۔ کسی مقصد کے بغیر انہوں نے آٹو گیس کا ایک شیل اور پھینکا تھا۔ میں نے اسے بھی واپس انہی کی طرف اچھال دیا۔

اتفاق دیکھیے کہ میرا اچھالا ہوا شیل اب ان کے اس مورچے میں جا کر اچھاٹار کے جھنڈ کے پیچھے انہوں نے قائم کر رکھا تھا۔ اس طرف کی فائرنگ بند ہو گئی اور وہ ہڑبڑا کر بری میں مجھے گالیاں دیتے ہوئے باہر لان پر نکل آئے۔ ہماری طرف سے خبر نہیں کس نے پے درپے دو فائر داغ دیے وردی والوں کی مدد کرنے والے قبائلیوں میں سے ایک جو اٹار کے جھنڈ سے نکل کر کھلے میں آگیا تھا۔ ہمارے فائر سے زخمی ہو کر گر ا۔

فائر سے پناہ لینے کے ارادے سے وردی والے ایک دوسرے ہی کج میں جا چھپے

ہے۔ کپڑوں سے عاری۔ اور وہ عورت کا جسم تھا۔ وہ بیالا بائے کا زندہ بدن تھا۔ ان کتوں کو معلوم تھا کہ گیلری کی اس پوزیشن پر جو بھی رانقل لیے بیٹھا ہے اس کے پاس دور بین ہے۔ وہ دور بین والے کو یہ منظر دکھانا چاہتے تھے۔

لحے بھر بعد لاؤڈ اسپیکر کی غصست بھری آواز سنائی دینے لگی، وہی کرخت اجڑا لہجہ والا بکواس کر رہا تھا، کہنے لگا۔ ”گیلری والے ہمارے دوست کو چاہیے کہ وہ اپنی پوزیشن سے دور بین لگا کر دیکھ لیں۔ ہماری مجبوری کا انہیں اندازہ ہو جائے گا۔ ہم ان سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ بھاگے ہوئے قیدی شیر خان کو ہمارے حوالے کر دیں اور اس بچی۔۔۔ کیانام بیالا بائے کو۔۔۔ اور دوسری تمام بچیوں کو امتحان میں نہ ڈالیں۔“

میں نے دور بین مورنی کے ہاتھ میں تھما دی ان کی اس بزدلی اور کینٹکی پر مجھے متلی ہونے لگی تھی۔ کتے تو پھر باوقار ہوتے ہوں گے وہ سوروں بلکہ ان سے بھی گھٹاؤنی کسی چیز سے زیادہ گندے اور لعنتی تھے۔

مورنی نے آنکھوں سے دور بین لگالی تھی۔ اس کا بدن چڑھی ہوئی کمان کی طرح تن گیا تھا اور رانقل کے اسٹوک پر جما ہوا اس کا ہاتھ کسی حملہ آور جانور کی طرح کڑا ہو کر ہلکے سے ایک بار لرزا اٹھا۔

پھر اچانک مورنی نے ایک ہاتھ سے دور بین لگائے لگائے رانقل اٹھا کر اپنے کندھے سے نکالی۔

میں نے حملہ کرتے کو برے طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”مورنی کیا کرتی ہو؟“ وہ لرزتی آواز میں بولی۔ ”میں اس‘ اس بزدل‘ کتے کو ہٹ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ اس پر حاوی آگیا ہے۔“

میں نے اس کے رانقل والے ہاتھ کو گیلری کی ریلنگ پر دبا دیا۔ ”پاگل ہوئی ہو فارم مت کرو۔ اتنی دور سے گولی اسے نہیں لگ سکتی بیالا کے لگ سکتی ہے گولی۔“

لاؤڈ اسپیکر پر جیسے اپنی ذلات کی رنگ کنٹری کرتے ہوئے اس کرخت آواز والے نے کہا۔ ”گیلری والے ہمارے دوست نے دیکھ لیا ہو گا کہ ہم نے کس طرح اس بچی بیالا کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے اپنے ایک والسٹیر کو بیالا کی نہایت پرستل ضرورت کی تکمیل کے لیے خطرے تک میں جھونک دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں گیلری سے ہمارے اس والسٹیر کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے لیکن اٹھارہویں گھنٹوں گھال ڈویژن کی پہلی ترچنار جنت کے یہ جوان۔۔۔ یہ پر عزم جوان خطروں سے کھیل۔“

جھنڈ میں کچھ دیکھ رہی تھی۔ ہماری آہٹ سن کر وہ تڑپ کر پلٹی۔ یہ مورنی تھی۔ وہ مجھے اور کوسومی کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ کوسومی نے پوچھا۔ ”بیالا کہاں ہے؟“

مورنی نے گیلری سے آگے مورچوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں۔“

”خدا لیا۔ وہ لڑکی بیالا ان کے قابو میں آگئی۔ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ جسے ابھی میں نے گولی مار کے ٹھنڈا کیا ہے جسکے کے جچے اس کینے کو میں نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ وہ بیالا کو ہتھکڑی لگا کے منہ باندھ کے لایا تھا۔ اتار کے اس مورچے میں لایا تھا کتے کا جنا۔“

کوسومی نے پوچھا۔ ”انہوں نے کیوں۔۔۔ انہوں نے بیالا کو کیوں پکڑا ہے؟ اسے یہاں مورچے میں کیوں لائے ہیں؟“

مورنی نے کہا۔ ”سودے بازی کرنا چاہتے ہوں گے۔۔۔ یا۔۔۔“

”یا کیا؟“ کوسومی نے پوچھا۔

”یا حرام کے جنے بیالا کو خراب کرنے لائے ہوں گے۔“

کوسومی کے لہجے میں بہت بے اعتباری تھی۔ ”یہ۔۔۔ کیسے ہو سکتا ہے؟ ناممکن۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں کوسومی! میں جانتا ہوں۔ اس طرح کی فوج سب کچھ کر سکتی ہے۔“

کوسومی جو عام طور پر خود کو وقار کے ساتھ اور پرسکون رکھتی تھی ایک دم مورنی کی طرف مڑی۔ ”تم نے اچھا کیا اس بے غیرت کو گولی مار دی۔ لاؤ دور بین دو مجھے۔“

مورنی نے اسے دور بین پکڑا دی۔ کوسومی کچھ دیر تک مورچے میں اور اس کے گرد پیش دیکھتی رہی پھر اس نے دور بین میرے حوالے کر دی اور مورچے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں۔“

میں نے دور بین آنکھوں سے لگائی اور اگلے ہی لمحے شرم اور غصے میں جیسے لرز کر رہ گیا۔ انہوں نے اتار کے چھدرے جھنڈ کے پار ریت کی بوریاں جما کر اپنی گن پوزیشن بنائی تھی۔ ریت بھری بوریوں پر انہوں نے کچھ ڈال رکھا تھا۔ ایک نظر میں وہ گلابی رنگ کا کپڑا دکھائی دیتا تھا مگر غور سے دیکھنے پر سمجھ میں آ جاتا تھا کہ وہ ایک انسانی جسم

بچاؤ کرنے میں مصروف ہو جائیں گے۔ اس لیے لڑکی بیالا کو بڑے دکھ کے ساتھ اس کے مقدر کے حوالے کر دیں گے اب جو اس بے چاری کے نصیب میں لکھا ہو گا وہ خود بھوگے گی۔“

یہ نہ معلوم کیسا شیطانی منصوبہ تھا جس پر وہ عمل کرنے جا رہے تھے۔ ہم تینوں دم سادھے دیکھتے رہے۔

اچانک ان کے مورچے کی طرف سے جیسے آدمی پیلا کو اس حالت میں اٹھائے کہ اس کے بدن پر ایک چیتھڑا نہیں تھا، لان میں لے آئے۔ ایک نے بجلی جیسے تاروں کا کچھا گھاس پر ڈال دیا۔ دوسرے نے ہتھوڑی لگائی ہوئی زنجیروں میں جکڑی ”منہ بندھی“ مچلتی ہوئی اس بے بس لڑکی کو تاروں کے سچھے پر ڈال دیا، پھر ان میں سے ایک وردی والا تار کا ایک سرا پکڑ کر بھاگتا ہوا واپس مورچے میں کود گیا۔

دوسرے فوجی بھی پلک جھپکتے ہی مورچے میں جا چکے تھے۔ میں نے سوچا یہ فیوز وائر ہو گا۔ اگر اس کے ایک سرے پر آگ لگا دی جائے تو یہ آہستہ آہستہ جلتا ہوا کچھ تک آجائے گا جہاں انہوں نے بیلا کو ڈال دیا ہے۔ پسینے سے میرے ہاتھ پسینے گئے۔ یہ فیوز اگر جلتا ہوا کچھ تک آگیا تو پھر ایک دھماکے سے پھٹے گا۔ ہو سکتا ہے ان بد معاشوں نے اسے زیادہ موثر بنانے کو کچھ اور بھی کیا ہو۔ میں نے دور بین آنکھوں سے لگائی۔ اودھا! یہ بد معاش ہمارے تصور سے کہیں زیادہ ظالم ہیں۔

انہوں نے بیالا کی بغلوں میں ٹیپ کی مدد سے ڈائنامائٹ کی ایک ایک اسٹک چپکا دی تھی اور پشت کی طرف ہاتھ لے جا کر جھکڑی ڈال دی تھی۔

میں نے خاموشی سے دور بین کو سومی کے حوالے کر دی۔ کو سومی نے وہ سب کچھ دیکھ کر دور بین مورتی کو پکڑا دی۔

مورچے کی طرف سے مانکرو فون پر کہا گیا۔ ”دیکھو میرے دوست! یہ دھیرے دھیرے جلنے والا فیوز واٹر ہے جس کا ایک سرالے کرا بھی ہمارا ایک شیر دل جوان مورچے میں کود گیا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہو گی کہ دھیرے دھیرے جلنے والے اس تار کے سرے پر بے دھیانی میں کوئی جواں سگریٹ سلگاتے ہوئے کہیں اپنا لائٹرنہ لگا دے۔ وہ بہت برا ہو گا۔ ہم پوری احتیاط کریں گے پھر بھی اگر لائٹرنہ کرنے تار کے سرے سے جلتا ہوا لائٹرنہ چھو گیا تو ایسی جھینگر درگھٹنا _____ اتنا بھیانک ایکسیڈنٹ ہو جائے گا کہ چچ _____ چچ _____ توبہ توبہ۔ اسی کارن گیلری میں بیٹھے اس دوست سے ہم

میرے ذہن کی رو بھٹک گئی تھی اور میں اس گراوٹ کو کہ جس تک مانگ یاں کا گھیرا ڈالنے والے وہ بزدل جاسکتے تھے، ابھی تک سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ کوسومی نے تڑپ کر رائفل پر ہاتھ ڈال دیا اور میرے اور مورنی کے کچھ کرنے سے پہلے انار کے جھنڈ کی طرف فائر کیا۔

کوسومی نے، جو اتنی پر امن، اتنی سنجیدہ اور سوشل لگتی تھی ایک پر تشدد کارروائی کر ڈالی تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ اور میں بیالا کی طرف سے فکر مند ہو گیا۔ میں نے مورنی کے ہاتھ سے دور بین جھپٹ لی۔

گھبرا ڈالنے والوں کی پوزیشن پر جیسے آفت آگئی تھی۔ خود کو بندوبستی کی متوقع زد سے بچاتے ہوئے دو تین برمی فوجی اپنے اس ساتھی کو بیالا کے بدن پر سے کھینچ کر ہٹا رہے تھے میں نے خوف زدہ ہو کر دیکھا کہ بیالا کا بے داغ بدن خون سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ مگر اس پر سے جس وردی پوش کو کھینچ کر ہٹایا جا رہا تھا وہ بھی خون سے تر تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ وہ خون جس میں بیالا اس وقت تر ہے خدا کرے کہ اس نجس جوان کا خون ہو جو یقیناً کسی اٹھارہویں گھنٹہ گھال ڈوبیٹن کی پہلی ترچنار جھنٹ کے لیے بھی باعث شرم ہو گا۔

پھر اس مورچے سے ایک ایل ایم جی اور بہت سی آٹومیک رائفٹوں سے فار ہونے لگے۔ ہم تینوں سیدھی آتی اور اچھتی گولیوں کی زد سے بچنے کو لیٹ گئے۔ مورنی نے تشویش سے کہا۔ ”کو سومی! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ وہ غصے میں بیلا کو ختم بھی کر سکتے ہیں۔“

کو سومی بولی۔ ”وہ ویسے بھی اسے مار ڈالیں گے۔“

بیلا کے لیے کچھ کرنا ہو گا میں نے سوچا۔ مثلاً کیا کر سکتے ہیں ہم لوگ؟ میں تیزی سے مختلف منصوبے بناتا اور رد کرتا رہا۔

ان کی فائرنگ بند ہوئی تو لاؤڈ اسپیکر کی مکروہ آواز آنے لگی۔ ”گیلری والے کو معلوم ہونا چاہیے ہمارا جوان اس کی گولی سے مارا گیا ہے۔ ہماری طرف سے یہ پہلا نہیں دوسرا آدمی تھا۔ ایک اور سویلین کو گیلری سے فائر کر کے مار دیا گیا ہے۔ دو کی تعداد ہماری حد ہوتی ہے لہذا اب وہ حد آجکی ہے۔ ہم اب اپنا بچاؤ کریں گے۔ اس لیے اس بچی بیلا کو جسے ہم نے گیلری کی طرف سے آتے فائر سے بچانے کو اپنے مورچے میں پناہ دے رکھی تھی ہم اب افسوس کے ساتھ رخصت کر رہے ہیں کیونکہ اب ہم اپنا

گی۔ میں نے جھٹکا دے کر رینگ پر اپنے قدم جمائے تھے۔
مگر مورنی کو چوٹ نہیں لگتی چاہیے میں نے سوچا اور مجھے اس کی گرفت سے آزاد بھی ہوتا ہے۔

میری اگلی حرکت کا آغاز بھی نہ ہو پایا تھا کہ کوسوی کی سنساتی سرگوشی سنائی دی۔ ”شیر علی! وہاں کچھ ہو رہا ہے۔ مورچے پر کوئی آگیا ہے۔ چڑھ آیا ہے کوئی۔ دو ہیں۔ اے مالک! یہ تو میر باز ہے اور بیالا کا آدمی ہے۔“
میں نے چیخ کر کہا۔ ”وہ آگئے ہیں تو پھر مجھے مت روک۔ جانے دے۔ ہم تین ان حرام زادوں سے نمٹ لیں گے۔“

لڑکیوں نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ مورچے کی طرف سے ایک دم ایل ایم جی چلی اور ایک لمبے برسٹ کے بعد بند ہو گئی۔ ”یاخا“ کا نعرہ سنائی دیا۔ یہ ایک بے معنی آواز تھا جو میرا دوست میر باز جملے کرتے ہوئے یاخوشی کی مستی میں لگاتا تھا۔
مجھے وہیں کھڑے کھڑے کوسوی نے دور بین تھما دی۔ میں نے رینگ پر سے دیکھا کہ میر باز خان، میرا شیر دل دوست، مورچے کی ریت بھری بوریوں پر کھڑا ہے۔ اس نے ایک وردی پوش کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر سر سے بلند کیا ہوا ہے۔ وردی پوش بے بسی میں ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے کہ میں نے دیکھا۔ میر باز نے نعرہ مارتے ہوئے وردی پوش کو نشانہ سادھ کر چلتے ہوئے فیوز وائر پر پھینک دیا۔

مورچے میں سے ایک ہی فائر ہوا۔ گولی شاید میر باز کے بازو میں لگی تھی۔ وہ بوریوں پر کھڑے کھڑے ابل کر رہ گیا مگر اس نے خود کو سنبھالا اور مورچے سے بہت تکلیف سے کود کر دوڑتا لڑکھڑاتا فیوز کے لچھے پر پڑی بیالا کی طرف بڑھا۔
”میر باز! برید! ٹھہر جا مڑا۔ ٹھہر میں آتا ہوں۔“ میں نے پکار کر کہا مگر مجھے معلوم تھا اس تک میری آواز نہیں پہنچی ہو گی۔

کہیں سے ایک شاٹ گن سے ایک اور اس کے بعد دوسرا فائر کیا گیا۔ ایک فائر مس ہوا۔ دوسرا میر باز کے بائیں پہلو میں لگا۔ ادھر میں نے پیر چلا کر ٹھوکر مارتے ہوئے مورنی کی گرفت سے خود کو آزاد کیا۔

معر کے کی خاموشی میں کوسوی کی پکار سنائی دی۔ ”شیر! میں دیکھ رہی ہوں وہ مشین گن ری لوڈ کر رہے ہیں۔ شیر! انہیں فوراً ہٹا دو۔ گن کے پاس سے ہٹا دو نہیں تو دونوں مارے جاؤ گے۔“

ہاتھ باندھ کر بنتی کرتے ہیں کہ لڑکی بیالا کو بچانے کا کوئی سادھن (مدیر) کر دو۔ اس مجرم شیر علی کو اوپر سے دھکا دے کر گردا دو تاکہ قانون پر عمل کرتے ہوئے اسے واپس رہنمون کی جیل میں قانون کی حفاظت میں پہنچا دیا جائے۔“

یہ آواز تنی اشتعال انگیز تھی۔ اس کی کہی ہوئی بات نہیں بلکہ اس مٹکیاتے ہوئے فریبی کی آواز ہی خون میں غصے کی لہریں دوڑا دیتی تھی۔ مورنی سے غصہ ضبط نہ ہو سکا اس نے چیخ کر کہا۔ ”زرگ (جہنم) میں جا تو کتے!“ اور اس نے ان کی پوزیشن پر پے در پے تین فائر جموٹک دیے۔

ایک پٹاخہ سا ہوا اور لاؤڈ سپیکر کی آواز بند ہو گئی۔ لاؤڈ اسپیکر کو گولی نے چھار چھار کر دیا تھا۔

ایک دم ایسا سکون بخش سنا ہوا گیا کہ میں نے خود اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز سنی۔ کوسوی آنکھوں سے دور بین لگائے ان لوگوں کے مورچے میں دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے سسکی لی۔ ”شیر علی! انہوں نے فیوز کو آگ دکھا دی ہے۔“
اس فاصلے سے بھی ہمیں فیوز کے جلنے کی ”سس سس“ خوب واضح سنائی دے رہی تھی۔

میں اٹھا اور ایک جست میں گیلری کی رینگ پر آگیا۔ اس بے قصور لڑکی کو اس طرح مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔
میں خود کو ان کے حوالے کر دوں گا۔

اپنے فیصلے میں اتنا پر یقین اور بے پروا ہو گیا تھا کہ میں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ مورنی نے اپنی بانہ پھیلا کر میری ٹانگیں ٹھٹھنوں کے پاس سے جکڑ لی ہیں پھر وہ اپنا سر، شانہ اور بازو ایک جنونی گرفت میں باندھے اور خود کو میری پنڈلیوں، رانوں سے جوڑے لوہے کی رینگ سے اس طرح الجھ گئی کہ جست کرنا کجا میرے لیے تو حرکت کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔

میں نے غضب ناک آواز میں کہا۔ ”مورنی! چھوڑ دے مجھے۔ تو چوٹ کھا جائے گی۔ چھوڑ مجھے۔“

وہ چیخ کر بولی۔ ”مار دے مجھے سردار۔ پر میں تجھے چھوڑوں ہی نہیں۔“
میں نے جھٹکا دیا۔ ٹھیک ہے اگر یہ لڑکی باز نہیں آئی تو جو ہو سو ہو۔ جست تو مجھے کرنی ہے ٹھیک ہے اگر میں اسے لے کر گیلری سے گرتا ہوں تو یہ اپنا بچاؤ خود کر لے

خوار بنجوں کی لگا کر اس خوف بھٹک مشین کو توڑ موڑ کر اس قابل کر دیا کہ اسے اب کباز خریدنے والے ہی ترازو سے تول کر کہیں لے جاسکتے تھے۔

اس مورچے کو ختم کرنے کے بعد اب مجھے دوسرے مورچے اور شاٹ گن سے فائر کرنے والے قبائلی کو تلاش کرنا تھا۔

میں نے ریت کی بوریوں پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ میر باز نے اپنا خون میں لت پت اوپری لباس اپنے بدن سے کھینچ کر اتار لیا تھا اور اس کی مدد سے معقول حد تک بیالا کا جسم ڈھک دیا تھا۔ اب وہ اس لڑکی کو اپنے زخمی پہلو اور ایک بازو کی معذوری کے باوجود فیوز کے گچھے پر سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار وہ کامیاب ہو گیا پھر اس نے مجھے دیکھا اور وہ اپنے خون آلودہ پٹھے ہوئے شلو کے میں بیالا کو لپیٹے پناہ کی تلاش میں لڑکھاتا کرتا سنبھلا کسی اور طرف بڑھ گیا۔

میں نے دیکھا فیوز بچہ چکا تھا۔

تو پھر میر باز کس خطرے سے بچ کر بھاگ رہا ہے؟

اور میر باز نے مجھے شیر کو ریت کی بوریوں پر کھڑے دیکھا تھا جب ہی وہ ہٹ گیا۔

گولیاں چلاتے دشمنوں کے بعد اب ایک خوں خوار جانور شیر آ موجود ہوا تھا جس سے وہ بیالا کو اور خود کو بچا رہا تھا۔

میں بوریوں سے اتر آیا۔ مجھے میر باز سے دور ہو جانا چاہیے۔ میں اس سمت میں درختوں کے درمیان جست و خیز کرتا دوسرے مورچوں اور دشمنوں کی تلاش میں کالج کے وسیع کمپاؤنڈ میں نکل گیا۔

اور یہاں میں نے ایک قبائلی کو دو نالی بارہ بور پکڑے ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر دوسرے کی اوٹ میں جاتے دیکھا۔ میں پہچان گیا۔ یہ حسگے تھا۔

حسگے بری تھا۔ وہ قبائلی تھا اس نے کھلے علاقوں میں عمر گزاری تھی۔ وہ جنگلی جانوروں، خاص طور پر کٹیوں کو خوب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔

اگر اس نے درخت کی اوٹ اس لیے لی ہے کہ وہ سامنے آئے شیر کو مجھے گزر جانے کا موقع دینا چاہتا ہے تو یہ عین فطری رد عمل ہے۔ کوئی بھی شیر اگر وہ شکار پر نہ نکلا ہوا ہو وہ آدمی کی تلاش میں درخت کے پیچھے نہیں جھانکے گا۔ اور اگر حسگے درخت کی

حیرت ہوئی کہ میرے غصیائے ہوئے دماغ میں کوسومی کی اس بات کا مطلب فوراً کھل گیا۔ میں سمجھ گیا وہ کیا چاہتی ہے۔ میں جان گیا کہ اس وقت صرف دلیری سے کام نہیں چلے گا۔ انہیں مشین گن کے پاس سے فوراً ہٹانا ہو گا۔

میں نے رینگ سے ادرہ ہی گیلری میں الٹی جست لگائی اور فرش پر جھک کر خود سے کہا۔ ”شیر کی کایا میں آ جا شیر علی۔“

پلک جھپکتے میں ایک سیاہ غبار پیدا ہوا اور میں نے فرش پر جے اپنے انسانی ہاتھوں کو چپکتے نکوار ناخنوں والے شیر بنجوں میں بدلتے دیکھا۔ میں اب شیر نہ تھا۔ اگلے ہی لمحے میں گیلری کی فولادی رینگ پر تھا اور اس سے اگلے پل جست لگا کر پھلوار کے قطعے میں۔ یہاں سے مورچہ میری ایک جست کی دوری پر تھا۔

میں نے غضب ناک دھاڑ ماری اور اس ایک جست میں بوریوں کی نیچی دیوار الٹا نکلتا ہوا مورچے میں کود گیا۔

وہاں تین وردی پوش ایل ایم جی کے پاس ماہرانہ انداز میں جے ہوئے تھے۔ مشین گن لوڈ کرنے کے بعد وہ اسے میر باز کی اور بیالا کی طرف سادھنے والے تھے کہ میں۔ شیر۔ دھاڑتا ہوا اپنے پیچھے اور دہانہ کھولے خنجر دانت تیز کیے ان پر آپڑا۔ ”ہا آ آ آ آ آ۔“ لڑزنی ہوئی آواز میں ایک نے واویلا کیا اور چاروں ہاتھ بیروں کے بل مورچے سے نکل کے بھاگے۔

دوسرے کے کھٹکھی بندھ گئی تھی اور مجھے لگا جیسے اس نجس نے اپنی وردی کچھ اور بھی زیادہ نجس کر دی ہے۔

تیسرے نے ہمت کر کے ایل ایم جی کا ٹریگر بریکٹ اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ اپنی کہنیوں کی مدد سے گن کی نال میری طرف کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ صرف ایک لمحے کی مہلت اسے مل گئی ہوتی تو وہ اپنے اوپر آتے سنہرے سرخ سیاہ دھاری والے شیر کو مجھے۔ ہلکی مشین گن کے فائر سے لبو لبہان کر کے رکھ دیتا۔ میں نے دھاڑ مارتے ہوئے کھلا پنجا چلایا اور ٹریگر بریکٹ کی طرف بڑھنے والا اس کا ہاتھ مونڈھے سے اکھڑ کر مشین گن پر جھول گیا۔ اس نے بھیانک چیخ ماری۔ وہ تکلیف اور شاک میں خود بھی گر گیا تھا۔

میں اب اس کی طرف سے بے تعلق ہو گیا کیونکہ نئی میگزین بیلٹ لگی اس ایل ایم جی پر بھر پور توجہ ضروری تھی اس لیے میں نے دوز بردست ضریریں اپنے بھاری خوں

اوٹ میں فائر کی تیاری کرنے، شاٹ گن لوڈ کرنے کے لیے گیا ہے تو وہ مناسب موقع اتار دی۔
سے نکلے گا اور مجھ پر فائر کر دے گا۔

حسکے چنچا۔ ”کیا کرتا ہے رے؟ میں ہوں۔“
فوجی نے حسکے کی بات سنی اور سمجھی مگر وہ مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے چیخ کر
کہا۔ ”ارے تیرے پیچھے ہاتھ ہے رے۔۔۔ شے ہے رے۔“

میں نے اسے گھوم کر دیکھنے کا موقع نہ دیا، اپنا شیر بدن ایسا سادھ لیا جیسے جست
کر کے مورچے پر آگروں گا مگر جھپٹ کر حسکے کو اپنے سر کی ٹکر مارتا میں خود کو بائیں
طرف لڑھکاتا چلا گیا۔

مورچے میں بیٹھے فوجی نے اپنے سامنے شیر کو۔۔۔ مجھے۔۔۔ جست کی
پوزیشن بناتے دیکھا اور اس نے اپنی ایل ایم جی سے فائر کھول دیا۔ وہ سمجھ رہا ہو گا کہ اس
نے شیر کو اس لمبے برسٹ سے کاٹ کے رکھ دیا ہے مگر میرے سر کی زبردست ٹکر کھا کر
ایل ایم جی کے دہانے میں بے بسی سے گھس جانے والے حسکے ہی کے نصیب میں مشین
ن کی سب گولیاں لکھی تھیں۔

ایل ایم جی کے فائر اسے چھیدتے ہوئے مجھ سے دو فٹ دور کیاری کی مٹی
پھرتے چلے گئے۔ یہ مٹی حسکے کے غدار خون سے رنگی ہوئی تھی۔

فائر کرنے کے بعد فوجی کا فوری رد عمل ”ارے رے رے“ کا تھا وہ فائر
زیشن سے اٹھ کر حسکے کی چیتھڑے ہوئی لاش کو دیکھنے چلا ہی تھا کہ میں نے کیاری سے
پانچے کھولے ہوئے جست کی اور اس قاتل فوجی کو حسکے کے قتل پر فوری سزائے
ات دیتا ہوا مورچے میں وارد ہو گیا۔

اس معرکے میں چار دوسرے فوجی بھی زخمی یا ہلاک ہوئے۔ جن میں ایل ایم
اوالے کے پہلو میں دبکا ہوا اس کا مددگار اور تین دوسرے ”جان باز“ شامل تھے۔

کارروائی ختم ہو چکی تو میں نے۔۔۔ شیر نے ’مالتی‘ کی جھاڑیوں کی اوٹ میں
چاکہ اب مجھے آدمی کی جون میں آ جانا چاہیے۔

میں جانور سے آدمی یعنی شیر علی کی کایا میں آ گیا۔
ایک ایل ایم جی کو مکمل برباد کرنے کے بعد مجھے دکھ ہوا تھا کہ اچھی خاصی کام
مشین کو خراب کر کے اپنے استعمال کے لائق بھی نہیں دکھا۔

اب میں نے شیر علی بگٹش نے ’مال غنیمت سمجھ کر چار رائفلوں کو ادھر ادھر
دل پر پھین لیا۔ ٹرائی پوڈ پر لگی ہوئی اس نئی لائٹ مشین گن اور میگزین کی پٹی کو پیٹھ پر

میں نے حسکے کو اس کی عمر کا پہلا اور آخری اپنچا۔ سر پر انز دینے کا فیصلہ کیا۔
میں ’شیر‘ دو قدم بڑھا اور خاموشی سے ایک درخت کے چوڑے تنے کی اوٹ لے کر رک
گیا۔ حسکے اپنی چھینے کی جگہ سے مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ شاٹ گن کو لوڈ کرنے چھپا تھا۔ میں نے نال ٹونے مگر تھوڑے ڈالے جانے اور
کھڑا کی آواز کے ساتھ نال بٹھانے کی آوازیں سنیں پھر میں نے دیکھا کہ وہ جھپٹ کر
اوٹ سے باہر نکلا اور شیر کو سامنے نہ پا کر اس نے غصے میں لکارا۔ ”آ۔۔۔ او سمہا۔ کدھر گیا
ہے سمہا۔۔۔؟ او ز سمہا۔“

اس کی لکار کے جواب میں کہیں سے کوئی شیر ز نکل کر نہ آیا۔ حسکے نے پھر
اٹھائے اور مختلف درختوں کی جھاڑیوں پر مارنا شروع کر دیے۔ اس کا پھینکا ہوا ایک بڑا سا
پتھر اس درخت کے تنے سے بھی آ کر لگا جس کے پیچھے میں چھپا بیٹھا تھا۔ ظاہر ہے میں دم
سادھے کھڑا رہا۔ کچھ دیر پتھر چلانے اور شور کرنے کے بعد اس نے کھسک جانے میں
عافیت سمجھی اور وہ بدوق چھتیائے ہوئے اپنے حمایتی فوجیوں کے مورچے کی طرف چلا۔
مجھے معلوم تھا وہ اب اس دوسرے مورچے میں جا کر ان سے ہدایت لے گا۔ یا اب جبکہ
کھلے چھوٹے ہوئے شیر کے خلاف اس کی دلیری سر دہن چکی ہے شاید وہ شیر سے بچنے کے
لیے مورچے کی پناہ میں جانا چاہتا ہے۔

میں گھات لگائے کٹیلوں کے انداز میں (کیونکہ میں اس وقت خود کٹیل تھا)
جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اس کے پیچھے چلا۔

مجھے معلوم تھا کہ کب اوٹ سے نکلنا اور کب آڑ لے لینا ہے۔
حسکے اپنی پناہ گاہ کے قریب آ گیا تھا۔ یہ اس کے انداز ہی سے ظاہر ہو گیا۔ وہ
اب بے فکری سے چلتا ہوا مالتی کی جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ اگر میں اس وقت حسکے کا
پچھانہ کر رہا ہوتا تو ہر گز مجھے اس چھپے ہوئے مورچے کا پتہ نہ چلتا۔

حسکے نے اپنی شاٹ گن کی دہری نال سے مالتی کی جھاڑی ہٹائی تو میں نے
ایک ایل ایم جی کا دہانہ اپنی طرف سدھا ہوا دیکھا۔

مگر وہ ایل ایم جی تو حسکے کی طرف بھی سیدھی تھی۔ مشین گن پر ہاتھ
جمائے جو فوجی بیٹھا تھا لمبے بھر کو میری اس کی آنکھ سے آنکھ ملی۔ فوجی نے گھبرا کر سیٹھنی

مجھے بیالا کا آدمی یاد تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تو مورنی نے دھیرے سے کہا۔
”وہ کام آگیا۔“

”کیسے؟“ اس معر کے میں یہ پہلا نقصان ہوا تھا۔

مورنی بولی۔ ”یہ دونوں بیالا کو بچانے زنجیریں توڑ کے مورچے سے باہر بھاگے تھے۔ اس وقت مشین گن کا پہلا برست انہوں نے، دشمنوں نے تمہارے پٹھان بھائی پر چلایا۔ بیالا کا آدمی اچھل کر سامنے آگیا۔ ساری گولیاں اس نے اپنی چھاتی پہ لے لیں۔“
”مگر کیوں؟“ مجھے لڑنے والوں کی طرف سے اس قسم کی ”قربانی“ ٹاپ کارروائیاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ حالانکہ یہ کر کے اس نے میرے دوست میر باز کو بچا لیا تھا۔

مورنی نے بتایا۔ ”ویسے بھی وہ زندہ نہیں بچتا۔ ان کتوں نے بیالا کے آدمی کو یہاں پیٹ سے نیچے خنجر کا زخم لگایا تھا۔“
”خنجر کا زخم؟“

مورنی نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔ ”ہاں، اس کی مردانگی ختم کر دی تھی کتوں نے۔“ بولتے تھے تیری محبت کرنے والی عورت نہیں رہے گی تو پھر یہ سب کس کام کی۔“

مورنی رک گئی تھی اور سر جھکائے رو رہی تھی۔

میں اسے کس طرح تسلی دیتا۔ لمحے بھر کو میں اس کے پاس رک گیا۔
مگر ہم کھلے میں تھے۔ مورنی نے خطرے کا احساس کر کے فوراً خود کو سنبھالا اور قدم بڑھا کر جھاڑیوں میں چھپے کسی چور دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ میں اس طرف سے پہلے بھی گزرا تھا۔ ایسی چابکدستی اور مہارت سے یہ دروازہ بنایا گیا تھا اور اس کے آگے جھاڑیاں لگا دی گئی تھیں کہ خاص طور پر سمجھائے بغیر رستہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

مورنی نے دروازے کے قریب جا کر کہا۔ ”میں مورنی، رشنا کھولو۔“
رشنا اس لڑکی کا نام تھا جو دوسری طرف کھڑی پکارے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ وہی مورنی کی ہونے والی بھابی تھی۔

دہار کی محفوظ چہار دیواری میں آتے ہی ایک احساس تحفظ، زخمی میر باز کی طرف سے تشویش ایک آدمی کے نقصان کے صدمے اور لڑکی بیالا بائے کے بچالیے

سنبھالا اور مالیتی کے سنج سے نکل کر لان کی طرف چلا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ حسیکے کو ہلاک کرنے والے اس فیصلہ کن برست کے بعد کپاؤنڈ میں ہتھیاروں کی آوازیں بند ہو گئی تھیں۔

اندر اگر قبضہ کرنے والے فوجیوں کے یہ دو ہی مورچے تھے تو دونوں کی نفری یا تو بھاگ چکی تھی یا زخمی اور ہلاک ہو گئی تھی۔ اب جو بھی کمک آئی تھی کالج کے باہر سے آئی تھی۔

میں فولاد اور گولہ بارود میں لدا پسند اس گیلری تک جانا چاہتا تھا جس پر سے میں نے شیر کی جون میں چھلانگ لگائی تھی۔
میں نے مشکل سے سر اٹھا کر گیلری کی طرف دیکھا۔ وہاں صرف کوسوی کھڑی تھی۔

مورنی کیا کر رہی ہے؟ وہ کہاں گئی؟ میں نے سوچا اور میرے برابر سے مادہ طاؤس کی کرررر سنائی دی۔ مشکل سے سر گھما کر دیکھا مورنی، طاؤس کی مادہ میرے ساتھ چلی آرہی تھی۔

میں نے اس خوبصورت پرندے سے کہا۔ ”مورنی! اچھا ہوا تو آگئی۔ آذرا ہاتھ بنالے۔ بھاری ہیں یہ ہتھیار۔“
مادہ پرندے نے میری بات بھی نہ سنی اور وہ پر پھپھناتی ایک طرف دوڑ گئی۔
میں نے پکارا۔ ”مورنی!“

دوسری سمت سے کلک کلک کر ہنستی ہوئی وہ لڑکی مورنی میری طرف بڑھی اور بولی۔ ”جنگل کی چڑیوں سے باتیں کرتے ہو سردار۔ اپنی عاشق مورنی کو بھی نہیں پہچانتے۔“
میں نے جس سے ابھی مدد مانگی تھی وہ لڑکی مورنی نہیں تھی وہ اصل مورنی تھی۔

میں کھسیا گیا مگر خفیف اور شرمندہ ہونے کی ایک اور بھی وجہ تھی۔ میں پریشان تھا کہ یہ مورنی آخر اس طرح برملا اظہار عشق کیوں کرتی پھرتی ہے۔
مورنی بڑھ کر آئی اور اس نے میرے کانہوں کا بوجھ ہلکا کیا اور بتایا کہ اس نے میر باز اور بیالا دونوں کو اندر وہاں دہار میں پہنچا دیا ہے۔ دونوں ہوش میں ہیں۔ کوسوی نے مرہم پٹی شروع کر دی ہے۔

باقی سارا دن کچھ نہیں ہوا۔ یعنی ہمارے دشمنوں کی طرف سے کچھ نہیں ہوا۔ ہم البتہ اپنے گرنے والوں کے قلعے کو مضبوط کرتے رہے۔

زخمی میر باز کے اور میرے علاوہ دو مرد کو سومی کے اسٹاف میں اور تھے۔ ہم نے ہلکی ڈیوٹی پر قبیلے کی لڑکیوں کو لگا دیا اور ہم تین مردوں نے ششوں میں دو دو گھنٹے ڈیوٹی دینے، آرام کرنے چوبیس گھنٹے گیلری پر پہرہ دینے کا طے کیا۔

کو سومی نے ہاسٹل میں ٹھہری ہوئی لڑکیوں کا حوصلہ مضبوط رکھنے کے لیے ان سے صاف صاف بات کی تھی اور کہہ دیا تھا کہ اگر کمزوری دکھاؤ گی تو جو لوگ کالج کو گھرے ہوئے ہیں تمہیں ہر قسم کی ذہنی اور جسمانی زیادتی کا نشانہ بنائیں گے۔ جم کے مقابلہ کرو گی تو اپنی جان اور آبرو بچا سکو گی۔ ہم بے شک گھرے ہوئے ہیں لیکن کمزور ہرگز نہیں ہیں۔

لڑکیوں میں سے زیادہ باہمت کو ہتھیاروں کے استعمال کی فوری تربیت دے کر انہیں مسلح نگرانی کا کام دیا گیا۔ جو لڑکیاں لڑکا ٹائپ نہیں تھیں انہیں سب کے لیے کھانا تیار کرنا، زخمیوں کی دیکھ بھال کرنا اور مراقبہ کے کمرے میں اپنے اپنے حساب سے دعا کرنا سونپا گیا۔

ہم سب نے ایک لمبے محاصرے کے لیے خود کو تیار کر لیا اور انتظار میں بیٹھ گئے۔

راج دھانیاں اور بڑے شہر خبریں لینے والوں اور آگے پہنچانے والوں کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ ماننگ یان قصبے کی حیثیت ایسی تھی جیسی سر سید احمد خاں کی زندگی میں علی گڑھ کی ہو گی۔ وہ تعلیم پھیلانے کی ایک نئی نویلی تحریک کا مرکز تھا۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ یہاں یہ تعلیمی تحریک ایک قبائلی سیانے نے شروع کی تھی۔ جنوبی ایشیا کے ملکوں میں قبائلی ویسے بھی خبروں میں کم سے کم ہوتے ہیں۔ اگر بری آرمی بھاری توپ خانہ لگا کر ماننگ یان کالج کو اور وہار کی قدیم عمارت کو اڑا بھی دے گی تو باہر کی دنیا کو خبر نہیں ہو گی۔ کسی کو پتا بھی نہ چلے گا اور بڑے میاں کی مفید اور مصروف زندگی کا محصل، یہ کالج صفحہ ہستی سے اس طرح غائب ہو جائے گا جس طرح ایک غلط لفظ یا جملہ کسی تحریر کے متن سے نکال دیا جاتا ہے اور نکالنے والے کے سوا اس بات کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ چار دن گزر گئے اور انہوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ لگتا تھا فوج کی حکمت عملی یا کمان بدل گئی ہے۔ کسی بہت ہی ہشیار بلکہ عیار کمانڈر کو ماننگ یان کالج کمپلکس کی ذمہ داری

جانے کی طمانیت۔۔۔ ان ایک دوسرے سے متصادم کیفیتوں کی پورش نے جیسے مجھے تھکا کے رکھ دیا تھا۔

ہم تیزی سے اس حصے میں پہنچے جسے پہلے اسٹور کے طور پر اور اس وقت فیلڈ اسپتال کی طرح استعمال کیا جا رہا تھا۔

بیالا کو سر سے پیروں تک چادر میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ اس کی ایک بانہہ چادر سے باہر تھی جس پر وہار کی ایک بڑی عمر کی عورت اپنی باندھ چکی تھی۔ وہ عورت اب میر باز کی طرف آگئی تھی اور کو سومی کا ہاتھ بنانے لگی تھی۔ میر باز کو شیت بچھا کر ایک میز پر لٹا دیا گیا تھا۔ اس کے بدن پر بس ایک تولیہ پڑا تھا۔ کو سومی اور وہار کا ایک مرد ملازم اور اب یہ بڑی عمر کی عورت اس کے خونم خون بدن کو صاف کر کے زخموں کو بساط بھرنا سکے دے کر پٹیاں کر رہے تھے۔ میر باز کے دائیں بازو اور پہلو پر خاصے گہرے زخم آئے تھے۔ اس کے علاوہ لگتا تھا اس کی ران کا پرانا زخم پھر کھل گیا ہے۔ میر باز کے سر پر بھی پٹی بندھی تھی۔

پھر بھی مجھے آتا دیکھ کر اس نے دروازے کی طرف سر گھمایا اور دھیرے سے بولا۔ ”شکر الحمد۔۔۔ بار اتم ٹھیک ہے۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی چھولی۔ ”میر باز! بڑا کام کیا دوستا تو نے“ بے تصور لڑکی کو مرنے نہیں دیا۔

وہ کمزوری سے مسکرایا بولا کچھ نہیں۔

کو سومی نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس سے باتیں نہ کروں میر باز کو آرام کی ضرورت تھی۔ میں میر باز کا اور بیالا کا سر تھپکاتا فیلڈ اسپتال سے نکل آیا۔

کو سومی میرے پیچھے چلی آئی باقی کام وہ کسی دوسرے کے ذمے کر آئی تھی۔ کہنے لگی۔ ”ان کے کئی آدمی مر گئے ہیں۔۔۔ وہ اب پوری طاقت سے کالج پر حملہ کریں گے۔“

میں نے اسے تسلی دینے کو کہا۔ ”ہمارے پاس ایک ہلکی مشین گن اور اس کا میگزین ہے۔ رائفلیں ہیں۔ راشن ہے ہم پوری طاقت سے اپنا بچاؤ کریں گے۔“

وہ کچھ کہنے والی تھی کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ”اب یہ مت کہنا کہ ہم کب تک بچاؤ کریں گے۔ کو سومی! جب تک دم ہے ہم ڈٹے رہیں گے۔“ وہ چپ ہو گئی۔

سوچی گئی تھی۔ وہ سکون سے گھبرا ڈالے بیٹھا تھا۔

ان چار دنوں میں زیادہ تر رات کے وقت کوئی بیس مرتبہ مورنی، مادہ طاؤس کی کایا میں باہر گئی اور حالات کا جائزہ لے آئی۔ وہ جو کچھ دیکھتی کو سومی کو اور مجھے آکر بتاتی۔ ظاہر ہے اس کے کایا بدلنے کا راز وہاں میں اس وقت ہم ہی دو آدمیوں کو معلوم تھا۔ فوج والوں نے کمپاؤنڈ کے صدر دروازے پر دو ٹینک لاکھڑے کیے۔ بہت سی بکتر بند گاڑیاں پہلے ہی موجود تھیں۔ بری فوج کی بھاری نفری کمپاؤنڈ کو گھیرے کھڑی تھی اور کمانڈر وائرس پر رنگون سے ہدایات لے رہا تھا۔

مورنی نے دیکھا تھا کہ مائنگ یان کی مقامی آبادی جو فوج کے خوف سے پہلے ہی دور دور رہتی تھی اب بالکل بھی ادھر کارخ نہیں کر رہی۔ مورنی نے کالج سے دور بڑے میاں کے ششو کے گمنے کے کھیت اور چھپرے پر وہار والوں کی پوری پٹا جاسانی تھی۔ ششونے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح دارالحکومت رنگون کے باسیوں تک محاصرے کی خبر پہنچا دے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ غیر ملکی اخبار نویسوں، نامہ نگاروں کو مائنگ یان کی طرف متوجہ کر سکے۔

محاصرے کے تیسرے دن مورنی نے دیکھا کہ جینز اور جرسی پہنے ایک گوری میم کیمرا لٹکائے ایک پرانی فوکس ویکن میں صدر دروازے پر کھڑی فوج کے نوجوان افسر سے جھک جھک کر رہی ہے۔

اس نے اگلے دن بھی اس میم کو گیٹ پر جھگڑا کرتے دیکھا۔ مورنی پرندے کی کایا میں لڑکی مورنی اسی رات سبوں، تناور درختوں میں چھپتی چھپاتی آئی اور مجھے گیلری میں آکر بتانے لگی کہ گیٹ پر آج پھر وہی ہو رہا ہے۔

دن کے وقت پرندے مورنی کا کلن بھی خندوش تھا۔ عام بری اور بودہ مذہب کے پیروکار تو طاؤس کو متبرک اور مقدس پرندہ مانتے تھے۔ ان کے سامنے تو آنے جانے میں کوئی حرج نہیں تھا مگر دوسری قوموں، مذہبوں کے لوگ بھی سرکاری نفری میں شامل تھے۔ اگر کسی نے مور کا گوشت کھانے کے ارادے سے لڑکی مورنی کو مار گرایا تو یہاں تو سب کھیل ہی ختم ہو جائے گا۔ لڑکی مورنی، کو سومی کے اور میرے بعد ہماری طرف کی جیسے نائب کمانڈر تھی۔

کو سومی نے تو اسے پابند کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ دن کے وقت مور کی کایا میں کمپاؤنڈ میں بھی دکھائی نہ دے مگر بعض اوقات وہ بہت قیمتی خبریں لے آتی تھی اس

لیے میں دن کو نکلنے کی یہ پابندی کبھی نرم بھی کر دیا کرتا تھا۔

اس گوری میم کے یہاں آنے سے رنگون میں بیٹھے ہمارے بارے میں فیصلہ کرنے والوں پر دباؤ ڈالنے کا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔

میں نے کاغذ لے کر غیر ملکی نامہ نگار کے لیے انگریزی زبان میں پوری تفصیل لکھ دی کہ کالج کے ہاسٹل میں کل کتنی لڑکیاں ہیں۔ لڑکی بیالا جوزخمی ہے اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا ہے۔ اس کے شوہر کو کس طرح مورچے والوں نے مار گرایا ہے۔ اس رقتے میں، میں نے غیر ملکی نامہ نگار سے درخواست کی تھی کہ وہ دنیا کو ہماری پٹا سنا کر بری حکام کو اس پر آمادہ کرے کہ ہمیں یعنی تمام لڑکیوں اور کالج کے بانی کی پوتی کو نکل جانے دیا جائے، ہم لوگ کالج پر قابض رہنے پر ہر گز اصرار نہیں کریں گے۔

اس رقتے کو پہنچانے کے سلسلے میں میرا مورنی سے یہ طے ہوا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی خطرہ نہ لے گی۔ پرندے کی کایا میں کالج کمپلیکس کے اس حصے سے جہاں کبھی لڑکوں کا ہاسٹل تھا تناور درختوں میں ہوتی کچھ دور نکل جائے گی پھر انسان کی جون میں آکر کسی طرح کیمرے والی اس میم تک پہنچے گی اور میرا خط حوالے کر کے واپس مادہ طاؤس بن کر کمپاؤنڈ میں آجائے گی۔

ابھی مورنی روانہ بھی نہ ہوئی تھی کہ کو سومی آگئی۔ مجبوراً اسے ساری بات بتانی پڑی۔ کو سومی نے بہت سختی سے اس تجویز کی مخالفت کی اور مجھے مجبوراً کو سومی کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

مگر کو سومی کے جاتے ہی مورنی میرے برابر آ بیٹھی بولی۔ ”سردار! کو سومی نے مجھے دن کے وقت مورنی کی کایا میں وہار کے کمپاؤنڈ سے نکلنے اور گوری میم تک جانے کو منع کیا ہے نا؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔“

تو بولی۔ ”سردار تم پر تو کوئی پابندی لگاؤ کو سومی نے نہیں لگائی ہے؟“

”اوں ہنک۔“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔

وہ جوش میں اٹھ کھڑی ہوئی بولی۔ ”تو آؤ میں تمہیں ایک جگہ دکھاتی ہوں۔“

ہنس کر کہنے لگی۔ ”اگوانے مورنی کے کچھ بک بک کرنے اور کچھ کام کی چیزیں دکھانے پر تو پابندی نہیں لگائی ہے؟“

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”نہیں۔ کو سومی نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی۔“

نے سیڑھی لگا کر یا چان بنا کر چوکی سی بنائی تھی ایک ایک ہیوی مشین گن پوسٹ تھی اور دور بینیں لگی تھیں۔ رات میں وہ یہاں طاقت ور سرج لائٹس لگا دیتے ہوں گے۔

ہمیں چہار دیواری کے ساتھ ساتھ جہازیوں میں چلتے پھرتے فوراً ہی دیکھ لیا گیا۔ گارڈز ایک دوسرے کو اشارے سے یا شش کی آواز نکال کر بتا رہے تھے کہ دیکھو وہ شیر جا رہا ہے۔ جنگل میں شیر کے ساتھ دوسرے پرندوں، خاص طور پر طاؤس کو دیکھا جاتا ہے تو ان کے لیے منظر کوئی انوکھا نہیں تھا۔

مگر کافی دور تک چہار دیواری کے ساتھ چلنے کے بعد محاصرے کے انتظامات دیکھ کر میں بڑی سوچ میں پڑ گیا۔ اپنی کتنی کی رانٹوں ایک ایل ایم جی اور مختصر میگزین کے ساتھ ان کا مقابلہ تو خیر کیا کرتے ہمارے توخ کر نکل بھاگنے کے لیے بھی حالات سازگار نہیں تھے۔

مگر خیر مجھے یاد تھا کہ مورنی مجھے یہاں کسی کام سے لائی تھی۔ وہ درختوں، جہازیوں کے ایک بھاری کچ کے نیچے پہنچ کر رک گئی۔ طاؤس سے انسان بن کر وہ مجھے کچھ دکھانا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ لڑکی ہو گئی۔ میں شیر کی کایا چھوڑ انسان کے قالب میں آیا تو لڑکی مورنی نے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور آہستگی سے سنبھل سنبھل کر آم کے ایک گھنے پیڑ پر چڑھنے لگی۔ اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔

درخت کی خاصی اونچی شاخ پر گھنے پتوں میں چھپے ہم دونوں چہار دیواری پر بنی ان کی چوکی میں دیکھ رہے تھے۔ یہ مشین گن پوسٹ تھی۔ تین فوجی جو پہلے آرام سے بیٹھے تھے اب نظروں ہی نظروں میں ہمارے درخت سے مخالف سمت میں شیر کو تلاش کر رہے تھے۔ ان کا دھیان ہمارے درخت کی طرف نہیں تھا۔ مورنی نے میرے کان سے منہ لگا کر کہا۔

”سردار! اس چوکی اور اگلی چوکی کے بیچ دیکھو دیوار پہ کیا ہے؟“

میں نے دیکھا باہر اگا ہوا کھجور کا ایک پیڑ نظر آ رہا تھا۔

میں نے فوراً مورنی کو بتایا کہ میں نے کیا دیکھا۔

کہنے لگی۔ ”اگر کوئی دیوار پر پہنچ جائے تو اس کھجور کے پیڑ سے اتر کر باہر جاسکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں اگر دیوار پر پہنچ جائے اور کوئی اسے دیکھ نہ رہا ہو تو یہ کھجور کا پیڑ آسانی سے اسے باہر پہنچا دے گا مگر سوال یہ ہے۔“

وہ مجھے لیے ہوئے وہار کے چور دروازے تک لٹی کہنے لگی کہ کھلے کمپاؤنڈ میں نکلنا ہو گا۔ یہ مسئلہ تھا کیونکہ ہم دونوں شیر اور مورنی بن کے ہی نکل سکتے تھے۔ مورچوں کی تباہی کے بعد فوج والوں نے کمپاؤنڈ کی دہری دیوار پر باہر سے بانس کی سیڑھیاں وغیرہ لگا کر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوکیاں سی بنادی تھیں۔ رات میں سرج لائٹس لیے، ان میں دور بینیں لگائے بھاری ہتھیاروں کے ساتھ محاصرہ کرنے والے اندر وہار کے کمپاؤنڈ کے چپے چپے پر نظر رکھتے تھے۔ مورچوں پر میں نے شیر بن کر جو حملہ کیا تھا اس سے فوج والے یہ سمجھ سکتے تھے کہ مور مورنیوں کی طرح وہار میں شیر بھی پلا ہوا ہو گا۔ وہار والے شیر کو باندھ کے رکھتے ہوں گے یا تو وہ اتفاقاً کھل گیا یا کھول دیا گیا اور اس نے اندر مورچوں میں تباہی مچا دی۔

ان کا یہ سمجھنا ہمارے لیے فائدہ مند ہو سکتا تھا۔ مورنی نے باہر کے چکر لگا کر بہت سی کام کی خبریں اٹھائی تھیں ان میں ایک قیمتی خبر یہ بھی تھی کہ کچھ لوگ ایسا ہی سمجھ رہے ہیں۔

پھر بھی اس وقت مورنی مجھے کمپاؤنڈ میں لا کر اپنے اور میرے لیے اضافی خطرہ مول لے رہی تھی۔ میں نے سوچا مورچوں میں مرنے والوں کا کوئی جذباتی ساتھی اگر مجھے، شیر کو کمپاؤنڈ میں دیکھ کر بھاری فائر آرام سے کھول دے تو وہ تو اپنے حساب سے کسی مرے ہوئے ساتھی کا انتقام لے رہا ہو گا۔ میں بلا ضرورت کام آ جاؤں گا۔

میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار مورنی سے کیا تو وہ بولی۔ ”میں نے جو ادھر ادھر سے فوجیوں کی باتیں سنی ہیں تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ کچھ لوگ وہار میں کھلے چھوڑے ہوئے شیر کو کسی پرانے غصے میں بھرے بھکشو کی بھکتی ہوئی آتما (روح) سمجھتے ہیں۔“

یہ تو ہم پرستی والی لائن مجھے اچھی لگی۔ ان فوجیوں کے تو ہمت ایک طرح سے میری بیمہ پالیسی تھی۔ وہ بھکشو کے بھوت، پرہر گز گولی نہیں چلائیں گے۔

چور دروازے سے نکلتے ہی میں نے جہازیوں میں خود کو شیر میں تبدیل کیا۔ لڑکی مورنی مادہ طاؤس بن گئی اور ہم درختوں کی اوٹ لیے چہار دیواری کی طرف بڑھ گئے۔

آج محاصرے کے چوتھے دن میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ ان کا گھیرا کتنا سخت ہے۔ وہ کتنے انتظامات کر کے بیٹھے ہیں۔ ہر دس فٹ کے فاصلے سے ان کا ایک فوجی آٹومیک رائفل یا ہلکی مشین گن کے ساتھ دیوار پر جما بیٹھا تھا اور وہاں جہاں انہوں

طرح سے یہ کوشش کریں گے کہ کوئی مقامی آدمی اس غیر ملکی عورت کے قریب تک نہ جاسکے مگر یہ کام بہت ضروری تھا۔ ہم لوگ بودھ دہار والے زندہ بچپن نہ بچیں، کم سے کم یہ اطمینان تو آخر وقت تک رہے گا کہ ہمارے تباہ کر دیے جانے، ایک لڑکی کے ذریعے، ہم تینوں مردوں کو مار دیے جانے کی خبر باہر کی دنیا تک پہنچ گئی ہے۔

میں نے مورنی سے کہا کہ تو وہ رقتہ سنیاں کر اسے سانپ کو سب کچھ سمجھا کر لے آ۔ میں آم کے درخت پر بیٹھا انتظار کرتا ہوں۔

لڑکی مورنی نے پھر سے طاؤس کی مادہ کا قالب اختیار کیا اور سانپ کو وہ جو کوئی بھی تھا۔ لانے کے لیے وہاں کے چور دروازے کی طرف پھپھٹاتی چلی گئی۔

میں پھر سے آم کے درخت پر چڑھ گیا۔ فوجی لوگ مورنی کو جاتے دیکھتے رہے۔ ان میں سے کسی کو یہ خیال آیا ہو گا کہ مورنی اس کبج سے نکلی ہے تو شیر کو بھی ادھر ہی تلاش کرنا چاہیے۔ انہوں نے دور بین والے سے پکار کر کہا۔ ”ارے ادھر کہاں دیکھ رہا ہے رے۔ باگھ اور مورنی جھاڑی میں گئے تھے۔ مورنی ابھی نکل کے بھاگی ہے باگھ کو ادھر ہی آم کے نیچے جھاڑیوں میں دیکھ۔“

میں پتوں کے نیچے بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ لوگ اپنی دور بین ادھر گھما رہے ہوں گے۔ میں دم سادھے بیٹھا ہوں گا تو کپڑوں کا رنگ بھی ایسا ہے دور بین والے کو بھی دھوکا ہو جائے گا۔

مگر ٹھیک اسی وقت اوپر کی شاخ سے ایک بھورا لنگور کود کر میری شاخ پر آیا اور مجھے دیکھ کر ڈر کر چیخا ہوا بھاگا۔ پتوں کی جواوٹ میرے اور فوجیوں کے نیچے کھڑی تھی لمحے بھر کے لیے ہٹی۔ ٹھیک اسی لمحے دور بین والے نے لنگور کی پکار سن کر اپنی دور بین آم کی اسی شاخ کی طرف گھمائی۔ میں نے دور بین کے شیشے اپنی آنکھوں میں چمکتے دیکھے۔ دور بین والے نے شاید میری آنکھوں میں دیکھا ہو گا اس نے چیخ کر کہا۔ ”اندر آم کے درخت پہ کوئی بیٹھا ہے۔ ادھر سب سے اونچی شاخ پر۔ لا اپنی رائفل دے مجھے۔ رائفل دے۔“

میں نے سکاری لی۔ ”لوجی مارے گئے شیر علی۔“

میں نے ایک بار آیت کریمہ پڑھی اور آم کی شاخوں سے خود کو بجاتا ہوا سیدھا زمین پر کودا اور جھاڑی میں ریگتا گیا دیوار سے فائر ہوا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ جب اطمینان ہو گیا کہ گولی مجھے نہیں لگی ہے اسی وقت اوپر سے کچھ گرا آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر بھورے لنگور کی لاش پڑی تھی۔

مورنی نے میرے کندھے پر تھپی دی۔ ”بس سردار! یہی دکھانا تھا آ جاؤ نیچے۔“

یہ کیا پاگل پن تھا؟ میں نے کہا۔ ”تم یہاں صرف کھجور کا پیڑ دکھانے لائی تھیں؟ مورنی! تمہیں کیا ہو گیا؟“

وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”نہیں میں یہ بھی دکھانے لائی ہوں کہ دونوں چوکیوں کے نیچے باہر تو یہ کھجور ہے اور اندر کی طرف دہری دیوار میں پتھر کا یہ پرانا بنا ہے۔“

میں نے دیکھا وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پرانا دہری دیوار پر اکٹھا ہو جانے والے بارش کے پانی کو اندر کی طرف گٹر میں گرانے کے لیے بنایا گیا تھا۔

مورنی بولی۔ ”اگر میں مورنی چڑیا بن کر کسی ہلکے جان دار کو اپنے بچوں میں لے کر ادھر سے اڑوں اور اس جان دار کو اوپر پرتالے میں چھوڑ دوں تو وہ اوپر والوں کو نظر نہیں آئے گا اور ڈھکی ہوئی نالی میں ریگتا ہوا کھجور کے پیڑ تک پہنچ جائے گا پھر بیڑ کے تنے پر سے باہر اتر کر وہ آگے جھاڑیوں میں انسان کی کایا لے کر سیدھا گوری میم تک جا سکے گا۔“

اس کا دماغ بہت مشکل حالات میں بھی بہت ٹھنڈے ٹھنڈے کام کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ہاں کوئی بھی جان دار اس طرح باہر جا سکتا ہے اور اسی طرح واپس آ سکتا ہے مگر وہ ہے کہاں؟ کہاں ہے وہ جان دار؟“

مورنی مسکرائی۔ ”نیچے آؤ سب کچھ بتا دوں گی۔“

نیچے جھاڑی کی اوٹ میں اس نے بتایا کہ اندر دہار میں کوئی ایسا ہے جو کایا بدل کر انسان سے سانپ اور سانپ سے پھر انسان بن سکتا ہے۔ مورنی کہنے لگی۔ ”میں بتاؤں گی تمہیں کہ وہ کون ہے۔ ہاں اگر میری یہ بات تمہیں ٹھیک لگتی ہے تو سردار! تم ادھر ہی انتظار کرنا، میں اسے سانپ کو مورنی بن کر بچوں میں اٹھائے لائی ہوں اور اڑ کر پرتالے کے منہ میں چھوڑ دیتی ہوں۔ وہ کھجور کے رستے باہر اتر جائے گا۔ یہ فوجی لوگ اصلی مور مورنیوں کو اڑتے، اترتے، دوڑتے دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ شک بھی نہیں کریں گے۔ بولولے آؤں؟“

میں دو منٹ خاموش بیٹھا اس منصوبے کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔ اگر احتیاط سے عمل کیا جائے تو سانپ کی کایا میں باہر جانے والے کے لیے کوئی خاص خطرہ نہیں ہے۔ سوا اس کے کہ باہر اسے بہت احتیاط سے غیر ملکی نامہ نگار تک جانا ہو گا۔ وہ لوگ ہر

جواب میں پہلے فوجی نے ذرا تیور بدل کر کہا ہو گا کیونکہ اس کا لہجہ ٹیکھا تھا۔
 بولا۔ ”اس میں کھوب، نا کھوب کہاں ہے رے جبر۔ کہاں؟“

جبر بولا۔ ”ارے یہ سب پنڈتوں کا اپنا بنایا اصول ہے۔ مال کاٹنے کا رستہ نکال لیا۔ بارہ پنڈے کھلاؤ۔ بیس کھلاؤ۔ مٹھائی لاؤ۔ دودھ لاؤ۔ بس مفت خوری چل رہی ہے۔“
 ہندو فوجی برا مان رہا تھا، چیخ کر پوچھنے لگا۔ ”ممھت کھوری تمہارے ملا لوگ نہیں کرتے؟“

جبر جو مسلمان ہو گا بولا۔ ”کیوں نہیں کرتے۔ خوب کاٹتے ہیں کہتے ہیں کالا مرغالاؤ سفید بکرا لاؤ حلوہ لاؤ۔“
 ”تو پھر؟“

جبر ہنسنے لگا۔ ”اوبے“ یہ تو پھر کیا ہوتا ہے میں کوئی اجنٹ ہوں ملا لوگ کا جو مجھ سے پوچھتا ہے، تو پھر؟ میں نے تو ایک بات کہی تھی۔ یہ پنڈے ملے سبھی ہشیار ہیں۔“

ہندو فوجی چڑ گیا تھا۔ ”ہشیار تم ہو۔ ہمارے بامن پنڈتوں کو برا کہہ کر اپنا جی ٹھنڈا کر لیا۔ سچ میں ایک بات اپنے مومسلمان ملا کو بھی بول دی۔ لو بھی بات بھی کہہ دی بات بگڑی بھی نہیں۔“

قریب کی چوکی سے کوئی سن رہا تھا۔ وہ پکار کر بولا۔ ”چپ کرورے، یہ تم لوگ نے پھر ہندو مسلم دنگا شروع کر دیا۔“

دونوں فوجیوں کی جھک جھک سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ادھر چوکی پہ ایک بری مسلمان بھی ڈیوٹی دے رہا ہے۔ اس بات سے ایک بے نام اطمینان سا ہوا کہ اپنا مذہب یہاں قریب ہی ہے اور ایک فکر بھی ہو گئی کہ مورنی خطرے میں ہے مسلمان بھائی کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ پکانے کھانے کے لیے مورنی کو مار لے گا۔ رعایت نہیں کرے گا۔

اندر کہیں مورنی نے فائر کی آواز سن لی ہو گی تو وہ میری طرف سے فکر مند ہو کر اڑتی ہوئی آئی اور کچ کے اور آم کے آس پاس کر لانے لگی۔ میں نے کچ کی عافیت سے اسے اپنی شیر کی آواز سنا دی۔ یعنی شیر جب آسائش سے کنبوں میں ٹھہرا گو بھٹتا ہے۔ میری آواز سن کر مورنی پر پھینٹائی چلی گئی شاید اس نے رضا کار کو لینے جو سانپ کی کایا میں کپاؤنڈ سے باہر نکل سکتا تھا۔

بیس پچیس منٹ بعد میں نے جھاڑی میں چھپے چھپے لڑکی مورنی کے آنے کی آوازیں سنیں اور کچھ ہی دیر میں وہ پتوں شاخوں میں رستہ بناتی مسکراتی میرے برابر آ

یا تو گولی چلانے والے کو مغالطہ ہوا ہو گا اس نے واقعی لنگور کو نشانہ بنایا تھا۔

ایک فوجی کی چڑچڑاتی آواز آئی۔ ”تو نے کس پر فائر کیا ہے؟“

”وہ جو اوپر درخت پہ چڑھا بیٹھا تھا۔ اسے گر لیا ہے۔“

”ارے تو نے لنگور کی ہتیا کی ہے رے بدھو۔ آدمی کدھر بھی نہیں، لنگور مرا

پڑا ہے، وہ دیکھ۔“

”بکواس کرتا ہے۔“

”ایک دم اندھا ہے سورا۔ ارے نہیں دکھتا تو اپنی دور بین سے دیکھ، کمینڈل

کی طرح بلاوجہ گلے میں لٹکار رکھی ہے۔ وہ جھاڑی کے پاس کیا پڑا ہے جرا دیکھ۔“

”ارے ہاں رہے ہاں۔ لنگور کی ہتیا ہو گئی۔ چی۔ چی۔ چی۔“

اس نے ساتھی کی اس آواز کی نقل اتاری۔ ”آؤ بھی اب چی چی کرنے سے کچھ

نا ہوئے۔ بارہ پنڈتوں کو بھوگ دینا پڑے گا سورے۔“

میں نے سوچا یہ لوگ بودھ نہیں ہندو ہوں گے اسی لیے لنگور بندر کے مارنے

پر کفارہ دینے کی بات کر رہے ہیں۔ لنگور کی ہتیا کی ہے تو اب اسے بارہ پنڈتوں کو کھانا کھلانا

پڑے گا۔ حلوہ پوری اور دودھ کا جرمانہ بھرے گا پنڈتوں کے تو مزے آگئے۔

”پروہ آدمی کدھر گیا؟“ یہ فوجی آواز ہی سے بہت پریشان لگتا تھا۔ خود ہی ایک

لمحے بعد کہنے لگا۔ ”تیری قسم آدمی تھا ہے۔ میری اس کی آنکھ ملی تھی۔“

اس کا ساتھی ہنسا۔ ”اور بنے دے رے رہنے دے۔ میری قسم کیوں کھاتا ہے۔

سامنے پڑا لنگور نہیں دکھتا تھے۔ آدمی کیسے دیکھ لیا تو نے۔؟ آنکھ ملی تھی۔ سالا۔“

”تیری قسم۔“

”دھت۔ بدھو سالا۔ پھر سے میری قسم۔ اور بنے دے، نیچے ٹینٹ میں جا

کے سو جا تھوڑی دیر کو۔ دماغ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ جا۔“

اتنی دور سے کچھ اور سنائی نہ دیا۔ اسی بدھو کے بڑبڑانے کی آواز آئی اور بند ہو

گئی۔ جو چیخ چیخ کر اس کا مذاق اڑا رہا تھا اس نے پکار کر کسی اور سے کہا۔ ”اورے، سنا تو نے؟“

دیکھا سورے کو؟ کیسا دیدہ پٹم ہے اس سالے کا۔ ہاں جبر؟ سالا بولتا ہے مگالتا ہو گیا۔“

تیسرے کے ہنسنے کی آواز آئی اس نے بس ایک لفظ دہرایا ”مغالطہ۔“

”پھر کچھ دیر خاموشی رہی۔ ”مغالطہ“ کہنے والے جبر نامی فوجی نے دوسری

چوکی سے کہا۔ ”تم لوگ کا بھی خوب ہے بندر مار دیا تو بارہ پنڈتوں کو مال کھلاؤ تب جان

چھوٹے گی۔“

بیٹی۔ بولی۔

315

”جانے والا تمہارا رقعہ لے کے چلا گیا۔ میں پورے گھنٹے بھر بعد کھجور کے پار دہری دیوار پہ جا بیٹھوں گی اور اسے بچوں میں بھر کے اتار لاؤں گی۔“

میں نے خوش ہو کر اس کا سر تھپک دیا تو وہ کچھ شوخی، شرارت کچھ سنجیدگی سے بولی۔ ”تم اپنی مورنی پہ حکم چلاتے رہو سردار اور دیکھتے جاؤ وہ کیسے کیسے کام کرے گی۔“

پھر وہ مجھ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور سرگو شیوں میں باتیں کرتی ہوئی ان اچھے دنوں کے لیے منصوبے بنانے لگی جب وہ میرے بچوں کو جنگلی پودوں، پرندوں کے نام سکھائے گی۔ انہیں سارا سارا دن سرحد کے گھنے جنگلوں میں لیے لیے پھرے گی۔

میں نے کہا۔ ”پاگل ہے تو۔ صوبہ سرحد میں ایسے ایسے گھنے جنگل تو نہیں ہوں گے جیسے یہاں برامیں ہیں اور پھر وہاں تو کس طرح جائے گی؟“

بولی۔ ”ادھر تو لے کے جائے گا۔ مجھے اپنے بچوں کی ماں بنانے کو لے جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”شاباش ہے تجھے۔ ایسے مصیبت والے دنوں میں اتنی سخت پریشانی میں بھی تو اپنے پاگل پن کے لیے وقت اور موقع نکال لیتی ہے۔“

ایسی ہی ہلکی پھلکی دیوانی باتوں میں، مورنی نے وہ ایک گھنٹا گزار دیا۔

میں نے کوسوی کے بعد اگر کسی میں اتنی دل آویزی پائی تھی، کسی کے پاس بیٹھنے میں، کسی کی باتوں میں جی لگتا تھا میرا تو وہ یہی باؤلی مورنی تھی۔

گھنٹے بھر بعد وہ کایا بدل کر کچ میں مورنی بنی اور پھپھٹاتی احاطے کی دہری دیوار کی طرف پرواز کر گئی۔ وہ جس خوبصورتی اور جتنی شان سے درختوں سے بلند ہو رہی تھی اسے دیکھ کر میرا دل ایک بار بے تابانہ دھڑکا تھا۔ خوبصورت چیزیں نہ معلوم کیوں اتنی عارضی ہوتی ہیں۔ میں نے سوچا، پھر اس بدشگون پر میں نے خود کو ملامت بھی کی۔

اور میں نے سوچا جب تک وہ اس ”سانپ“ کو واپس وہار میں چھوڑ کر فارغ نہیں ہو جاتی میں اس کچ میں رہوں گا۔ انتظار کروں گا۔ میں ٹانگیں پھیلا کر درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر جھاڑیوں میں لیٹ گیا پر دوسرے ہی لمحے میں اٹھ بیٹھا۔

دہری دیوار کی طرف سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی اور ایک آواز اور تھی۔ کسی پرندے کی چیخ۔ مجھے مادہ طاؤس کی چیخ سنائی دی تھی۔

میں جھاڑی سے نکل کر باہر بھاگا اور فوراً ہی اوٹ آیا۔ میں تو شیر علی بگش تھا۔

نسان تھا اور وہار کے احاطے میں آدمی کی جان کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔

جھاڑی کی اوٹ میں، میں نے شیر کی کایا بدلی اور غیض و غضب میں دھاڑتا ہوا احاطے کی دیوار کی طرف چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا ان کی دھڑکیاں عین میرے سر پر تھیں۔ وہ اگر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہار کے پالتو شیر یا کسی بھکشی کی بھکتی ہوئی روح سے کانچ کی عمارت کو پاک کر دینا ہے تو پھر یہی شیر کا جسم میرا کفن بن سکتا تھا۔

مگر انہوں نے گولیاں نہیں چلائیں۔ وہ سب تکلیف میں پکارتی، کرا لاتی مورنی کو دہری دیوار پر پڑے پڑے بازو پھڑپھڑاتے، پنکھ چلاتے دیکھ کر اپنے کسی شیطانی جذبے کی تسکین کر رہے تھے۔ ”میں وحشی جذبہ نہیں کہوں گا کیونکہ وحشی اور طائر۔ جنگلی جانور اور پرندے تو عین فطرت پر زندہ رہتے ہیں۔ وہ ظلم سہ تو سکتے ہیں ظلم جیسا شیطانی عمل ان سے سرزد نہیں ہو سکتا۔ میں نے خود کتنی بار جنگلی جانور بن کے دیکھ لیا تھا اور میں جانتا تھا کہ دشمنی اور ظلم آدمیوں سے مخصوص ہے۔ یہ جانور کے مزاج میں اس کی جبلت میں نہیں۔“ وہ لوگ جو مورنی کو ترپتا دیکھتے تھے اب میری طرف متوجہ ہو گئے۔

تب میں نے دھاڑتے ہوئے زبردست جست کی اور کوئی پندرہ فٹ کی بلندی تک دیوار کو اپنے شیر پنچوں سے چھو کر میں واپس احاطے میں آگرا۔ میں نے طیش میں احاطے کی نرم گھاس پر پنچے کھولے کھولے ایک کا دامار اور زمین اوھڑ کر رکھ دی۔ پیچھے ہٹ کر میں نے پھر ایک زقند بھری اور اس بار میں زیادہ بلندی تک پہنچا مگر پتھر کی دیوار پر شیر ناخنوں سے خراشیں ڈالنے کے سوا مجھ سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ مورنی کا کانپنا، ترپتا ہوا بدن میری جست کے بعد بھی تین چار فٹ اوپر پڑا تھا۔ میری پہنچ سے دور تھا۔

مگر دیوانہ وار جست و خیز کا یہ منظر ان حرام خوروں کے لیے مرعوب کن ہو گا کیونکہ پندرہ اٹھارہ فٹ کی جست لگاتے تو انہوں نے سدھائے ہوئے شیروں کو بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ میری دھاڑ سن کر اور طیش میں لان پر میری چلت پھرت دیکھ کر یا پھر ہو سکتا ہے کسی انسانی جذبے سے مغلوب ہو کے ان میں سے ایک نے اپنی رائفل کے بٹ سے اگلے سے دھکا دیا اور مورنی کو دیوار سے نیچے گرا دیا۔ وہ تکلیف کی چیخ مارتی اندر احاطے میں آگری۔

وہ گھاس پر گری تھی مگر اس زخمی کی تکلیف سمجھ کر پیسے میں نے اپنے بدن اپنی کایا میں محسوس کی اور نرمی سے گونجتے اس شیر نے میں نے منہ بڑھایا اور جس طرح دانتوں میں کیلیے اپنے نئے پیدا ہوئے بچوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں میں نے اس فون آلودہ پرندے۔ مورنی کے بدن کو منہ میں دبایا اور جھپٹ کر دیوانہ وار وہار

اس کے چنیا پوٹوں میں حرکت ہوئی یا یہ میرا وہم تھا؟
میں نے بے تابانہ کہا۔ ”مورنی آنکھیں کھول، جان۔“
اور اس نے ایک زبردست کوشش میں آنکھیں کھول دیں۔ عجیب بات تھی۔
یہ چنیا کی آنکھ نہیں تھی۔ نہ ہی انسانی آنکھ تھی۔
میں نے ایک آخری کوشش میں دھیرے سے کہا۔
”مورنی! اہم! لڑکی بن جا۔ بدل لے اپنی کایا۔ انسان بن جا۔ میری
گود میں ہے تو۔ شیر علی کی گود میں مورنی! لڑکی بن جا۔“
اس کی آنکھوں نے مجھے کہا۔ ”ہاں۔“ مگر وہ آنکھیں پھر ایک بار جھپک گئیں۔
”میں جانے نہیں دوں گا تجھے۔ جانے نہیں دوں گا۔ لڑکی بن جا مورنی! لڑکی
بن۔“ میں پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔
لیکن اس نے آنکھیں کھول دیں اور میرے دل نے جان لیا کہ وہ واپس آرہی
ہے۔

ان آنکھوں میں میرے لیے ایک پیغام تھا۔ ”لو، میں آتی ہوں۔“ اور اس کے
ساتھ ہی سیاہ غبار میری بانہوں کے گھیرے میں پیدا ہوا اور وہ پرندے سے لڑکی بن گئی۔
مگر ایک دم نڈھال بے ہوش اور زخمی لڑکی۔ میں نے پھولوں کی ٹوکری کی
طرح اسے اٹھالیا اور چور دروازے پر ٹھوکر ماری۔ چیخ کر کہا۔
”رشنا! میں شیر علی!“

دروازہ کھلا۔ دروازہ رشنا نے نہیں کو سومی نے کھولا تھا۔
میں نے بے تابانہ کہا۔ ”کو سومی! اسے سنبالو۔ مورنی کو گولی لگی۔ ہے۔“
اور کو سومی اگوانے ایک چھوٹی سی شفیق ماں کی طرح باہیں پھیلا کر بے ہوش
لڑکی کو لے لیا اور وہاں کی بھول بھلیاں جیسی غلام گردشوں میں وہ تیزی سے ایک طرف
چل پڑی۔



اس کے بعد ”جانور“ کے دو سرے صے کا مطالعہ کریں۔

کے چور دروازے کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ نہ معلوم کیوں مجھے کسی کے بتائے بغیر ایک
خیال سا تھا کہ اگر مورنی بے ہوش ہو گئی۔ یا اسے ہوش آئے بنا کچھ ہو گیا تو وہ دوبارہ
انسانی قالب میں نہیں آسکے گی۔ مورنی بنی بنی سدھار جائے گی۔

میں جھپٹتا ہوا احاطے کی دیوار سے ہٹا تھا مگر میں نے اوپر سے آتی یہ آواز بھی
سن لی۔ ایک فوجی، اس گولی چلانے والے کو چھیڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”دیکھ لے جبر
میاں، تیری شکار کی ہوئی مورنی کو شیر نے جھپٹ لیا۔ اب اسے ایک طرف بیٹھ کے
کھائے گا سورا۔“

میں نے چور دروازے کو چھپانے والی جھاڑیوں میں کایا بدلی اور انسان بن گیا
مگر اس مورنی کا کیا ہو گا؟ جب تک یہ خود سے خواہش نہ کرے پرندے سے لڑکی نہیں
بن سکتی۔

میں نے اس زخمی پرندے کو بانہوں میں بھر لیا اور اس کے کان میں سنا کر کہی
اس کو اپنا چہرہ دکھا کر بار بار کہا۔ ”مورنی! لڑکی بن جا مورنی۔ اور مورنی! کایا بدل لے اب۔
میں تجھے اندر وہاں میں لے جاؤں گا مورنی! لڑکی بن جا لڑکی۔“
مگر وہ زخمی پرندہ آنکھ کھول کر مجھے دیکھتا تھا اور گردن ڈال کر آنکھیں بند کر لیتا
تھا۔ خبر نہیں وہ پہچان بھی رہی تھی مجھے کہ نہیں پہچان پائی تھی۔ میں دیوار نہ وار اس کے
کان سے منہ لگائے پکارتا رہا۔ مورنی۔ مورنی۔

خوف سے میرا دل ڈوب رہا تھا۔ یہ لڑکی مورنی اگر ہوش میں آتی ہے اور
میری بات سمجھ کر پورے شعور کے ساتھ خود کو لڑکی بننے کا حکم دیتی ہے تو یہ بچ سکتی
ہے۔ بس اسی صورت میں اسے بچایا جاسکتا ہے۔ اندر لے جا کر اس کی مرہم پٹی کی جاسکتی
ہے اور اگر اس نے کچھ دیر اور کایا نہ بدلی۔ مورنی پرندہ ہی بنی رہی تو پھر اس کا علاج کیسے
ہو گا۔ بالکل نہیں ہو سکتا۔ یہ چنیا بنے بنے مر جائے گی۔ یہ خوبصورت لڑکی۔ یہ کھلنڈری
مورنی۔ میری باوقار دوست لڑکی نہیں بچ سکتی۔

اس کی پرندوں والی آنکھیں بند تھیں اور وہ مشکل سے سانس لے رہی تھی۔
گہری مشقت کی ایک سانس آئی اور پھر کچھ دیر بہت دیر، وہ بے حرکت پڑی رہی۔

یہ جارہی ہے۔ یہ مجھ سے کچھ کہے بنا جارہی ہے۔ بے زبان پرندہ بنی رخصت
ہو رہی ہے۔ یہ انسان ہے۔ مگر میں نے اس پر اپنا چہرہ جھکا دیا، الوداع تو کہہ دوں
اسے میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”مورنی! میری دوست۔ مورنی! خدا حافظ میری
جان۔“

ایک وطن پرست اور کفن بردوش نوجوان کی داستان خون رنگ جو محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا۔
وقت کی راسخ تھا مہینے اس کے ہاتھ لہولہاں ہو گئے تھے۔
معاشرے کے اچلے لوگوں کی کہانی جن کے من کاٹے ہیں۔

دہشت گرد

سیلے فارونی

چار حصوں میں شائع ہو گیا ہے

قیمت

مکمل سیٹ - ۱۸۰ روپے

مکتبہ القریش، سرکل روڈ، اردو بازار، لاہور ۲
پوسٹ کوڈ ۵۴۰۰۰

پراسرار علوم کے ماہر

نوجوان امجد علی کی پراسرار اور عبرت انگیز
داستان، جس نے پراسرار علوم اور نادیدہ
قوتوں کے حصول کے لئے اپنا سب کچھ داؤ
پر لگا دیا۔ نیکی اور بکدی کا خوفناک
ٹکراؤ، اور سبکی خیز واقعات کا سنگم
آپ کو اس وقت تک گرفت میں رکھ
گا، جب تک آپ آخری صفحہ ختم
نہ کر لیں۔

م۔ الف صدیقی
کے پراسرار قلم سے

روگے

۵

حصوں میں

مکمل سیٹ

- ۲۵۰ روپے

ناشر: مکتبہ القریش، سرکل روڈ، اردو بازار، لاہور ۲

تاریخ کے نامور مصنف

کے ایمان افروز قلم سے ایک

اسلامی

نحو بصورت تحفہ

ایم اے

جسمیں حضرت آدم علیہ السلام
سے لے کر خاتم الانبیا حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
تک دنیا کی مکمل تاریخ پیش کی
گئی ہے۔



آپ کی ذاتی لائبریری کیلئے ایک انمول اور مستند اضافہ
جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
نحو بصورت سرورق، بہترین کتابت و طباعت
پانچ ہزار صفحات پر مشتمل،

مکمل سیٹ سات جلدوں میں دستیاب ہے اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں!

— ناشر —

مکتبہ القریش، سرکل روڈ، اردو بازار، لاہور ۲

فون: ۷۶۶۸۹۵۸

